معیاری تخلیقات کی ایک اہم دستاویز

۰۱

آگ، راکھ اور کندن

برج ورما

آگ، راکھ اور کُندن

(افسانے)

بلراج ورما

بلراج ورما
۲۴ ڈی۔ پاکٹ ۳، میور وہار۔ فیز ۱۔ دلی ۱۱۰۰۹۱
ٹیلی فون ۲۲۵۲۳۱۹

اشاعت : ۱۹۹۴ء
تعداد : چھ سو
کتابت : محمد ہارون
سرورق : مُکتی ورما
مطبع : ببّر پرنٹرز، ساؤتھ انارکلی، دہلی ۵۱

قیمت ایک سو روپے

یہ کتاب اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

زیر اہتمام
مُکتی ورما

ناشر : مصنف

سلسلۂ مطبوعات، تناظر پبلی کیشنز

TANAZUR PUBLICATIONS,
24-D, POCKET III, MAYUR VIHAR, DELHI-110091

فہرست

سدّھارتھ

(سدّھارتھ — گوتم — بدّھ — ایک کیفیت تین نام —)

راجہ بوڑھا تو تھا ہی۔ اِس پر اُس موذی بیماری کا شکار جو اُس کے عہد کے دھنونتریوں نے ہر اعتبار سے لا علاج قرار دے رکھی تھی۔ ایک طویل مدت تک اِس تکلیف میں مُبتلا رہنے کی وجہ سے وہ اتنا کمزور اور لاغر ہو گیا تھا کہ ہزاروں کوسوں پر پھیلی اپنی وسیع و عریض سلطنت کی باگ ڈور اپنی پُرانی آن بان اور شان سے سنبھالے رکھنا اب اُس کے لیے کسی طرح ممکن نہ رہا تھا۔

راجہ کی رانیاں جُڑواں بہنیں تھیں جن سے اُس نے ایک ساتھ ایک ہی بیدی پر بیاہ کیا تھا۔ اتفاق سے دونوں کے ہاں اولاد بھی تقریباً ایک ساتھ ہوئی۔ دو بیٹے ایک ہی ہفتہ کے اندر۔ غالباً اسی وجہ سے کُل پروہت نے ولی عہد کے چناؤ کے سلسلے میں کوئی قطعی رائے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کسی ایک راجکمار کو ساری حکومت سُونپ دینے کے حق میں نہ تھا۔

رانیاں جُڑواں بہنیں تھیں۔ اُن کے جننے کے اوقات کا وقفہ بھلے چند پلوں کا رہا ہو مگر جو دنیا میں پہلے وارد ہوئی وہ بڑی تو تھی ہی اُس کا بیاہ بھی چھوٹی سے چند لمحے پہلے ہوا تھا مگر اِس کا کیا جواب کہ چھوٹی کے شہزادے کا جنم بڑی کے راجکمار سے ہفتہ بھر پہلے ہوا تھا اور اِس لحاظ سے وہ دوسری یعنی بڑی بہن کے بیٹے سے بڑا تھا۔ جوان ہو کر دونوں راجکمار ایک جیسے شوربیر اور باشعور نکلے۔ وہ اپنے اپنے حقوق کے بارے میں پُورے طور پر چوکنّے تھے اور جانتے تھے کہ والد کے بعد حکومت کی

گدی کے دونوں برابر کے حقدار تھے۔ گدّی بھلے ہی ایک تھی، مگر ملک تو بڑا تھا ہندو دیو مالا کے سب سے اُتّم اور سمجھ دار حکمران مہاراج رام چندر جی نے اپنی حکومت کو اپنے دو بیٹوں میں بانٹ کر ایک ایسی پرتھا کا بیج بو دیا تھا جس کا اثر اتنے جُگ بیت جانے پر بھی اِس مُلک میں قائم تھا۔ حالات کے پیشِ نظر محل پر وہت یعنی راج گورو نے مشورہ دیا کہ ریاست کی تقسیم کر دی جائے۔ بوڑھے راجہ کو کچھ کم مگر اُس کی دونوں رانیوں کو یہ سجھاؤ بڑا پسند آیا۔ مائیں ہونے کے ناطے اپنی اولاد کے حقوق کا تحفظ دونوں کے لیے فطری تھا۔ خاصی تگ و دو کے بعد حکومت کے دوسرے مشاہیر نے بھی شاہی پروہت کی بات مان لی۔

دونوں راجکماروں کے اپنے اپنے مذہبی اور سیاسی صلاح کار تھے جن کا فائدہ اسی میں تھا کہ وطن کا بٹوارہ ہو جائے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے جو مذہبی پیشوا بھی تھے اور سیاسی سربراہ بھی اپنے الگ الگ پیرو کار تیار کر رکھے تھے اور یہ سب کچھ اِس طرح ہوا تھا کہ عوام یعنی پرجا کے لوگ، چھوٹے بڑے، اپنے آپ دو حصّوں میں بٹ گئے تھے۔ اس دوران بوڑھا راجہ بھی بیٹوں کے اثر و رسوخ کے دائروں کی حدیں نہ صرف پہچان گیا تھا بلکہ اپنی موت سے اپجنے والی ساری سیاسی الجھنوں سے بھی پورے طور پر آگاہ ہو گیا تھا۔ ملک میں اب دو قسم کی رعایا تھی۔ دو سیاسی پارٹیاں۔ دو گروہ جن کے اپنے جھنڈے اپنے جدا جدا نام اور الگ الگ نعرے تھے۔ جہاں یہ سب ہوتا ہے، گروہ پھیل کر قومیں بن جاتے ہیں اور قوموں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے اپنے لیے الگ الگ دھرموں اور خداؤں کا بھی چناؤ کر لیں۔

راجہ جانتا تھا کہ قوم ایک ہو جھنڈا ایک ہو اور اس نصب العین ایک ہو تو بڑی طاقت بن جاتی ہے مگر یہ ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جس پر کوئی فردِ واحد اپنی من مانی سے حکومت نہیں کر سکتا اور کرتا ہے تو دیر تک جما نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس بٹے بکھرے لوگوں پر حکمرانی نسبتاً آسان ہوتی ہے۔ مسلح قوم اور آوارہ ہجوم کا یہ فرق ہر کامیاب حکمران نے ہر فاتح نے ہر دور میں سمجھا ہے۔

راجہ کے شاہی جھنڈے کا رنگ ہرا تھا جو نیلے اور پیلے کے ملاپ سے بنتا ہے۔ راجکماروں میں سے ایک نے نیلا اور دوسرے نے پیلا چُن کر شاہی جھنڈے

کا وقار ختم کر دیا۔ اب نیلا اور پیلا مخالف پارٹیوں کے رنگ تھے جن کی سیاست ہی نہیں خدا اور مذہب بھی الگ الگ تھے۔ بٹوارے کا اصول بھی طے پا گیا۔ ملک کے جس حصّے میں رعایا کی اکثریت نے نیلا رنگ اپنایا تھا اور نیلے جھنڈے کے ساتھ ہولی اور جس نے پیلے رنگ والے جھنڈے کو ترجیح دی تھی وہ پیلے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔

پھر ایک دن راجہ مر گیا۔ رانیاں بیوہ ہو گئیں۔ اور مہارانیوں کی بجائے اب راج ماتائیں بن گئیں۔ کچھ لوگ جو ابھی ابھی تو می یکجہتی جیسے پُرانے اور فرسودہ آدرشوں سے جڑے ہوئے تھے نہ نیلوں میں شامل ہوئے نہ پیلوں میں۔ لہٰذا انھیں دونوں اطراف کے سربراہوں نے ایک دم فراموش کر دیا۔ اب اکثریت والے اقلیتوں کو اپنے دائرہ اثر در سوخ میں لانے یا ملک بدر کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ جو مان گئے وہ بچ گئے جو نہ مانے یا تو قتل کر دیے گئے یا ہجرت کر کے اپنوں میں جا ملے۔ وہ جو نہ نیلے تھے نہ پیلے دونوں گروہوں کے راستوں کے روڑے سمجھے جانے لگے۔ اُنھیں میں گوتم تھا اور اُس کا بیٹا سدھارتھ۔ بٹوارے کے روز گوتم نیلے جھنڈے والے علاقے میں تھا اور سدھارتھ پیلے جھنڈے والے علاقے میں۔

بٹوارے سے چند روز پہلے نیلوں کے مقامی صدر نے جو گوتم کا جگری دوست بلکہ لنگوٹیا رہا تھا اُسے بار بار اپنے بیٹے کے پاس چلے جانے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ راضی نہ ہوا ــــــ اُس نے لاکھ سمجھایا کہ بٹوارے کا اعلان ہوتے ہی وہ لوگ ایک کی بجائے دو قومیں بن جائیں گے اور چونکہ اُس نے نیلے جھنڈے کی سرداری قبول نہ کی تھی اس لیے اُس کا وہاں سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔

"مگر سبھی جانتے ہیں کہ ہم باپ بیٹے نہ نیلے ہیں نہ پیلے۔ ہمارے لیے نہ یہ علاقہ محفوظ ہے نہ وہ ـــ ملک بھلے ہی بٹ جائے مگر دونوں اطراف کے حکمران ایک ہی خون کے چھینٹے ہیں۔ بھائی بھائی ہیں۔ اُن کا ماضی ایک ہے۔ اُن کی تہذیبی جڑیں ایک ہیں۔"

"حیرت ہے یار کہ تو اتنا پڑھا لکھا ہو کر بھی شہر کی ہر دیوار پر اتنے جلی حروف میں لکھی عبارت نہیں پڑھ سکتا۔ ہم اب نیلے یا پیلے نہیں ایک دوسرے کے مخالفین بلکہ جانی دشمن ہیں۔ تو اپنے دوست کی بات کو سمجھتا کیوں نہیں؟"

"تو مجھے ڈرا کر یہاں سے بھگا دینا چاہتا ہے مگر میں جانے والا نہیں۔ یہ میری

بستی ہے۔ یہاں میرے کتنے دوست کتنے شاگرد ہیں۔ دشمن ایک نہیں۔ میں نے نہ کبھی نیلے جھنڈے کی مخالفت کی ہے نہ پیلے کی۔"

"تو ہم میں سے ایک ہوتے ہوئے بھی الگ تو ہے نا "

"میں الگ کہاں ہوں۔ میں تو تم ہی میں سے ہوں۔ میں نے بس اتنا ہی تو چاہا اور کہا ہے کہ دونوں بھائی ساری قوم سارے مُلک کو سالم رکھ کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں۔ میرا مشورہ دونوں کے حق میں ہے میں دونوں کا ہتیشی ہوں۔"

"تُو اصولوں اور آدرشوں کی بات کر رہا ہے جب کہ مَیں اُس کالی آندھی کا ذکر کر رہا ہوں جو جیسے ہی چھڑے گی تُو ایک دم اُس کی زد میں آجائے گا اور کوئی بھی بچا نہ سکے گا۔"

"آندھی تو جیسے اِدھر آئے گی ویسے ہی اُدھر بھی آئے گی۔ اگر میں یہاں محفوظ نہیں تو وہاں بھی اِس سے بچ نہ سکوں گا۔ یہاں میرا میرے آبا کا گھر ہے۔ وہاں۔ اُدھر میرا کیا ہے۔"

"اُدھر تمھارا بیٹا ہے اور اُدھر تم اجنبی ہو۔ اِدھر سبھی جانتے ہیں کہ تم کون ہو، کیا ہو، اُدھر یہ مشکل نہ ہوگی۔ ایک بار آندھی گزر جائے پھر تم محفوظ ہی محفوظ ہو۔"

"تو تُو بھی جانتا ہے کہ جسے تُو آندھی کہہ رہا ہے وہ وقتی دُھند ہوگی جو اپنے آپ چھٹ جائے گی۔"

"دُھند اندھی ہوتی ہے۔ دُھند میں کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا"

"دُھند وقتی ہوتی ہے"

"اِس لیے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ جب وہ منحوس گھڑی آئے گی جس کا مجھے خدشہ ہی نہیں پُورا یقین ہے تو گلیوں، سڑکوں اور شاہراہوں پر بوکھلائی اکائیاں ہوں گی۔ بپھری غصیلی اور خونخوار اکائیاں۔ غیظ و غضب کے نعرے لگاتی لاسمت بھیڑ جس کی آمد پر خدا بھی اکثر اپنی پناہ گاہوں میں دُبک کر بیٹھ جاتا ہے۔"

"ہم تم اور ہمارے جیسے سینکڑوں ایسے لوگ ہیں جو اس طرح کی بھیڑ میں کبھی شامل نہ ہوں گے۔"

"تو ریاضی کا معلم ہوتے ہوئے بھی آنکڑوں کی حقیقت کو بھول رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کے مقابلے میں سینکڑوں کی کیا وقعت ہوتی ہے۔"

"تُو میرا دوست ہے۔ تیرا گھر میرا قلعہ ہے"

"قتل فصیل بند قلعوں میں بھی ہوتے ہیں بلکہ زیادہ آسانی سے ہوتے ہیں۔ میرے گھر میں میرا چھوٹا بھائی اور تمھارا ماتحت ہے جو تیرے بے پناہ علم کو ہمیشہ ہی حسد و نفرت سے دیکھتا آیا ہے"

"اپنوں کے ہاتھوں پائی ہوئی موت۔ موت نہیں شہادت ہوتی ہے پیارے"

"کیا بکتے ہو۔ موت موت ہوتی ہے۔ شہادت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے کبھی شہید نہیں ہوا۔ شہادت ایک احمقانہ لفظ ہے جو آدمی نے غیر معمولی اموات کو احترام سے یاد رکھنے کے لیے گھڑ رکھا ہے۔ مجھے تیرا شہید ہونا قطعی منظور نہیں۔ مجھے یہ بھی منظور نہیں کہ تُو یہاں محض اس بھرم پر ٹھہرا رہے کہ تیرا دوست ایک معزز اور بارسوخ شہری ہے اور حکمران طبقے کا مقامی صدر —— میرا مشورہ مان میرے بھائی اور چپ چاپ اپنے بیٹے کے پاس چلا جا——"

"اپنا وطن چھوڑ کر بدیس چلا جاؤں!"

"اُدھر اُس پار تیرا بیٹا ہے۔ تیری سب سے پیاری چیز۔ تیرے پاس زندگی گزارنے کے لیے کافی سرمایہ ہے۔ سب سے بڑا سرمایہ تو تیرا بیٹا ہے"

"تو سمجھتا کیوں نہیں ہے دوست کہ اس شہر میں میرے پُرکھوں کا گھر ہے۔ میرا بچپن، میری جوانی، ہر پیاری یاد اِس سے جُڑی ہوئی ہے۔ اسی کی مٹی میں میرے شفیق ماں باپ اور میری اپنی یشودھا دفن ہے۔ یہ میری جڑ ہے جس سے اکھڑ کر، کٹ کر میں سوکھ جاؤں گا۔ جو موت سے بھی بدتر ہوگا"

○

کمزور بینائی والے آدرش وادی گوتم نے دیوار پر لکھا نہ پڑھا۔ جیسے ہی خون و غارت کا بگل بجا اور بھیڑیوں کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے مہینوں پہلے سے تیز کیے ہوئے ایک گنڈاسے نے گوتم کا سر قلم کر دیا۔

قاتل نے گنڈاسا پھینک کر بھائی کے سامنے سر جُھکا دیا۔

"میں تیرا قصوروار ہوں۔ میں نے تیرے سب سے پیارے سب سے عزیز دوست کو قتل کیا ہے۔ تو جو سزا تجویز کرے گا مجھے منظور ہوگی۔ اُس کی جان لینا میرا حق تھا۔

اُس کے مال اسباب پر تیرا حق ہے"

بھائی کچھ نہیں بولا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ گوتم کا قتل نہیں ہوا۔ اُس نے خود کشی کی ہے۔ اُس نے موت کا یہ انداز خود چنا تھا۔ اِس قسم کی خود اختیاری کا حق کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔ یہ خدا کی انتظامیہ میں بے جا دخل اندازی ہے خدائی سے انحراف ہے۔

پھر دونوں بھائیوں نے مل کر مرحوم کی حویلی کا سامان اکٹھا کیا جو بیچا یا خود خرید ا جاسکتا تھا اُسے الگ کیا اور جو کسی دوسرے طریقے سے بھی ہٹایا نہ جا سکتا اُسے یکجا کر کے اور توڑ پھوڑ کر لکڑیوں کے ایک بڑے ڈھیر میں منتقل کر دیا گیا۔ جب یہ سب ہو چکا تو دونوں بھائیوں نے گوتم کا کٹا سَر اور باقی کا دھڑ بڑے احترام سے اٹھا کر لکڑیوں کے اُس ڈھیر پر رکھ دیا۔ گھر کا سارا گھی لا کر مرحوم کے بدن اور لکڑیوں پر چھڑک دیا گیا۔

آگ دینے سے پہلے مرحوم کے دوستِ اُس کی بیوی اور قاتل بھائی نے سرنگوں ہو کر اُسے اپنا آخری سلام پیش کیا ــــ

تُو بڑا دھرماتما تھا ــــ تیرا دھرم، تیرا مذہب کیا تھا میں نے کبھی نہیں سمجھا ــــ تیری اِس آخری یاترا میں ہمیں کیا کرنا چاہیے، کون سے منتر پڑھنے چاہئیں، میں نہیں جانتا لہٰذا اپنے ہی ربِ بزرگ و برتر سے دعاگو ہوں کہ وہ تیری آتما کو شانتی دے اور تو جب اور جہاں بھی پُنر جنم لے اپنے جیسا اچھا بن کر ــــ ہمارے جیسا بُرا بن کر تو کبھی بھی نہیں کیوں کہ دوستی کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی میں تیری حفاظت نہ کر سکا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا میرے محترم بھائی۔

اس واقعہ کے کوئی تین چار مہینے بعد وہ ایک رات سو رہا تھا کہ اُس نے گوتم کو سامنے بیٹھے اپنی مترنم آواز اور معروف مُسکراتی مُدرا میں چہکتے دیکھا۔

ارے تم؟

تُو سمجھتا ہے میں مرگیا ہوں۔ مگر میں اتنی آسانی سے تُجھے چھوڑنے والا نہیں۔ اُس روز اپنی جلتی چتا سے اُٹھ کر میں نے جہاں پناہ لی تھی وہاں تیرے بھائی کا گنڈاسا بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ دنیا کی سب سے محفوظ جگہ ہے۔ ایک ماں کی کوکھ۔ میں قتل نہ کر دیا جاتا، تیرا دوست بن کر اپنے اس شہر میں رہتا بھی تو اجنبیوں کی طرح۔ اب میں یہاں شان سے رہوں گا۔ تیرا بیٹا بن کر اور میرا قاتل مجھے اپنی گود میں کھلائے گا۔

تیرے قتل کے بعد وہ جس قدر پشیمان ہوا ہے۔۔۔۔۔۔

میں کیا جانتا نہیں۔ کالی آندھی کے اُس تند و تیز بہاؤ نے کتنوں کے پاؤں اکھیڑ دیے تھے۔ تو اپنی جگہ پر جما رہا کیوں کہ تو تو گھاٹ کا پتھر ہے ——

تو تُو نے اُسے معاف کر دیا ——

میں نے بھی۔ میرے خدا نے بھی۔ سوپن اور مدہوشی کے عالم میں کیا ہوا گناہ گناہ نہیں ہوتا۔

وہ بوکھلا کر اُٹھ بیٹھا۔ گوتم کی آواز اُسے اب بھی سنائی دے رہی تھی اگرچہ بیڈ کے سامنے والی کرسی جس پر اُس نے گوتم کو ابھی ابھی بیٹھے دیکھا تھا اب خالی تھی۔

ساتھ لیٹی ہوئی بیوی کے پھُولے ہوئے پیٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے کہا۔ چار مہینے کا ہو چلا ہے ہمارا گوتم۔

آپ کو کیسے معلوم کہ وہ گوتم ہے۔ لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے۔

"ہونے کو تو کُچھ بھی ہو سکتا ہے مگر گوتم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا" اُس نے گوتم سے اپنی بات چیت کی کہانی سنا دی۔ تیری کوکھ میں جو پل رہا ہے وہ ایک ایسا مرد ہے جس کا بدل ہماری آج کی دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ شادی کے پندرہ سال بعد ہمیں پہلی اولاد کا دیدار ہو گا۔ اُس نے مر کر تجھے ماں بنا دیا۔ تیری عورت کی جون کی تکمیل کر دی تیرا رتبہ تیرا وقار بلند کر دیا۔ اماں تیری خالی کوکھ کو دیکھ کر جل بھُن جایا کرتی تھی۔ تجھے دھاموکیاں کا کھُسرا کہہ کر کوسا کرتی تھی۔ آج زندہ ہوتی تو تیری بلائیں لیتی۔

ایک دن گوتم کے لیے سوئٹر بُنتے بُنتے اُس کے مُنھ سے اچانک نکل گیا۔

" دیور جی کو آج کل کیا ہو رہا ہے۔ کس طرح مارے مارے پھرتے ہیں گوتم بھیا کی حویلی کے کھنڈرات میں"

" باپ کا قاتل تھا مگر اُس کا ایک ایک پیسہ اور وہ سارے زیورات جو ہمارے پاس محفوظ تھے خود پہنچا کر آیا ہے بیٹے کو"

" سدھارتھ کو معلوم ہے کہ وہی اُس کے باپ کا قاتل ہے ؟"

" جو آدمی اُس کے مرحوم باپ کی ساری پونجی اپنی جان پر کھیل کر بیٹے کو پہنچانے

اکیلا اتنی دُور گیا تھا وہ اس کے باپ کا قاتل کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اُس نے بار بار رو رو کر سدھارتھ کو بتایا کہ اُسی نے اس کے باپ کی جان لی تھی مگر بیٹا کیسے مانتا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ چاچا جی چوں کہ اُس کے باپ کی حفاظت نہ کر سکے اِسی لیے اپنے آپ کو اُس کا قاتل سمجھتے ہیں۔"

"جیسا باپ، ویسا بیٹا — کیوں جی اس قسم کے لوگ ہماری دنیا میں اتنے کم کیوں ہوتے ہیں۔۔"

آخری جملہ وہ اکثر دہراتی۔ وہ پھر دن آگیا جس کا دونوں کو پچھلے سولہ برسوں سے انتظار تھا۔ سپنا سچا تھا۔ لڑکا کیا تھا سچ مچ کوئی فرشتہ تھا۔

گوتم یونانی دیوتاؤں کی طرح خوبرو، توانا اور دراز قد نکلا — اٹھارہ ہی سال کی عمر میں اُس نے ریاضی میں بی اے آنرز کر لیا۔ صوبے کے فاتح طالب علموں میں اس کا نام سرِ فہرست تھا —

"میں بڑا ہو کر آئینسٹائن بنوں گا۔"

آئینسٹائن کون تھا ماں نہیں جانتی تھی۔ اُسے البتہ یقین ضرور تھا کہ اُس کا غیر معمولی بیٹا جو بننا چاہتا ہے وہ یقیناً کوئی بڑی شے ہو گی۔

بٹوارے کے دنوں جیسی وبا ایک بار پھر لوٹ آئی۔ زن، زر، زمین فساد کی جڑیں مانے گئے ہیں مگر اب کے جو ہو رہا تھا وہ کوئی دنگا فساد نہ تھا۔ باقاعدہ جنگ تھی دو بھائیوں میں، دو ملکوں میں، دو مسلح فوجوں کے مابین۔ باہر کے دشمنوں کے دیے ہوئے ہتھیاروں سے اُنھیں کی غیبی سرداری میں اُنھیں کے طور طریقوں سے لڑی جانے والی جنگ۔

جہاں دیگر ہزاروں مرد عورتیں اور بچے مرے گوتم کے والد بھی دشمن کے ہوائی حملے کا شکار ہو گئے۔ ماں بیوہ ہو گئی اور گوتم یتیم —

اُس کے باپ کو دشمن کی کسی گولی نے ہلاک نہ کیا تھا نہ کسی بم سرنگ یا گرینڈ کے پھٹنے سے ہی اُن کی موت ہوئی تھی۔ اس موت کی نوعیت قطعی انوکھی تھی۔ دشمن کے کسی مسخرے ہواباز نے چند اشتہار پھینکے تھے لوگوں کو محض یہ بتانے کے لیے کہ وہ اُن کا دشمن نہیں دوست ہے اور اُنہی کی بستی کی پاکیزہ دھرتی پر اُس کا جنم ہوا تھا۔ اُس نے اپنی بستی کے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ سب مل کر اِس بے بنیاد اور بے مطلب لڑائی کو بند کرانے

کے لیے جہاد کریں۔

کسی وجہ سے اُس ہوا باز کے اِن دوستانہ اشتہاروں کا ایک بنڈل جس میں بمشکل پانچ چھ سو اشتہار تھے کُھلا نہ تھا اور سیدھا گوتم کے باپ کی بے بال چاند پر آ گرا تھا۔ چوٹ کی نوعیت اندرونی تھی اور موت کی وجہ غالباً وہ غیر معمولی جھٹکا تھا جو برقی صدمے کی طرح ان کے سارے وجود کو برہم کر گیا تھا۔

یہ ہوا باز کون تھا؟ کوئی سرپھرا گوتم؟

" یا کوئی سدھارتھ" چاچا نے وضاحت کی

گوتم اور سدھارتھ ایک ہی سے نام ہیں — ایک کیفیت کے دو نام — اِن جیسے سیکڑوں ہیں اس دنیا میں جو زندگی کے تاریک ترین گوشوں میں بھی چھوٹے چھوٹے معصوم جگنوؤں کی طرح روشنیاں پہنچاتے رہتے ہیں۔ نیک، حسین اور شفیق لوگ۔ رحم و دردمندی کے سرچشمے۔ سخی، مقدس، ضیا بار فرشتے جو انسانیت کا درس دینے کے لیے ہی اِس نشتر دنیا میں بار بار جنم لیتے ہیں۔

کچھ بھی ہو اس حرام زادے نے ہماری دُنیا اُجاڑی ہے میرے بھائی کو ہلاک کیا ہے میں اُس کی شناخت کراؤں گا تا کہ اُسے اس کی حکومت سے مناسب سزا دلوا سکوں۔

یہ اپنے ملک سے غدّاری اور غیر سے بیجا ہمدردی کا یعنی کورٹ مارشل کا کیس ہے۔

"تم ایک شریف زادے کو حرام زادہ کہہ رہے ہو چاچا۔ تم نے باپ کا قتل کیا تھا تو برسوں پریشان رہے تھے۔ اب بیٹے کو سزا دلوا کر اپنی باقی ماندہ زندگی بھی حرام کرنا چاہتے ہو"

" تو تم مانتے ہو کہ یہ کام سدھارتھ ہی کا تھا"

" کوئی سدھارتھ کوئی گوتم۔ وہ جو کوئی بھی ہے ایک دردمند اور انسان دوست آتما ہے تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک رکھنا چاہتے ہو جو ہر عہد میں مہذب لوگ اپنے ولیوں اور پیغمبروں سے کرتے آئے ہیں"

گوتم نے مُلک کی سب سے اہم اور اُونچی ملازمت سے استعفےٰ دے دیا اور ایک مقامی کالج میں ریاضی کے معمولی لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔

" میرا مستقبل ریاضی میں ہے۔ یہ میرے خون میں ہے۔ یہ میری وراثت ہے۔ ہندسوں کے اِسی فلسفہ میں زندگی اور موت کا راز چھپا ہے"

"زندگی کے بارے میں تو تم ہی جانو مگر اِس میں قطعی کوئی شک نہیں کہ موت کا راز تمھارا ریاضی خوب جانتا ہے۔ تمھارے ہی جیسے ایک سرپھرے ماہر ریاضیات نے ذرے کی تقسیم کا فارمولا پیش کرکے پرمانو کی اختراع کی تھی اور ساری گوری تہذیب کو بازار میں ننگا نچوا دیا تھا۔"

پرمانو ایک عظیم شکتی ہے چاچا۔ آپ خود ریاضی کے معلم ہیں اور جانتے ہیں کہ اس ناقابلِ مغلوب طاقت کا واجب استعمال بنی نوع انسان کی عاقبت بھی سدھار سکتا ہے اور اسے نیست و نابود بھی کر سکتا ہے۔ زندگی کا رنگ روپ سنوارنے سجانے کے لیے ہی مہاتما آئینسٹائن نے اس عظیم شکتی کو کھوجا اور دریافت کیا تھا۔ یہ جنگ جو ہم نے ابھی ابھی لڑی ہے کوئی جنگ تھوڑے ہی تھی۔ جنگیں کیا اس طرح اتنی جلدی ہار جیت کے بغیر ہی ختم ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ تو ایک طرح کا بڑی ہی گھٹیا قسم کا فساد تھا ایک ہی باپ کے دو نااہل بیٹوں کے مابین۔ لڑنے والے سارے کے سارے فسادی تھے۔ سپاہی نہیں تھے۔ آدمیت کی جنگیں تو رامائن مہابھارت اور میدانِ کربلا میں لڑی گئی تھیں جہاں سر کٹوا کر بھی بہادروں کی تلواریں چلتی رہی تھیں۔ جنگیں دِل کی توانائی رُوح کے حوصلے اور بدن کی قوت سے بڑے آدرشوں کے تحفظ کے لیے لڑی جاتی ہیں آسمانوں سے نہتے شہریوں پر قہر کی بارشیں برسا کر نہیں۔ آپ نے کبھی شوخ و شریر بچّوں کو محض تفریحاً مکھیاں یا کیڑے مکوڑے مارتے دیکھا ہے۔ اپنے زعم میں آسمانوں سے موت کی بجلیاں گرا کر اور بھولے معصوم بچّوں اور عورتوں کو ہلاک کرکے حظ اٹھانے والے سپاہی ایسے ناسمجھ بچّوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ عہدِ قدیم میں یونان و مصر و روما کے حکمران نہتے انسانوں کو بھوکے اور خونخوار جانوروں سے لڑا کر اپنی محبوباؤں کی دلجوئی اور تفریحِ طبع کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ہماری جنگ بھی کچھ اسی قماش کا کارنیوال تھی۔ کسی قسم کی بہادری کا مقابلہ نہ تھی۔ ہماری مقبولِ عام کرکٹ کی طرح جہاں ہار جیت کا فیصلہ مقدر کرتا ہے۔ جو لڑائی بچّوں اور عورتوں کے خلاف لڑی جاتی ہے۔ وہ جنگ نہیں ہوتی کیونکہ بیچاری بے سہارا عورتیں اور معصوم بچّے کبھی کوئی جنگ نہیں جیت سکتے۔ آج کی کوئی جنگ اصولوں اور آدرشوں کے تحفظ کے لیے نہیں لڑی جاتی نہ قومی وقار بڑھانے کے لیے ہی لڑی جاتی ہے۔ محض چند جھوٹی اور بے مصرف سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اور اپنے شہریوں پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کی غرض سے لڑی جاتی ہے۔ میں ریاضی کے آنکڑوں سے بنی نوعِ انسان کو سمجھاؤں گا کہ ہر جنگ ایک بے معنی استعارہ ہے لاکھوں

کڑوروں روپے آدمی کی زندگی بنانے سنوارنے کے لیے نہیں انھیں ہلاک زخمی اور اپاہج بنانے پر خرچ کر دیے جاتے ہیں۔ یہ ایک وحشی کھیل ہے جو پہلے بھی کئی بار کھیلا جا چکا ہے۔ اس میں سپاہی کم اور شہری زیادہ تعداد میں مرتے ہیں۔ اس وحشیانہ جاہلیت و بربریت نے کتنی بار کتنی قدیم اور بلند بالا تہذیبوں کو مسمار کیا ہے ـــــ میں ـــــ میں ـــــ میں"

گوتم کے چاچا نے بیٹے کی عجیب و غریب باتوں سے بوکھلائی اپنی بیوہ بھاوج کی طرف حسرت سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"تمھارا یہ بیٹا تمھارے مرحوم شوہر کے دوست کی طرح آج اُسی مالیخولیا کا شکار ہے جو اُس پر ملک کے راج پاٹھ کی تقسیم کے دنوں طاری تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا ـــــ"

پھر اس نے کھُل کر اپنی بھاوج کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ آپ حوصلہ نہ ہاریے بھابھی جان۔ یہ پیروں پیغمبروں اور ولیوں کا نہیں عام آدمیوں۔ معمولی آدمیوں کا زمانہ ہے۔ آپ ہمت رکھیے۔ اُوپر والا چاہے گا تو سب اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی بھی جذبہ چاہے کتنا گہرا ہو ہمیشہ ایک سی شدت سے برقرار نہیں رکھا جا سکتا ـــــ

"یہ کیا ہو رہا ہے بھائی جان۔ یہ لڑکا کون سی زبان بول رہا ہے"

"یہ جو کچھ ہے اور جو کہہ رہا ہے اس کے لیے تمھارا مرحوم شوہر ہی نہیں بلکہ ہم سب برابر کے ذمہ دار ہیں۔ ہم نے اس کا نام گوتم رکھا تھا جو کسی فردِ واحد کا نہیں ایک کیفیت کا نام ہے۔ تم نے اُس پار کے سدھارتھ کی حرکت دیکھی ہے۔ سدھارتھ بھی کسی فردِ واحد کا نہیں ایک کیفیت کا نام ہے اور آپ جانو ہر کیفیت کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس کا یہ مسیحائی درس اور یہ وجدانی کیفیت ایک اُبال ہے۔ ایک جھاگ "

"مجھے تو یہ سمندر کی کبھی نہ ختم ہونے والی جھاگ لگے ہے بھیّا"

سب ٹھیک ہو جائے گا بھابھی جان۔ میں نے کہا نہ کہ یہ پیروں پیغمبروں اور ولیوں کا نہیں معمولی بے حد معمولی آدمی کا زمانہ ہے اور تمھارا بیٹا بھی گوتم بدھ نہیں صرف مسٹر گوتم ہے اور وہ اُبھرا والا سدھارتھ بھی مہاتما بدھ نہیں ہوا بلکہ سدھارتھ ہے۔ دونوں اسی دور کے دو آدمی ہیں۔ معمولی آدمی۔

یہ عجیب بات ہے کہ تمہارے اپنے
دل کی بات یا تمہارے ذہن میں پنپتی ہوئی
کوئی ایسی اُلجھن جس کے اعتراف یا کھلم
کھلا اظہار سے تمہیں گریز ہو کوئی دوسرا بلا
جھجھک یا شرارتاً بھی کہہ دے تو تم ایک دم بوکھلا
اُٹھتے ہو اور اقرار کے بجائے بلاوجہ انکار کرنے
لگتے ہو اور وہ بھی کچھ ایسی گرم جوشی سے
کہ دوسرا تو حیران ہوتا ہی ہے۔ تم خود بھی
بے اطمینانی کا شکار ہونے لگتے ہو۔

شنکر سنگھ مسکرا رہا تھا۔" دیکھتا ہوں
پال صاحب، آپ کو یہ جگہ کچھ زیادہ ہی
بھا گئی ہے۔"

جوگندر کو وہ جگہ واقعی پسند تھی،
مگر اقرار کے بجائے اُس نے سر ہلا دیا "نہیں
برادر ایسی کوئی خاص بات نہیں" پھر قدرے
جھجھک کر بولا "ویسے جگہ خاصی معقول ہے
اور سستی بھی۔ چھت سے سمندر کا
نظارہ تو ظاہر ہے کہ بھلا لگتا ہی ہے یہاں
کے پنیر اور بینگن آلو کے پکوڑے بھی مجھے
بہت اچھے لگتے ہیں۔ اچھی کافی تو تامل ناڈو
کا ہر باورچی بنانا جانتا ہے۔ مگر اس قسم کے
پکوڑے اِدھر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور
ہوں گے۔ ہو سکتا ہے یہ اشیا کسی دوسری
جگہ بھی اسی طرح بنتی ہوں۔ اور شاید نسبتاً
بڑھیا بھی بنتی ہوں، مگر مجھے اِس کا علم نہیں

میں اِس شہر میں اجنبی ہوں، تُم لوگ مُجھے چار پانچ بجے سے پہلے کبھی نہیں چھوڑتے۔ صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک مسلسل بولتے رہنے کے بعد ذہن تو تھکتا ہی ہے، زبان بے چاری بھی خشک ہونے لگتی ہے۔ گرم پانی سے غسل کرکے ذرا سستا کر ادھر آنکلتا ہوں۔ بندرگاہ میں کھڑے جہازوں کا منظر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ براڈوے Broadway ہوٹل بطور عارضی رہائش خاصی آرام دہ جگہ ہے، مگر وہاں سے نہ سمندر دکھائی دیتا ہے اور نہ وہاں اس قسم کی چیزیں ہی کھانے کو ملتی ہیں۔ کیپٹنز کیبن Captains Cabin مُجھے پسند ہے۔ یہ آٹھ دس ہفتے مزے سے گذر جائیں گے۔

شنکر سنگھ مسکرایا۔ "لیجئے آپ کی کافی آگئی اور کیبن کی مالکن بھی جو کافی سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں۔"

یُوں پکڑا جانا جوگندر پال کو اچھا نہ لگا۔ مگر اُسے اعتراف کرنا ہی پڑا کہ اِس نامانوس ساحلی علاقے کی سب سے دلچسپ شے یہ محترمہ ہی ہیں۔

شنکر سنگھ نے بتایا کہ سی سی کی مالکن ایک جہازی کی بیوہ ہیں اور پورے پانچ سال اپنے شوہر کے ہمراہ دنیا کی مختلف بندرگاہوں میں گھُومی پھری ہیں۔ ظاہر ہے کہ کیپٹن ایلبرٹ خاصا زِندہ دل اور دِلچسپ آدمی تھا۔ براڈوے کے سامنے اندردھنش کی ساتویں منزل پر اِن کا تین بیڈروم کا فلیٹ ہے۔ جہاں وہ اپنے بیٹے اوناسس کے ساتھ رہتی ہیں۔ بہت کم گو ہیں۔ البتہ جب کوئی پرانا شناسا جہازی اِس بندرگاہ پر رکتا ہے تو اس کی صحبت میں وقت خاصی زِندہ دلی سے گُزارتی ہیں۔ جہازیوں کے علاوہ دوسرے کسی مرد سے بات نہیں کرتیں۔ سی سی کا مینیجر جیمز کسی زمانے میں اُن کے شوہر کے ساتھ بطور چیف سٹوارٹ سیل کیا کرتا تھا۔ بڑا اچھا آدمی ہے۔ مالکہ کا بڑا احترام کرتا ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا گاہک ہو، کیا مجال ہے، جو اُسے کبھی بھولے سے بھی مغربی کونے والی سیٹ (جو مستقل طور پر مسز ایلبرٹ کے لئے ریزرو رہتی ہے) آفر کرے۔

پال صاحب بولے۔ میں نے انھیں ایک دو بار کافی پیتے تو دیکھا ہے، مگر کچھ کھاتے کبھی نہیں دیکھا۔ بس بیٹھی بیٹھی دس بیس سگریٹ پھونک کر چلی جاتی ہیں۔ جیسے ہی اُوپر آتی ہیں، جیمز بڑے تپاک سے گڈ ایوننگ کہتا ہے اور گولڈ فلیک کی ایک نئی ڈبیہ اور جہاز مارکہ ماچس اُن کی میز پر رکھ کر چلا جاتا ہے۔ میں نے بھی محترمہ کے لبوں سے کبھی کوئی کلمہ نہیں سنا۔ ماسوائے ایک خفیف سی زیر لب مسکراہٹ کے انھوں نے بے چارے جیمز کی گڈ ایوننگ کا بھی کبھی جواب

نہیں دیا۔ مگر جیمز مطمئن ہے۔ گویا یہی اس کے لیے بہت ہے۔ وہ ان کی کافی رکھنے بھی خود آتا ہے کسی بیرے کے ہاتھ کبھی نہیں بھجواتا۔ وہ کافی کے ایک دو سپ کبھی لے لیتی ہیں۔ مگر اکثر پیالہ ویسے ہی پڑا رہنے دیتی ہیں۔

"کیا عورت ہے" شنکر سنگھ مسکرایا۔ "لفظ کے اصلی معنوں میں حسین۔ جوانی کے اولین دور میں تو ظاہر ہے کہ ایک دم قاتلہ رہی ہوں گی۔"

پال صاحب نے مسز ایلبرٹ کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "آپ نے کبھی غور کیا ہے سنگھ صاحب کہ یہ ہمیشہ کالے لباس میں ہی ملبوس رہتی ہیں۔ کبھی کالی اسکرٹ بلاؤز میں تو کبھی کالی ساڑی میں۔ میں انھیں دس دن سے بدستور اسی ایک رنگ کے لباس میں دیکھ رہا ہوں۔"

شنکر سنگھ مسکرایا۔ "اس ماتمی ملبوس میں بھی وہ کرسچین ڈرایر کے کسی بڑے ماڈل ایسی من موہک لگتی ہیں۔"

جوگندر پال جیسے خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوں۔ دھیرے سے بولے۔ "وہ ہر روز اپنی منتخب کرسی پر بیٹھی بندرگاہ میں کھڑے جہازوں کو رات پڑنے تک ایک ٹک دیکھتی رہتی ہیں شام کا گزارنا میری سمجھ میں آرہا ہے، مگر وہ دن بھر کیا کیا کرتی ہیں۔ یہ جاننے کا اشتیاق دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی جان کاری کسی طرح ممکن دکھائی نہیں دیتی۔"

وہ اتوار کا دن تھا۔ یعنی روزمرہ سے چھٹی کا دن۔ ہر چھٹی کے دن کی طرح آج بھی فرم کے منتظمین نے اس کی سیر و تفریح کے لیے سٹاف کار بھجوا دی تھی۔ آج کا دن اس نے میرینا بیچ پر گزارنے کا طے کیا۔ درجن بھر سینڈوچیز، کرافٹ پنیر کا ایک بڑا پیکیٹ کچھ موسمی پھل اور لبالب بھری تھرموس میں عمدہ کافی ڈلوا کر وہ چل دیا۔ یہ سب اہتمام بھی کمپنی کی طرف سے تھا۔ اپنی کنسلیٹنسی Consultancy کے دس سالوں میں اس قسم کا اہتمام اس کے تجربہ میں نہ آیا تھا۔ یہ مدراسی خود تو کام کرتے ہی ہیں، کام لینا بھی جانتے ہیں۔

بیچ خوب صورت تھا، صاف شفاف تھا، مگر رونق کہیں نہ تھی۔ چند یورپی مرد عورتوں اور ناریل کا پانی فروخت کرنے والوں کے علاوہ کوئی چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ حیرت تھی کہ اس شہر کے لوگوں میں خوب صورتی کی حس اس قدر کم تھی۔ اس قسم کے بیچ شمال میں ہوتے تو لوگوں کے میلے لگ جاتے۔ وہ ابھی یہی سوچ ہی رہا تھا کہ پانچ چھ سالہ بچے کو ہاتھ پھیلائے اپنی طرف آتے

دیکھا۔ بچہ اکیلا تھا اور بڑی تیزی سے بھاگا آرہا تھا۔ پال کے پاس آتے ہی اُس کی ٹانگوں سے چمٹ کر انکل انکل پکارنے لگا۔ بڑا ہی پیارا گول مٹول بچہ تھا۔ پال نے اُسے اُٹھا کر چھاتی سے چمٹا لیا۔

"تمہارا نام کیا ہے بی بی"

"ہم بے بی نہیں۔ اونا ہیں۔ بے بی گندی ہے ہم اچھے ہیں۔ ہم اچھے ہیں نہ انکل"

"تم بہت اچھے ہو۔ مگر بے بی کہاں ہے ؟"

بے بی سو رہی ہے۔ ہم دن کو کبھی نہیں سوتے۔ ہم اچھے ہیں۔ ہم اچھے ہیں نہ انکل"

"تم بہت اچھے ہو تمہارے پاپا کہاں ہیں ؟"

"پاپا پاسی کیپٹن ہیں۔ پانی میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس کبھی نہیں آتے بڑے گندے ہیں۔ پاپا گندے ہیں نہ انکل۔ ہم اچھے ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ ہم پانی میں کبھی نہیں جاتے۔

"ارے بھئی آپ تو بہت ہی اچھے ہو اونا جی"

"اونا جی نہیں، اونا سس۔ ہمارا نام ممی نے رکھا ہے ممی بہت اچھی ہے۔ وہ دیکھو وہ ننگی عورت جو گیلی ریت پر لیٹی ہوئی ہے، وہی ہماری ممی ہے۔ آپ اچھے ہیں۔ جمی انکل بھی اچھے ہیں۔ جمی انکل بہت اچھے ہیں، مگر آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے ؟"

"ہم ضرور آئیں گے۔ تم بلاؤ گے تو ہم ضرور آئیں گے"

"جمی انکل ممی سے ڈرتے ہیں۔ ممی ہر روز ہمیں جمی انکل کے ساتھ گھومنے بھیج دیتی ہے۔ مگر جمی انکل کو گھر کبھی نہیں بُلاتی۔ ممی سے سب ڈرتے ہیں۔ ممی کے پاس پستول ہے۔ پستول سے مر جاتے ہیں نا انکل" مجھے بھی ممی سے بہت ڈر لگتا ہے"

"اونا" کسی نے پیچھے سے پکارا۔

بچہ جمی انکل جمی انکل چلاتا پال کی گود سے پھسل کر بھاگ گیا۔ اس نے دیکھا بچہ جیمز سے نہ صرف مانوس ہے بلکہ بے حد پیار کرتا ہے۔

"تم انکل کے کپڑے خراب کرو گے گندے بچے" یہ مسز ایلبرٹ تھیں۔ بکینی میں ملبوس مگر جسم کو ہاؤس کوٹ سے ڈھانپے اور سینڈل ہاتھ میں لیے نہ جانے وہ کب پال کے اِتنے قریب آکھڑی ہوئی تھیں۔"

"او نا بڑا پیارا بچہ ہے۔" "اوناسس اِس کا نام اوناسس ہے۔" محترمہ نے بتایا۔ یہ پہلا موقع تھا جب پال نے ان کی آواز سنی۔

آواز میں نرمی تھی، نغمگی تھی اور تھا ایک عجیب قسم کا حاکمانہ وقار۔ جیمز کی طرف مخاطب ہو کر محترمہ نے پوچھا "کار کا کیا ہوا؟"

"شام کا وعدہ ہے میم صاحبہ۔ آپ کو جلدی ہو تو ٹیکسی لے آؤں۔"

پال کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "ہمارے پاس گاڑی ہے۔ ہم آپ کو گھر چھوڑ دیں گے۔"

"کیا آپ یہیں تک آئے تھے؟"

"جی نہیں گھومنے نِکلا تھا۔ کسی خاص جگہ جانے کا پروگرام نہیں تھا۔ بس آوارگی۔ سوچا تھا اِس بڑے شہر کے گرد و نواح کو دیکھا جائے۔ میں یہاں قطعی اجنبی ہوں۔"

"آپ کو زحمت نہ ہو تو ہمیں بازار تک چھوڑ دیں۔"

جیمز اور اوناسس آگے ڈرائیور کے ساتھ اور وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئے۔

"آپ جی۔ آر۔ کے میں ملازم ہیں۔"

"جی، میں ان کا کنسلٹنٹ ہوں۔ ان کی فیکٹری میں ہماری مشین انسٹال کی جارہی ہے ہفتہ بھر چھ دن مصروف رہتا ہوں اور اِتوار کو وہ لوگ میری تفریح کے لیے اسٹاف کار بھجوا دیتے ہیں۔"

"آپ ہوٹل براڈوے میں ٹھہرے ہیں نا؟"

"جی ہاں، ساتویں منزل کے کمرہ نمبر میں۔ آپ کے فلیٹ کے بالکل سامنے۔"

"تو گویا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"جی ہاں کچھ کچھ۔"

"اوہو" محترمہ مسکرائیں۔ بڑی کھلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

آپ کھانا کہاں کھاتے ہیں۔ جہاں تک میرا ناقص علم ہے۔ براڈوے ہوٹل میں لنچ اور

ڈنر کا کوئی انتظام نہیں ہے۔"

مجھے یہ انتظام پسند ہے۔ میں رات کو کھانا نہیں لیتا۔ آپ کے سی سی ہیں ضرورت کے مطابق شام کو کچھ لے لیتا ہوں۔ دوپہر کا کھانا فیکٹری میں کھاتا ہوں۔ خاصا اچھا کھانا ہوتا ہے وہاں۔"

"جانتی ہوں جی، آر، کے بہت اچھی پارٹی ہے۔" پھر کچھ رک کر بولیں "آپ کھانے کے معاملے میں خاصے محتاط ہیں۔ جبھی اپنے جسم کو اس قدر سنبھالے ہوئے ہیں۔"

پال مسکرایا "ہم کوئی ایسے ادھیڑ عمر بھی نہیں ہیں۔"

"چالیس سال کا آدمی بھرپور جوان ہوتا ہے۔ نظرِ بد دور۔ دیکھنے میں تو آپ مجھ سے بھی کم عمر لگتے ہیں۔"

آپ نے میری عمر کا اندازہ بالکل ٹھیک لگایا ہے۔ مگر آپ تو ماشاءاللہ بہ مشکل پچیس چھبیس کی ہوں گی۔"

"عورت کی عمر کا تخمینہ نہیں لگایا کرتے۔ ویسے میں آج کے دن پورے ستائیس سال کی ہوگئی ہوں۔"

جیمز نے پیچھے مڑکر دیکھا "آج ڈیڈی کا جنم دن ہے۔ آج کے دن ڈیڈی دن بھر گھوما کرتی ہیں۔ مگر کم بخت کار کو آج ہی خراب ہونا تھا۔"

"میں گاڑی کے پیچھے بیٹھ کر گھومنے کو گھومنا نہیں کہتی ایسا لگتا ہے جیسے کوئی دوسرا اپنی مرضی سے پہلے ہی طے شدہ راستوں پر آپ کو گھمارہا ہے۔"

ڈرائیور نے انڈین کافی بورڈ کے مقامی کافی ہاؤس کے سامنے گاڑی روک دی۔

گاڑی رک گئی تو جیمز بولا "بابا سو گیا ہے آج بہت اودھم مچایا ہے اس نے بہت تھک گیا لگتا ہے۔ آپ کہیں تو اسے گھر لے جاؤں۔

"لے جانا بھائی، مگر ایک پیالہ کافی تو پلوا دو۔ میں اس لباس میں اندر تو نہیں جاسکتی۔ جیمز اور ڈرائیور جاکر کافی لے آئے تو ڈرائیور نے بڑی ہی عاجزی اور انکساری سے تجویز پیش کی "میم صاحب خود گاڑی چلانا پسند کریں تو میں اپنے ایک نجی کام سے نپٹ لوں۔ شام کو ہوٹل پہنچ جاؤں گا۔"

ظاہر ہے کہ ڈرائیور کی اس درخواست کا سجھاؤ اسے جیمز ہی سے ملا تھا۔ محترمہ نے

کوئی اعتراض نہیں اٹھایا۔ جیمز نے قریب سے گذرتی ہوئی ایک میکسی کو روکا، بابا اور ڈرائیور کو لے کر بغیر مزید وضاحت کے چل دیا۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ اور گاڑی چل رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی خاص جگہ آجاتی تو محترمہ پال کو بتادیتیں، مگر بغیر کسی قسم کی گرم جوشی کے جیسے کوئی کہنہ مشق ریڈیو اناؤنسر خبریں سناتا ہے اور بڑے سے بڑے حادثے کا ذکر بھی ایسے کر جاتا ہے جیسے عام خبروں کی طرح وہ بھی محض ایک خبر ہو۔

پال کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کچھ یاد آیا؟"

"جی ہاں کلارک۔"

"کلارک؟ آپ کلارک کو جانتے ہیں؟"

"دیکھا نہیں سنا ہے۔"

"کلارک گاتا بھی ہے؟ میں تو اُسے ایک کیبرے ڈانسر کے طور پر جانتی ہوں۔ آج کل مقامی فلمی اسٹوڈیوز میں بھی اُس کی بہت مانگ ہے۔ فلموں میں کیبرے ڈانس کمپوز کرنا، کلب میں چند لوگوں کے سامنے ناچنے سے کہیں بہتر ہے۔ کبھی وہ ایلبرٹ یعنی میرے شوہر کا ماتحت ہوا کرتا تھا۔ ڈانس کے شوق نے اُسے پروفیشنل بنادیا ہے۔ آج کل بہت کماتا ہے۔"

"میں بی بی سی والے کلارک کی بات کر رہا تھا، جو دنیا کے بڑے سے بڑے حادثے کا ذکر بھی ایسے کر جاتا ہے جیسے روزمرہ ایسی بات ہو۔ آپ بھی ادھر کی بڑی سے بڑی عمارت کا نام ایسے لیتی ہیں جیسے وہ براڈوے یا انڈر دھنش جیسی کوئی معمولی عمارت ہو۔"

"آپ براڈوے اور انڈر دھنش کو معمولی عمارتیں سمجھتے ہیں؟"

"ایسی ہزاروں عمارتیں شہر کے گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔"

"ہوں گی۔ جو خاص چیز ان دو عمارتوں میں ہے، دوسری کسی عمارت کو کہاں نصیب ہوگی۔"

"مجھے تو کوئی خاص بات دکھائی نہیں دی۔"

وہ مسکرائی۔ "آپ اور ہم کیا خاص چیز بھی نہیں۔ ایک میں میرا فلیٹ ہے اور دوسری میں آپ کا قیام۔ عارضی سہی، مگر ہے تو۔ سنگ و آہن کے یہ سارے مجسمے بے جان و بے حس

ہیں۔ جب کہ براڈوے کا اپنا ایک کردار ہے۔ میرا ایمان ہے کہ براڈوے اندر دھنش اور سوسی کے علاوہ اِس شہر کے کسی مندر مسجد یا کلیسا کا اپنا کوئی کردار نہیں۔ خدا کے یہ گھر ہمارے احترام کی چیزیں ہیں۔ ممکن ہے خدا کو اپنے نام پر بنی اِن عمارتوں سے خاص اُنس ہو مگر خدا تو ہر جگہ موجود ہے نا ہے نا!

پال چپ رہا۔ وہ اور سننا چاہتا تھا۔ وہ کھُل رہی تھی۔ یہ اُسے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر دونوں چپ رہے پھر محترمہ نے کہا۔ میرے مرحوم شوہر کا نام بھی کلارک تھا ایلبرٹ کلارک ـــــ میں اپنے آپ کو مسز کلارک نہیں لکھتی۔ مسز ایلبرٹ لکھتی ہوں "

"کلارک تو آپ کے شوہر کا ماتحت تھا"

"یہی تو۔ آپ بڑے ذہین ہیں بڑی تیزی سے سوچتے ہیں"

"آپ کو دیکھ کر کوئی بھی۔ جی جان اپنے سوچنے کی قوت کھو سکتا ہے"

"میں بہت خوب صورت ہوں نا"

"میں یہ نہیں کہوں گا۔ خوب صورتی بھی ایک چیز ہے، مگر سب سے بڑی چیز کردار ہے آپ ایک کردار ہیں۔ ویسے مجھے اعتراف ہے کہ میرے مُلاقاتیوں کے دائرے میں بہ اعتبار حُسن بھی آپ سرِفہرست ہیں"

"آپ مجھے بگاڑ رہے ہیں"

"میں بلاوجہ جھوٹ نہیں بولا کرتا"

"ہر مرد خوب صورت عورتوں کی موجودگی میں خوب صورت جھوٹ بولنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ مگر یہ کیا۔ اِتنی باتیں ہو گئیں ہمارے درمیان اور میں نے ابھی تک آپ کا نام بھی نہیں پوچھا"

"یہ انفرمیشن غیر ضروری ہے۔ بہر حال خاکسار کو جوگندر پال کہتے ہیں"

"آپ کب تک یہاں رہیں گے"

"جب تک ضروری ہوگا۔ ویسے فی الحال دس ہی دن کا پروگرام ہے۔ میرا خیال ہے۔ اِتنے دنوں میں جی۔ آر۔ کے والوں کی نئی فیکٹری انسٹال ہو جائے گی۔ کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے"

"جی۔ آر۔ کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"

"وہ اپنے فیلڈ میں یہاں سب سے آگے ہے۔ نئی مشین لگ جانے کے بعد تو نیشنل سین پر آجائیں گے۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔ میں نے پورا ایک لاکھ اُن کی فیکٹری میں انویسٹ کر رکھا ہے۔"

"تب تو مجھے اپنے کام کو اور بھی تیزی سے کرنا چاہیئے۔"

"آپ اِتنے عرصہ کے لیے ادھر آئے ہیں۔ اپنی فیملی کو ساتھ نہیں۔"

"ماں بوڑھی ہے اور چھوٹے بہن بھائی ابھی طالب علم ہیں۔"

"بیوی بچے؟"

"میں نے شادی نہیں کی۔"

"حیرت ہے۔"

"اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

"آپ جیسی شخصیت۔ صحت اور رتبہ - - -

"آپ نے عُمر شامل نہیں کی۔ چالیس سال جوانی کا بڑھاپا اور بڑھاپے کی جوانی ہوتی ہے۔ آدمی کو وقت پر شادی کر لینی چاہیے جو میں نے نہیں کی۔ اب ظاہر ہے کہ۔"

"کیا ظاہر ہے؟"

"کون دے گا اپنی لڑکی میری عُمر کے آدمی کو۔ جب وقت تھا تو میں نے ایک غلط قسم کی عورت کو پسند کر لیا تھا۔ وہ نہیں ملی تو سمجھوتہ نہیں کیا۔ جو اکثر لوگ کر لیتے ہیں۔"

"آپ کی پسند غلط نہیں ہو سکتی۔ مگر حیرت ہے کہ زندگی کی اِتنی طویل راہ میں آپ کو دوسری کوئی نہیں ملی - - - - - -

- - - میرا اپنا خیال ہے کہ کوئی عورت آپ کو ناپسند نہیں کر سکتی۔"

"اگر میں آپ سے شادی کی درخواست کروں؟"

"میری بات اور ہے، میں بیوہ ہوں اور اپنی بیوگی کی ذمہ دار بھی۔ کلارک نے ہمارے یعنی میرے اور راؤنا سس کے لیے جو کیا تھا، اُس کے پیشِ نظر میرے لیے کسی دوسرے سے بیاہ رچانا کفر ہو گا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جو پھر کبھی سناؤں گی۔"

"آپ اپنے کالے لباس میں کسی کیتھولک کانوینٹ کی جوگن سی لگتی ہیں۔"

"میں جوگن نہیں ہوں۔ میں نے بیوگی کا لبادہ ضرور پہنا ہے۔ مگر کلارک میری زندگی میں نہ پہلا آدمی تھا نہ آخری۔"

"آپ بڑی بے باک اور نڈر ہیں۔"

"میں بہادر نہیں تو بُزدل بھی نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی اپنی ڈھنگ سے جی ہے اور اسی طرح جیے چلے جانے کا ارادہ ہے۔ جب تک اوناسس کسی بڑے جہاز کا کپتان نہیں بن جاتا۔ میں نے کلارک سے وعدہ کیا تھا اور یہ وعدہ میں ضرور نبھاؤں گی۔

"ہم دونوں نے سمندر کے کنارے ایک جگہ رک کر پیٹ بھر کھایا۔ کھانے پینے کے بعد محترمہ نے بھرپور انگرائی لی اور وہیں ایک چٹان پر سستانے کے لیے لیٹ گئیں۔

پال نے بھی جماہی لی "نیند آرہی ہے نا۔"

"آپ سو جائیں۔"

"میرے پاس سگریٹ ہیں اور آپ کا کردار۔ آج کا یہ بریف اینکاونٹر۔ آپ کی یہ باتیں، رنگا رنگ کے اس تانے بانے سے یادوں کی ایک خوب صورت شال بنوں گا، اور جب وہ تیار ہو جائے گی تو حفاظت اور قرینے سے تہہ کر کے اُسے اپنی روح پر اوڑھ لونگا تاکہ اس کی گرمی سے آنے والی کتنی ہی خنک اور تنگ و تاریک راتیں کاٹ سکوں۔"

آپ کلارک کی طرح کمزور نہیں ہیں۔ کلارک نے ہماری پہلی تفصیلی ملاقات میں ہی مجھے ..... وہ مسکرا دیں۔

"میں بھی خاصا کمزور آدمی ہوں۔ میرے بدن کا رُواں رُواں آپ کے بدن کے لیے تڑپ رہا ہے، مگر میں نہ چور ہوں نہ ڈاکو۔ میں نے کبھی کسی عورت کے ساتھ زبردستی نہیں کی۔"

"تو آپ بھی۔"

"میں ایک صحت مند، بیدار مغز اور اپنے انداز سے کافی معقول قسم کا آدمی ہوں بلا وجہ۔ میں نے درجنوں عورتوں کے جسمانی تقاضے پورے کیے ہیں مگر اپنی روح کو کبھی داغ دار ہونے نہیں دیا نہ ہی میں نے کبھی کسی عورت کو اپنے ذہن پر سوار ہونے دیا ...... رہی دل کی بات تو وہ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ میں نے جس کو چاہا اُس نے مجھے نہیں چاہا

جو محض اتفاق ہے۔ روایتی مجنوؤں کی طرح میں نے یک طرفہ محبت نہیں کی۔ یک طرفہ چاہت البتہ اکثر کی ہے۔ ایسے جذبات سطحی ہوتے ہیں سان میں دم نہیں ہوتا اور محبت دم اور ثابت قدمی کی طالب ہے۔ جو کہانی تکمیل تک پہنچنے کے اہل نہ ہوا سے یاد بنا کر سجاتے سنوارتے رہنا حماقت ہے، مگر میں آپ کو یہ سب کیوں بتا رہا ہوں۔ آپ سو جائیے۔ میری گود میں سو جائیے۔ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ میں پچھلے دس دنوں سے جیمز کے پکوڑے محض آپ کے دیدار کے لالچ میں کھا رہا ہوں۔ جب کہ تلی ہوئی چیزوں سے مجھے دور کی بھی رغبت نہیں۔ میں کلارک نہیں بنوں گا۔ چاہے آپ کے جسم کی چاہت میرا سارا ذہنی توازن ہی بگاڑ دے۔"

"آپ نے میرا نام نہیں پوچھا۔"

"میں نے آپ کی کہانی جاننے پر بھی اصرار نہیں کیا۔ آپ کا نام جان لینا مشکل نہیں نہ آپ کی کہانی۔ مگر میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ آپ جیسی حسین اور ذہین عورت میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ مجھے خوف ہے تو بس اسی بات کا کہ میں دوسری عورتوں کی طرح آپ کی یاد کو آسانی سے فراموش نہ کر سکوں گا۔ ابھی ابھی میں نے جس تانے بانے کا ذکر کیا تھا۔ وہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں بُنا۔"

"میرا نام للین ہے۔ للین کلارک۔ آپ مجھے لِلی کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ کلارک مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارتے تھے۔"

"میرے لیے مسز ایلبرٹ ہی کافی ہے۔ اب آپ سو جائیے۔ آپ بہت تھک گئی ہیں۔"

للی واقعی سو گئی ـــــ پال نے اُسے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ کتنی ہلکی تھی جیسے روئی کی بنی ہو۔ وہ نیند سے بیدار ہوئی تو پانچ بج رہے تھے۔ گھڑی پر نظر جماتے ہوئے اس نے شکایت کی "تم نے مجھے جگایا نہیں۔ میں پورے دو گھنٹے مدہوش پڑی رہی ہوں۔" للی نے دیکھا کہ سوتے سوتے اس کا بریزیر اپنے آپ کھل گیا تھا اور اس کی برہنہ چھاتیاں آزاد ہو کر دو ننھے بچوں کی طرح اس کے جسم سے چمٹی سو رہی تھیں۔ اس نے ہاؤس کوٹ سے جسم ڈھک لیا۔

"تم مجھے کب سے دیکھ رہے ہو؟"

"جب سے تم سو رہی ہو۔"

"تم نے مجھے چھوا تک نہیں۔"

"مجھے پھول ڈالی میں سجے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ پھولوں کے گلدستے بنا کر گلدان سجانے کی حماقت میں نے کبھی نہیں کی۔ میں نیک نیت آدمی ہوں۔ تم میری حفاظت میں سوئی تھیں۔ میرا فرض تھا کہ تمہاری حفاظت کروں۔ اپنے آپ سے بھی۔"

"تم جیسے انسان کی کنیز بن کر رہنا فخر کی بات ہے۔ ابھی ابھی تم نے مجھ سے شادی کے لیے کہا تھا۔"

"ضرور کہا تھا اور خدا گواہ ہے کہ دل و جان سے کہا تھا۔ مگر تب مجھے معلوم نہ تھا کہ تم کسی کو اب بھی دل میں رکھے ہوئے ہو اور کسی کو دیے ہوئے وعدے سے بندھی ہوئی ہو۔ میں تمہارا جسم ضرور چاہوں گا۔ مگر تمہاری روح کا بٹوارا مجھے منظور نہیں۔"

وہ کب آپ سے تم اور تو پر اتر آئے انہیں خود بھی پتہ نہ چلا۔

"اوناسس اب بھی باپ کے لوٹنے کا منتظر ہے۔"

"بہت پیارا بچہ ہے۔ میں ممتا کا مفہوم سمجھتا ہوں۔"

"اسے ماں کے علاوہ باپ کی بھی ضرورت ہے۔"

"**اگر مجھے یقین ہو جائے کہ میں اونا کا باپ بننے کے اہل ہوں تو اپنی درخواست پھر دہراؤں گا۔ میں** نہیں چاہوں گا کہ اونا کا باپ بنوں اور میرے بیٹے کا مستقبل تمہارا مرحوم شوہر طے کرے — خیر چھوڑو یہ قصہ۔ آؤ کچھ کھا پی لیں۔ مجھے بھوک لگ آئی ہے۔"

باقی جو کچھ بچا تھا دونوں نے مل کر کھایا۔ تھرموس خالی ہو گئی تو للی نے کہا "آج میرا جنم دن ہے"۔

"جیو تم ہزار برس اور ہر برس کے ہوں دن دس ہزار"

اگلے تین دن تک اُن کی ملاقات نہ ہوئی۔ پھر یہ سوچ کر کہ للی نے جان بوجھ کر اپنی شاموں کا معمول ترک کر دیا ہے۔ پال نے بھی سی سی جانا چھوڑ دیا۔ اگلے تین روز تک وہ اپنے کمرے سے نہ نکلا۔

اتوار کو ناشتہ سے فارغ ہو کر وہ حسبِ معمول باہر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ ڈرائیور ایک معمر خادمہ کو ساتھ لے کر آ گیا۔

"میم صاحب بہت بیمار ہیں صاحب۔ آپ کو بلایا ہے"

پال نے دروازہ مقفل کیا تو ڈرائیور نے قدرے جھجھک کر التجا کی۔ **اگر آپ اجازت دیں**

صاحب تو کار کی چابی آپ کو دے دوں۔ میری بیوی بیمار ہے صاحب، چھ روز سے ہسپتال میں پڑی ہے۔ میں چھٹی لے سکتا تھا، مگر اوور ٹائم مارا جائے گا، اسی لیے عرضی نہ دی۔ اگر آپ اجازت دے دیں تو آج کا دن اپنی بڑھیا کے ساتھ گزار آؤں۔"

پال نے بغیر کچھ کہے چابی لے لی اور ڈرائیور کو دس کا نوٹ دے کر کہا۔ "ان کے لیے فروٹ لے جانا۔"

تین بیڈ روم کا وہ فلیٹ ہر لحاظ سے قابلِ دید تھا۔ قیمتی ساز و سامان سے سجے اس فلیٹ میں للی اپنے بچے کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ یہ جان کر اُسے اِس عورت کی دلیری پر رشک آنے لگا۔

"ممی کے پاس پستول ہے۔ پستول سے مر جاتے ہیں ناں انکل۔ مجھے ممی سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

خادمہ نے اُسے احترام سے سب سے بڑی صوفہ چیئر پر بٹھا دیا۔ "پورے چھ روز تک بیمار رہ کر وہ آج ہی کچھ ٹھیک ہوئی ہیں۔ بابا اپنے جمی انکل کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ چھ دن بعد اُن کا پہلا غسل ہوگا۔ ابھی آجائیں گی۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ وہ سخت بیمار ہیں۔"

"انہوں نے ایسا کہنے کو کہا تھا۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ وہ ان دنوں خاصی بیمار رہی ہیں۔ اتوار کو انہیں غالباً سردی لگ گئی تھی۔ سوم اور منگل کو تو وہ تقریباً بے ہوش رہیں کل سے اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا تھا۔ آج ہی ڈاکٹر نے نہانے کی اجازت دی ہے۔ آپ بیٹھیے۔ میں سبزی ترکاری لینے ذرا بازار جاؤں گی۔ وہ ابھی آجائیں گی۔"

پال پانچ دس منٹ ایسے ہی صوفے میں دھنسے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہے۔ پھر اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ عُمدہ فرنیچر، عُمدہ پردے، عُمدہ قالین، سب سے عُمدہ قرینہ، ترتیب، فلیٹ کی مالکن کے خاصے اُونچے ذوق کا اِشتہار تھی۔ پال نے دوسرے کمروں کا طواف کیا۔ کوئی بھی چیز ہندوستانی نہ تھی۔ کچن کا سامان تقریباً سارے کا سارا بیرونِ ممالک سے اکٹھا کیا ہوا تھا۔ جہازیوں کی خصوصیت وہ للی اور کلارک کی تصویر کے سامنے کھڑا اپنے رقیب کے خدوخال کی دیکھ پرکھ کر رہا تھا کہ للی نے پیچھے سے آکر اُسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

"تم نے مجھے ایک دم ڈرا دیا۔"

"تم ڈرتے بھی ہو؟"

"صرف تم سے۔ مگر یہ کیا صورت بنا رکھی ہے تم نے۔ اِتنی بیمار تھیں تو مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟"

"حق دار ہوں کہ نہیں، اِسی چکر میں اُلجھی رہی۔ آج تمہاری چُھٹی ہے۔ سوچا تمہیں کہوں کہ مجھے گھمانے لے چلو۔"

"تم آج ہی بیماری سے اُٹھی ہو۔ بہت کمزور لگ رہی ہو" پال نے للی کو بازوؤں میں بھر کر اُٹھا لیا۔ تم بڑی ظالم ہو۔ میں نے تین شامیں تمہیں بغیر دیکھے گزاریں پھر میں نے سی سی میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ سوچا تم اُس روز کی غیر معمولی تیز رفتاری سے نادم ہو"

" مجھے اُس روز کار میں بیٹھے بیٹھے ہی بخار محسوس ہونے لگا تھا۔ تم نے مجھے چُھوا نہ تھا۔ ورنہ جان جاتے کہ میرا جسم حرارت پکڑتا جا رہا ہے"

کار کی چابی کو میز پر رکھتے ہوئے پال نے کہا۔ آج ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

"صرف باتیں؟"

"باتیں بھی اور پیار بھی جتنا اور جس حد تک تم اجازت دو گی"

ویسے ہی اُٹھائے اُٹھائے وہ اُسے بیڈروم میں لے گیا۔

"یہ بیڈروم کی ڈریس ہے!"

"میں سیر کے لیے تیار ہو کر نِکلا تھا کہ:"

"تو چلو میں بھی سیر کے کپڑے پہن لیتی ہوں"

"اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے کوٹ اتار کر پاس رکھی ہوئی کرسی پر پھینک دیا۔

"اونا کہاں گیا ہے؟"

"شام کو لوٹے گا"

"تمہاری خادمہ؟"

"وہ آج چھٹی پر ہے۔ کل صبح ترکاری لے کر آئے گی"

"تو گویا ہم"

"اکیلے بھی ہیں اور ہر لحاظ سے آزاد بھی"

"آج میں تمہارے سامنے پورے طور پر برہنہ ہو جانا چاہتی ہوں۔ آج میں تمہیں اپنی آتما بھی ننگی کر کے دکھا دوں گی۔ آج تم میری ساری خوب صورتی اور بدصورتی ایک ساتھ دیکھو گے تاکہ فیصلہ کر سکو کہ میں تمہارے کام کی ہوں کہ نہیں"

"تم بے حد امیر عورت ہو"

"یہ درست ہے۔ مگر یہ سب میرا نہیں کلارک کا تھا اور اب اُس کے بیٹے کا ہے۔ میں تو محض محافظہ ہوں۔ سب کلارک کے نام تھا اور اب اس کی وصیت کے مطابق اُس کے بیٹے کا ہے۔ جمی کا کیپٹنسز کیبن بھی اُونا کے نام ہے۔ جمی اِسے چلاتا ہے۔ میں نے اُس سے کبھی حساب نہیں مانگا۔ وہ کلارک کا وفادار دوست تھا اور آج اُس کے بیٹے کا وفادار سرپرست ہے۔ اپنے نجی زیورات اور کپڑوں کے علاوہ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ جیمز اور کلارک مدتوں ایک ساتھ رہے۔ ایک ہی جہاز پر۔ جمی چیف سٹوارٹ تھا اور کلارک چیف آفیسر۔ بطور چیف آفیسر یہ کلارک کا آخری سفر تھا۔ اِس کے بعد اُسے کیپٹن بننا تھا۔ سب طے تھا اور باقاعدہ اعلان بھی ہو چکا تھا۔ مگر تقدیر کے آگے کب کس کا بس چلا ہے"

پال للی کی گود میں سر رکھے اُس کی کہانی سُن رہا تھا۔

کلارک ہمیشہ دوسرے ممالک کی بڑی بڑی جہازی کمپنیوں میں رہا تھا اور دس سال کے قلیل عرصے میں اس نے دس لاکھ روپے جمع کر لیے تھے۔ یہ فلیٹ خرید لیا تھا اور اسے سجا سنوار کر اپنی ضرورت کے مطابق تیار کر لیا تھا۔ وہ تنخواہ کی رقم کبھی خرچ نہ کرتا۔ اپنا نجی گزارہ اور میس کا بِل تاش سے نکالتا تھا۔ وہ ہر بار جیتتا تھا۔ اُس کے ساتھی اُسے گالیاں دیتے۔ مگر پھر اُسی کے ساتھ کھیلتے۔ کہاوت ہے کہ 'لکی اِن کارڈز، اَن لکی اِن لو' یہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ میں نے اُس سے شادی کی۔ اُس کے بچے کی ماں بنی مگر میں اُس سے پیار کبھی نہ کر سکی۔ مگر وہ خوب صورت درندہ تھا، جسمانی پیار کا ہنر نہ جانے اُس نے کہاں سے سیکھا تھا۔ شاید اِس قماش کے لوگ ——— مجھے درجنوں بار ذلیل کرنے کے بعد ہی اُس نے میرے ساتھ بیاہ رچایا تھا۔ شادی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ دُنیا کی ہر میجر پورٹ پر وہ دو چار آوارہ عورتوں سے وابستہ تھا۔ بڑے فخر سے وہ مجھے اُن سے انٹروڈیوس کراتا تھا۔

گویا میں انہیں میں سے تو ہوں مگر اس کی سب سے بڑی ٹرافی بھی ہوں۔
"مجھے کلارک کی کہانی نہیں سننی" پال یکا یک اٹھ کھڑا ہو گیا۔
"تم چپ چاپ میرے ساتھ لیٹی رہو۔ میں تمہاری کہانی تم سے نہیں تمہارے بدن سے سننا چاہتا ہوں۔ تمہاری سانسوں کا آواگون۔ تمہارے دل کی دھڑکنیں سننا چاہتا ہوں۔ تمہارے یہ ہونٹ جنھیں اس نے چوسا تو غالباً سینکڑوں بار ہو گا، مگر چوما شاید کبھی نہیں اور تمہارے گلابی چہرے پر یہ نیلی جھیلیں جس میں مجھے ساتوں بڑے سمندر ایک ساتھ ٹھاٹھیں مارتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر جن کی اچھل کود اس کمبخت نے غالباً کبھی نہ دیکھی تھی۔ تم ایک بھرپور کہانی ہو للی۔ مجھے چند لمحے اس مندر میں جی لینے دو للی۔ تم نے ورڈزورتھ کا نام سنا ہے نہ للی۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات اپنی نظموں کے ایک مجموعے کے پورے عوضانہ سے گلاب کی پتیاں خرید کر اُن کے بچھونے پر سو گیا تھا۔ تمہارا جسم گلاب کی پتیوں سے بنا ہے۔ مجھے اس میں کھو جانے دو۔ اس کی مہک میں سو جانے دو۔
جب للی نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا تو دوپہر ہو چلی تھی۔
"اٹھو اور چائے پی لو۔ للی اب بھی لباس سے آزاد تھی۔ پال نے اُسے پھر اٹھا کر ساتھ لٹا لیا۔

کار بیچ پر پہنچ کر رکی تو پال نے کہا آؤ ذرا گھومتے ہیں"
"میں تو صبح ہی سے گھوم رہی ہوں"
"ابھی تک تو ہم اونچی فضاؤں میں ہی گھوم رہے تھے آؤ ذرا دھرتی پر اُتر کر بھی دیکھیں"
پانچ بجے تک وہ دونوں ننگے پاؤں گیلی ریت پر چلتے رہے۔
دوسری شام وہ سی سی میں ملے تو اونا بھی ساتھ تھا۔ وہ دیر تک اونا کے ساتھ کھیلتا رہا۔ سات بجے آیا اونا کو لے گئی۔
"بڑا کھلنڈرا بچہ ہے"
"جہازی کی اولاد ہے نا"
"تمہارے شوہر کے ماں باپ بہن بھائی ؟"
"تم نے میرے گھر والوں کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں پوچھا"

"تمہارا اپنا کہنے کے لائق کوئی ہوتا تو تم اِس وسیع و عریض خطۂ زمین پر اکیلی نہ رہتیں۔"

تم نے ٹھیک کہا ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میری ماں ایک مسلمان تاجر کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ بھاگ گئی تھی اور میرے باپ نے ندامت میں خودکشی کرلی۔ مجھے نانی نے پالا۔ نانی کے تین بیٹے تھے۔ میرے ماموں۔ مگر تینوں کے تینوں پرلے درجے کے حرامی اور لوفر تھے۔ دُنیا کا کوئی عیب نہ تھا، جو انھوں نے چھوڑا ہو۔ نانی خاصی امیر تھی اپنے والد کی اکلوتی وارث۔ ورنہ بے چاری بھوکوں مرجاتی۔ اپنی زندگی میں نانا نے بیٹوں کو الگ الگ مکان دے کر جدا کر دیا تھا۔ وہ مرے تو نانی اکیلی تو رہ گئی، مگر بے سہارا نہیں۔ مکانوں اور دو کانوں کے کرایہ پر ہمارا گزر بسر ہوتا تھا۔"

"تُم نے کلارک کو کیسے پھانسا؟"

"پھانسا؟"

"میرا مطلب ہے ریپ کے لیے کیسے اُکسایا؟"

وہ مُسکرائی "تمہارا اندازہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ کلارک کے والد نانی کے کرایہ دار تھے۔ بے چارے ایک مقامی فیکٹری میں معمولی کلرک تھے۔ بیوی یعنی کلارک کی ماں بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ لہذا میاں بیوی میں کبھی نہ بنی۔ وہ اکثر جھگڑ کر میکے چلی جاتی۔ ایسے ہی ایک موقع پر کلارک چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ تم جانتے ہو بڑے ٹھاٹ ہوتے ہیں اِن جہازیوں کے۔ سب سے چھوٹا افسر ہونے کے باوجود وہ کوئی پانچ چھ ہزار مہینہ تنخواہ پاتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ہمارے گھر آدھمکتا۔ ہر اتوار باقاعدہ چرچ میں بھی مِلتا۔ نانی کو لڑکا پسند آگیا۔ اُسی کے اُکسانے پر میں کلارک سے کھُلم کھُلا مِلنے لگی۔ کوئی ہفتہ بھر پہلے ہی میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی۔ بھرپور جوان تھی۔ نانی مجھے آگے بڑھانے کی بجائے میرا بیاہ کرکے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ ایک دِن کلارک مُجھے اپنے گھر لے گیا۔ ماں میکے گئی ہوئی تھی اور باپ نوکری پر۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ اُس نے گھر کے سارے دروازے پہلے ہی سے بند کر رکھے تھے۔ میں چیخی چلائی۔ مگر اُس پر تو جیسے بھُوت سوار تھا۔ اُس روز ایک ہی دن میں اُس نے مجھے تین بار ریپ کیا۔

ریپ صرف پہلی بار ہوتا ہے۔

"پہلی بار کے بعد میں نے مزاحمت نہ کی۔"

میں کلارک سے جدا ہوئی تو ہم دوست بن چکے تھے۔ گھر لوٹ کر البتہ میں نے اُس کے ظلم اور اپنی بے بسی کی کہانی کچھ ایسی معصومیت سے سنائی کہ نانی کا دل کھول گیا۔ انھوں نے کلارک کی ماں کو بُلا بھیجا۔ ہمارے گھر میں لمبی کانفرنس ہوئی۔ جس میں میرے اور کلارک کے علاوہ سبھی تھے۔ کلارک کے والدین، نانی اور میرے تین ماموں۔ نتیجتاً میری شادی ہوگئی اُونا اس سے پہلے ہی اینکاونٹر میں ہی میرے شکم میں آگیا تھا۔ ہم جہاز میں تھے جب نانی کی وفات کی خبر ملی۔ میں ٹوکیو سے ہوائی جہاز کے ذریعے گھر آئی۔ مگر گھر پر بڑا ماموں جو تینوں بھائیوں میں سب سے طاقت ور اور خونخوار تھا، قبضہ جما چکا تھا۔ کسی نے میری آمد کو خوش آمدید نہ کہا۔ مجبوراً مجھے سسرال میں رہنا پڑا۔ اونا میرے پیٹ میں اب کافی اچھل کود مچانے لگا تھا۔ لہٰذا واپس کلارک کے پاس لوٹنے کی بجائے میں اُدھر اس کے ماں باپ کے پاس رہ کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔ اونا کلارک کے جنون اور میری کمزوری کی اولاد ہوتے ہوئے بھی بے حد خوب صورت بچہ تھا۔ دادا دادی کا چہیتا۔ دادا دادی کی اِس باہمی کشمکش اب ماند پڑ گئی تھی جہازی قوانین کے مطابق مجھے اب دو سال اکیلے رہنا تھا۔ اسی بیچ میری ماں کا دیہانت ہوگیا۔ کلارک ماتم پر آیا اور چلا گیا۔

اونا بمشکل دس مہینے کا تھا۔ جب ایک رات میرا سسر جسے میں بے حد شریف اور نیک آدمی سمجھتی تھی، شراب میں دھت میرے کمرے میں چلا آیا اور اِس سے پہلے کہ میں سنبھلتی اُس نے کسی عجیب و غریب مشروب میں سَنا ہوا رومال میرے منہ پر رکھ دیا اور میں ایک دم بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو میں لُٹ چکی تھی۔

کلارک کے ڈیڈی اب مجھے ڈارلنگ کہہ کر بلاتے تھے۔ اب ہم باپ بیٹی کی طرح نہیں، ایک مرد اور عورت کی طرح رہتے تھے۔ اُدھیڑ ہوتے ہوئے بھی وہ بھر پور مرد تھا۔

ہر چھ مہینے بعد کلارک گھر آتا۔ مہینہ دو مہینہ رہتا اور لوٹ جاتا۔ میں نے اسے اپنے اور اُس کے باپ سے تعلق کا شک نہ ہونے دیا۔ بڈھا بڑا محتاط تھا۔ میں نے تو سمجھ ہی لیا تھا کہ راز افشا ہوجانے کی صورت میں کلارک مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ بڈھا کلارک سے جلتا تھا۔ ایک دن بولا۔ میرا بس چلے تو اس حرامی پلے کو جان سے مار ڈالوں۔"

"تم نے بیٹے کی بیوی کو ذلیل کیا اب اُسے مارنے کی فکر میں ہو۔ تم آدمی ہو کر جانور۔"
اور تب اُس نے بتایا کہ کلارک اُس کا بیٹا نہ تھا۔ وہ ماں کے پیٹ میں پورے چھ مہینے رہ چکا تھا۔ جب میرے نانا نے میری غریبی اور لاچاری کا فائدہ اٹھا کر اُس کی ماں سے میرا بیاہ کر دیا اور ہمیں دو سال کے لیے باہر بھجوا دیا۔ اپنی کہانی کی تصدیق کے طور پر اُس نے کلارک کی ماں کا خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا اعترافِ گناہ دکھا دیا۔

"ہر عورت جو شادی سے پہلے کسی غیر مرد سے ہم بستر رہ چکی ہو اُس احترام کی حقدار نہیں رہتی جو ایک نیک بیوی کا ہوتا ہے۔"

"یہ بات اُس نے درجنوں بار دہرائی، مگر میں ہر بار چپ رہی۔"

"تم میں حق پر چلنے کا دم نہیں۔ ورنہ تم کلارک سے ہمارے تعلقات کا ذکر ضرور کر دیتیں۔ تم ایک حقیر، بے حد معمولی ادنیٰ اور ذلیل عورت ہو۔ کوئی بھی مرد جو تمہیں جان لے گا، موقع پڑنے پر تم سے وہی سلوک کرے گا جو کلارک نے یا میں نے کیا۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"

"کیونکہ تم سمجھنے لگے ہو کہ تم مجھ سے پیار کرنے لگے ہو اور میں سمجھتی ہوں کہ تم پہلے مرد ہو جسے اپنی دانست میں ـــــ میں بھی"ــــ

"اب جب کہ ہم نے اپنے جسموں اور روحوں کو ہر لباس سے آزاد کر دیا ہے تو باقی کہانی بھی کہہ چکو۔

"ہم لوگ یونان کی اُس بندرگاہ میں تقریباً تین ہفتوں سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ سامان اتارا جا چکا تھا، نیا سامان لادا جا رہا تھا کہ ہمیں خبر ملی کہ باہر اینکر ینج میں کمپنی کا وہ جہاز جس پر کلارک نے پہلی بار سیل کیا تھا خطرے میں ہے۔ انجن روم میں پانی بدستور بھرتا جا رہا تھا۔ جہاز کے کپتان اور روکرو نے جہاز خالی کر دیا تھا۔ جہاز رانی کے انٹرنیشنل قوانین کے مطابق ایسی حالت میں جو شخص ایسے جہاز کو بچا لیتا ہے، وہ ہی اس کا واحد مالک قرار دیا جاتا ہے۔ کلارک اپنے ہی ایسے ایک سیکنڈ انجینیر اور چند دیگر من چلے سیلرز کو لے کر ایک چھوٹی سی کشتی سے جہاز پر پہنچ گیا۔ پورا دن وہ لوگ جہاز پر کام کرتے رہے۔ ہم لوگ بندرگاہ سے دوربینوں کے ساتھ جہاز کو دن بھر دیکھتے رہے۔ شام یا رات کے پہلے جھٹپٹے میں ہم نے دیکھا کہ کلارک اور اُس کے ساتھی اوپر ڈیک پر آگئے ہیں اور خوشی سے ناچ رہے ہیں۔ اور بوتلیں ہاتھ میں لیے شراب اڑا رہے ہیں۔ ڈیک پر روشنی تھی۔ دوربین سے سب کچھ

دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ شور و غوغا تقریباً آدھی رات تک ایسے ہی چلتا رہا۔ لوگوں نے مجھے مبارکبادیں دینی شروع کر دیں۔ مسز کلارک اب تین چار کروڑ کی مالکہ ہیں۔ آپ کا شوہر واقعی ایک بہادر سیلر ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں ایک بڑے جہاز کی ملکیت پا جانا معمولی بات نہیں۔ اس رات ہم لوگ بندرگاہ میں کھڑے گئی رات تک کلارک کی صحت اور خوش قسمتی کے جام اڑاتے رہے۔ بالآخر جب ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کیبنوں میں لوٹے تو نئے دن کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ ۔

۔ ۔ کپتان لارنس نے دوربین سے دیکھ کر کہا۔ وہاں بھی سب لوگ سو گئے ہیں۔"

دوسری صبح جب ہم اٹھے تو دیکھا کہ کلارک کا فتح کیا ہوا قلعہ مسمار ہو چکا ہے۔ جہاز چپ چاپ رات کے سناٹے میں جب ہر کوئی فتح کی خوشی میں بدمست ہو رہا تھا، دھیرے دھیرے سنک کر گیا۔

وہ ایکا ایک اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ الف ننگی تھی، مگر ایسے چل رہی تھی جیسے کمرے میں کوئی دوسرا نہ ہو۔ یا پھر ایسے کہ وہ پورے لباس میں ملبوس ہو۔ چند منٹوں کے بعد وہ کوٹ تو اس کے ہاتھ میں دو کاغذ تھے، جو اس نے پال کو تھما دیئے۔

پہلا خط کلارک کی ماں کا اپنے بیٹے کے نام تھا جس کا مفہوم تھا کہ وہ جس شخص کو اپنا باپ سمجھتا تھا، وہ اس کا باپ نہ تھا۔ اس کا باپ اوناسس نام کا ایک جہازی تھا، جو اس کی پیدائش سے چند ماہ پہلے ہی مر گیا تھا۔ دوسرا خط کلارک کا للی کے نام تھا۔

پیاری للی:

تمہارا نام تتلی ہونا چاہیے تھا۔ تتلی، جو ایک اڑتا ہوا پھول ہوتی ہے۔ نام للی بھی برا نہیں۔ تم واقعی للی ہو۔ میرے فرضی باپ سے تمہارے تعلقات کا مجھے علم تھا۔ وہ میرا باپ ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔ وہ میرا باپ نہیں تھا اور تم نے اس کی ناواجب حرکت کا اشارتاً بھی ذکر نہ کیا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا مناسب نہ سمجھا۔ جب تم نے اس انوکھے تعلق سے سمجھوتہ کر لیا تھا تو مجھے ہی کیوں ــــــ

میں جانتا تھا کہ ایک بار تم میرے ساتھ جہاز پر آ گئیں تو پھر کبھی گھر لوٹنے کے لیے نہ کہو گی یہی ہوا۔ ہم چار سال سے ایک ساتھ ہیں۔ میں نے تمہیں کبھی برا بھلا نہیں کہا۔ جو آدمی خود درجنوں عورتوں سے شادی کے بعد بھی تعلقات رکھ سکتا ہے اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ تمہارے جیسی خوب صورت عورت کو اپنی ذاتی ملکیت مان کر سزا و جزا کی سوچے۔ لارنس سے تمہارے تعلقات کا مجھے علم نہیں تھا۔ بس ایک شک تھا۔ جو کافی نہ تھا۔

البتہ کل اس نے میری کنفی ڈینشیل رپورٹ دکھائی تو مجھے علم ہوا کہ مجھے آگے دھکیلنے میں تمہارا کتنا ہاتھ ہے۔ تم مجھے کپتان دیکھنا چاہتی ہو نا۔ کپتان کی بیوی جہاز کی ملکہ ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایک بڑے جہاز کی ملکہ نہیں مالکہ بنانے جا رہا ہوں۔ اپنی زندگی پر کھیل کر۔ بات بن گئی تو۔ نہ بنی تو بھی تمہارے پاس اب سب کچھ ہے۔ ایک شاندار فلیٹ اور دس لاکھ روپے کے نقدی زیورات اور دوسری چیزیں جو جینے کے لیے ضروری نہیں ہوتیں، مگر تمہارے لیے ضروری ہیں

کل صبح تک فیصلہ ہو جائے گا۔ کل صبح تم ایک امیر بیوہ ہو گی یا ایک جہاز کے مالک کی بیوی۔ خوب صورت عورتوں کے لیے لوگوں نے پہاڑ کاٹے ہیں۔ دودھ کی ندیاں بہائی ہیں یا ریگستانوں کی خاک پھانکی ہے۔ مجھے بھی خوب صورتی سے نباہ کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

تمہارا ایلبرٹ

نوٹ: اوناسس ایک جہازی کا پوتا اور ایک جہازی کا بیٹا ہے۔ اوناسس کو جہاز کا کپتان بنانا۔ میرا سب کچھ اُس کا ہے۔ تم بھی حق دار ہو، مگر اوناسس کی ماں کے ناطے۔ میرا تمہارا ناطہ تو تم جانتی ہو۔ ایک بھرم ہے جو جب تک بنا رہے اچھا ہے۔

اچھا: خدا حافظ

ایک اور بات ـــــ اگر میں لوٹ آیا تو اِس خط کو بھول جانا۔ میں بھی اِس کا تذکرہ کبھی نہ کروں گا۔ خوب صورت عورت سے شادی کی ہے میں نے۔ خوب صورتی سے نباہ کا سلیقہ تو آنا ہی چاہیے۔

"تم!"

"میں نے کہا نہ تھا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں؟"

"تم ہر اُس آدمی کے لیے خدا کا وظیفہ ہو جو خوب صورتی کا شیدائی ہے۔ کیونکہ تم بے حد خوب صورت ہو۔ میں البتہ اِس خط میں تم سے مانگے ہوئے وعدے کو پورا کرنے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں نے اوناسس کو اپنایا تو اُسے اپنے ڈھنگ سے پالنا چاہوں گا ـــــ زندہ آدمی سے جھوٹا وعدہ کیا جا سکتا ہے ـــــ کلارک جیسے شہیدے نہیں۔"

"میں جانتی تھی میری کہانی سن کر تم ـــــ تم جیسا آدمی ـــــ" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ پال نے اُسے چپ نہ کرایا۔ اُسے چپ چاپ گود میں لیے بیٹھا رہا۔ بالآخر جب وہ تھک کر سو گئی

تو اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کاغذ اُس نے جیب میں ڈال لیے۔ کپڑے پہنے اور باہر نکل گیا۔

دوسرے دِن جیمز نے مسز ایلبرٹ کو پال کا خط تھماتے ہوئے کہا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ اِس کا جواب ضروری نہیں"

پیاری للی: تم بہت حسین ہو۔ بے پناہ حُسن جو خدائے پاک کا ایک قیمتی تحفہ ہے، تمہارے لیے ایک ابھیشاپ بن گیا ہے۔ تمہارے دونوں خط میں نے جلا دیئے ہیں کیونکہ اُن کا بوجھ لے کر جینا مُشکل تھا۔ کل شام میں کیپٹنسز کیبن جیمز کے پکوڑے کھانے آوں گا۔ تم ضرور آنا مگر ماتمی لباس میں نہیں، شدھ سفید ساڑی میں جو بے داغ ہو اور جو مُجھے یقین دِلا دے کہ تم نے ماضی کی کینچلی کو اُتار پھینکا ہے۔

کل رات تم میرے پاس تھیں۔ میرے قبضے میں اور میں ــــ مگر مجھے تمہارے اُس خبیث سسر کی بات یاد تھی۔

ہر عورت جو شادی سے پہلے کسی غیر مرد کے بستر ــــ تم میرے لیے کنواری ہو، مریم ہو۔ ایک پاکیزہ روح ــــ

اِسے شادی کا پیغام سمجھ کر چلی آؤ گی تو ہم ایک ہو جائیں گے ورنہ جو شخص ۳۸ سال تک شادی کو ملتوی رکھ سکتا ہے، وہ عُمر بھر بھی کنوارا رہ سکتا ہے۔

تمہارا: جوگندر

دوسرے روز وہ کپٹنسز کیبن میں بہت دیر تک اِنتظار کرتا رہا، جب تک کہ اُسے رات کے لیے بند کر دینے کا وقت نہیں ہو گیا ــــ

وہ نہیں آئی!

"دس سال کا عرصہ وقت کا ایک ادنیٰ
سا حصہ ہوتا ہے۔ مگر اتنے کم برسوں کی
گرد ہی نے اِس کہانی کے خد و خال کچھ
اِس طرح بگاڑ دیئے ہیں کہ آج پانچ میں
بہ مشکل تین اِسے سچ سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے
چند سال بعد تین کا یہ ہندسہ بھی سکڑتے سکڑتے
دو، ایک اور بالآخر صفر ہو کر رہ جائے۔
رام سنگھ نیگی اور رانا پورنا دیوی کی
پریم گاتھا اِس علاقے کی لوک کتھا بن جانی
چاہیے تھی، مگر ایسا ہوا نہیں" کرنل کالا نے
بیئر کا گلاس میز پر رکھ دیا میں نے اکثر جاننا
چاہا ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔ دراصل سچ کیا
ہے۔ کیا سچ وہی ہوتا ہے جو آدمی آنکھوں
سے دیکھے یا کانوں سے سنے! کبھی کبھی
آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی بات بھی غلط یعنی
جھوٹ ہوتی ہے۔ ایک حادثے کو دو
آدمی دیکھتے ہیں، ایک ساتھ ایک ہی وقت
میں۔ حادثہ ظاہر ہے کہ ایک ہوتا ہے۔ مگر
اُسے دیکھنے والی نگاہیں ایک سی نہیں ہوتیں
اِس حادثے کا حال دونوں اپنے اپنے
طور پر بیان کرتے ہیں۔ دونوں سچ کہہ
رہے ہوتے ہیں۔ مگر دونوں کے سچ میں
فرق ہوتا ہے۔ کبھی معمولی کبھی خاصا بڑا۔ اب
الگ الگ رکھ کر دونوں کے بیانوں کا
تجزیہ کیجیے تو آپ کو لگے گا کہ آپ ایک نہیں

دو الگ الگ قسم کے حادثوں کا ذکر سُن رہے ہیں۔ مشترک نکات صرف وقت جائے وقوع یا حادثے کے کردار رہ جاتے ہیں۔ کس نے کس کو مارا؟ کیسے اور کس طرح مارا اور کیتنا مارا؟ کبھی کبھی تو ان بنیادی تفصیلات میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ہر نظر کا تناظر وہ مخصوص ذہنی تربیت ہوتی ہے، جسے ہم شعور سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اَلھڑ دیہاتی اور ایک شہری کے کسی منظر کو دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کے زاویئے الگ الگ ہوتے ہیں ظاہر ہے ایسا ہونا ہی چاہیے۔'

میجر سندرم جواب تک نسبتاً خاموش بیٹھا ہوا تھا اور بیئر کے چھ سات گلاس چڑھا چکا تھا۔ بولا۔

"وہ دوپہر ـــــ کیا میں کبھی اُس معجزہ کو بھول سکتا ہوں"

' کوئی تین بج رہے تھے، مگر ڈھانگ پر کام بدستور جاری تھا۔ میری فیلڈ کمپنی کے صوبے دار نے حکم دے رکھا تھا کہ اُس روز کا مقررہ شدہ کام نبٹا کر ہی سب لوگ کھانا کھائیں گے۔ اور کھانے کے ساتھ رم بھی ملے گی۔ اور پوری چھٹی بھی یعنی پوری خلاصی۔

ہوا یہ کہ صوبے دار اسی طرح کام لینے کا عادی تھا۔ خود جم کر کام کرتا۔ دوسروں سے بھی اُسی طرح جم کر کام لیتا۔ اِس طرح آٹھ گھنٹوں کا کام وہ اپنی ٹکڑی کے مزدوروں سے چار گھنٹوں ہی میں پورا کرا لیا کرتا تھا۔ کام ختم ہو جاتا تو سب کو گرما گرم کھانا مل جاتا۔ کھانے کے بعد یا تو مزدور وہیں گانے بجانے اور ناچنے میں مشغول ہو جاتے یا ڈیرے پر آرام کے لیے لوٹ جاتے۔ طریقہ اصولاً غلط تھا، مگر تھا بے حد مؤثر ـــــ یہ مزدوروں میں مقبول بھی تھا۔'

اُس روز انّا پورنا دیوی میرے ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ بھٹی پر پکتے ہوئے کھانے کو دیکھ کر انھوں نے جیپ رکوا دی۔ صوبے دار صاحب کو بُلا کر پوچھنے لگیں۔

"آپ لوگوں کے کھانے کا کیا وقت ہے؟"

"ساڑھے بارہ سے ڈیڑھ بجے تک"

"اس وقت کیا بجا ہے؟"

"پونے تین"

"تو پھر کھانا کیوں نہیں پروسا گیا ابھی تک؟"

میں نے صوبے دار جرنیل سنگھ کا کام لینے کا انوکھا ڈھنگ اُنہیں سمجھایا تو وہ اور بھی ناراض ہوئیں۔ کڑک کر بولیں ــــ "دیکھو صوبے دار صاحب، آدمیوں کو بھوکے شیروں سے لڑانے والے رومن مر کھپ چکے ہیں۔ یہ ہماری تہذیب نہیں" پھر میری طرف مڑ کر بولیں۔

"میجر سندرم، آپ مجھے میس میں کھانا کھلانا چاہتے تھے نا! آئیے، آج اپنے اِن ساتھیوں کے ساتھ ہی کھا لیتے ہیں۔ میس پہنچتے پہنچتے چار بج جائیں گے اور مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"سب لوگ کام چھوڑ کر ڈھانگ سے باہر آگئے۔ کھانا ختم ہوا ہی تھا کہ دُور سے گونجتی ہوئی تڑاک کی آواز آئی۔ جیسے کہیں بجلی گری ہو یا کوئی بم پھٹا ہو۔ آن کی آن میں سب کی نظروں کے سامنے پہاڑ کا سارا اوور ہینگ دھڑ دھڑ دھڑام آدھا سڑک پر، جہاں چند منٹ پہلے کام ہو رہا تھا۔ اور آدھا دریا میں جا گرا۔"

"سب انگشت بدنداں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دن اور آج کا دن، میرا یقین ہے کہ ٹکڑی کا ہر مزدور انا پورنا دیوی کو ماں جگدمبا کا اوتار سمجھتا ہے۔"

"اور سر وہ کھدرا ڈھانگ والا قصہ"، کیپٹن پُوری نے جھجکتے جھجکتے یاد دِلایا۔

میجر سندرم نے کرسی آگے بڑھالی۔ "وہ میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ ہمارے یونٹ کے لئے پہاڑ کا یہ حصہ ہمیشہ کیک کاٹنے کے مترادف رہا ہے۔ مٹی اور ریت کے اِس بظاہر بے ضرر تودے کو ہم نے کتنی بار کاٹا اور اُس پر سڑک تعمیر کی۔ مگر کچھ ہی ہفتوں میں معمولی آندھی چلنے سے پہاڑ کا یہ حصہ اپنی جگہ سے کھسکنے لگتا ہے۔ پہلے تھوڑی تھوڑی مٹی اُڑتی ہے پھر تودے کے تودے ایک دوسرے کی جکڑ سے آزاد ہو کر سرکنے لگتے ہیں۔ اور ہماری مہینوں کی محنت مٹی ہو جاتی ہے۔ ایک بار تو برگیڈ کی پوری ایک درجن گاڑیاں اِس مٹی کے نیچے دب گئی تھیں۔ جو آج تک برآمد نہیں کی جا سکیں۔ اتنا نقصان مگر کوئی مرا نہیں۔ ڈرائیور بتاتے ہیں کہ سفید لباس میں ملبوس کوئی دیوی ایسی عورت اُن کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور سب کو گاڑیاں چھوڑ کر بھاگ جانے کا حکم دے کر روپوش ہو گئی تھی۔ اکثر لوگ جی جان سے مانتے ہیں کہ وہ انا پورنا دیوی ہی تھیں۔"

"اور وہ بارہ مزدوروں والی بات"، کیپٹن پُوری نے مزید یاد دلایا۔

ایک بار اِسی طرح پہاڑ کے سرکنے سے بارہ نیپالی مزدور نیچے دب گئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سر۔ وہ منحوس خبر ہم نے آپ سے چھپالی تھی تاکہ آپ رات کا کھانا اطمینان سے کھا سکیں۔ کھانے کے بعد جب آپ نے بلا کر مجھ سے حادثہ کی تفصیل جاننا چاہی تھی تو میں واقعی حیرت میں رہ گیا تھا۔ آپ اُس روز دور اُوپر سے پیدل ریکی کر کے تھکے ہارے لوٹے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو کس نے خبر دی تھی۔"

کرنل کمار مسکرائے "مجھے سب یاد ہے۔ جس شخص کی کمان کے دس بارہ آدمی یوں زندہ دفن ہو جائیں وہ کھانا کیسے کھا سکتا ہے۔ انا پورنا دیوی نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اِس قسم کا حادثہ ہونے والا ہے۔ مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوگا۔"

دوسرے دن صبح سویرے ہی ہم نے تین بل ڈوزر کام پر لگا دیئے اور چند ہی گھنٹوں میں ساری نئی مٹی ہٹا دی گئی۔ مٹی کے نیچے ایک بہت بڑی چٹان نکل آئی جو ظاہر تھا کہ طوفان کے زور سے دوسری مٹی اور ریت کے ساتھ نیچے سرک آئی تھی۔ اتنی بڑی چٹان کو صرف ڈائنامائٹ سے ہی توڑا جا سکتا تھا۔ ابھی ہم اِس قسم کی تدبیروں پر غور ہی کر رہے تھے کہ لیفٹیننٹ حبیب نے ہمیں بتایا کہ چٹان کے پیچھے عجیب و غریب قسم کی چیخوں کی دبی دبی آوازیں آرہی ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے چٹان کے آس پاس اور نیچے سے مٹی کھودنی شروع کر دی۔ چند ہی منٹوں میں ایک خاصا بڑا سوراخ نکل آیا، جس کے اندر درجن بھر لاشیں دکھائی دیں۔ ایک ایک کر کے ہم نے سب کو باہر نکالا۔ سب کے منہ پر پانی چھڑکا۔ جسموں کو زور زور سے ملا۔ سارے کے سارے زندہ تھے۔ ہوش آنے پر سب سے کم عمر مزدور نے کہا "اُنہیں بھی تو نکالیے۔"

"ابھی اندر کوئی اور بھی ہے؟"

"بہن جی ——— اُن کا ساتھ نہ ہوتا تو ہم سب دم توڑ دیتے۔"

"ہم سب نے دیکھا کہ اِس بڑی چٹان اور پہاڑ کی جبلی دیوار کے مابین خاصا گہرا بڑے غار میں ایسا شگاف بن گیا تھا جس کی وجہ سے وہ چند جانیں کسی طرح پندرہ سولہ گھنٹے جی پائی تھیں۔"

بڑے فخر سے لیفٹیننٹ حبیب کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کرنل کمار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُس واقعہ کے بعد اُن بارہ مزدوروں کے علاوہ میرے ٹاسک فورس کا ایک ایک فرد فوجی اور

غیر فوجی معمولی کارندے سے لے کر بڑے سے بڑے افسر تک جس میں یہ نیک مرد بھی شامل ہے۔ اناپورنا دیوی کا بھگت ہو گیا۔"

"یہ پہاڑی لڑکی یقیناً کوئی دیوآتما تھی سر"، کیپٹن پوری بتانے لگا۔" ایسے کتنے ہی اور چھوٹے بڑے قصے بھی ہیں سر۔"

اپنے کمانڈر کو ہنسنے کے موڈ میں پا کر لیفٹیننٹ حبیب نے بات جاری رکھی "آپ کو وانگٹو برج والی اُس چٹان کا قصہ بھی تو یاد ہو گا سر۔ جو اچانک بیٹھ گئی تھی۔"

کرنل صاحب: "ارے واہ حبیب میاں یاد کیوں نہیں ہے۔ ہم خود وہاں موجود تھے پھر کمشنر جوال کی طرف دیکھ کر بتانے لگے۔

"نیپالی گورکھوں کی ایک ٹولی جس میں دو عورتیں اور بیس کے قریب مرد تھے، مدتوں سے اِس چٹان کے سائے میں پناہ گزین تھے۔ پہاڑ سے باہر کی طرف لٹکتی ہوئی یہ چٹان کچھ ایسے کھڑی تھی کہ اِس کے نیچے ایک خاصا بڑا غار نما خلا بن گیا تھا جسے چند پرانی بوریوں سے ڈھک کر باہر کے موسم سے محفوظ ہوا جا سکتا تھا۔"

"مرد کام پر جاتے اور یہ عورتیں کھانا وغیرہ بناتیں۔ ہم نے انہیں بھی مسٹر رول پر رکھا ہوا تھا۔ یہ ٹولی بہت اچھا کام کرتی تھی۔"

سیکٹر کمانڈر بڑا دِلدار افسر تھا۔

"یہ عورتیں بڑے کام کی چیز تھیں سر۔ اِنہیں کی وجہ سے یہ ٹکڑی سردیوں میں بھی کام چھوڑ کر نہیں جاتی تھی۔ بیچاری اتنے جوان اور جفاکش مزدوروں کو نپٹائیں یا روٹی کوٹیں۔"

"ایک دن بہت صبح سویرے ہی اِن دو میں سے ایک عورت جو نسبتاً کم عمر کی تھی، اچانک ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی تھی اور چلا چلا کر اپنے ساتھیوں سے چٹان کے نیچے سے باہر نکل بھاگنے کی تلقین کرنے لگی۔ ایک ایک کر کے سب اُٹھ گئے۔ جو رات کو بہت پی گئے تھے اُنہیں گھسیٹ کر باہر نکالا گیا۔ جب سب باہر نکل آئے اور سارا سامان بھی باہر آ گیا تو چٹان میں ایک ہلکی سی جنبش ہوئی اور سب کی آنکھوں کے سامنے وہ دھیرے دھیرے سرکتی سرکتی بالآخر زمین دوز ہو گئی۔"

"نیپالی گورکھے جو ہمارے سب سے اچھے مزدور ہیں، تب سے اناپورنا دیوی کے بھگت

بنے ہوئے ہیں۔ اِس عورت نے بتایا کہ اناپورنا دیوی اُس کے خواب میں آئی تھیں۔ انھوں نے ہی اُسے آنے والی افتاد کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔"

"موؤں کو دِن بھر کی تھکاوٹ اُتارنے کا بس ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔ میں اس رات بری طرح لتاڑی گئی تھی اور شاید خواب کو محض خواب سمجھ کر یوں ہی لیٹی رہتی مگر اُنہوں نے تو جیسے چوٹی سے پکڑ کر مجھے اُٹھا دِیا تھا۔"

"اناپورنا دیوی اپنے علاقے اور اپنے لوگوں میں بھلے ہی ایک معمولی عورت رہی ہوں۔ مگر ہمارے لیے۔۔۔ اب تو خیر اُن کے اپنے لوگ بھی اُن کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔"

"اناپورنا مندر کو سونپی ہوئی۔ پُجاریوں کی دروپدی۔ علاقے کے فارسٹ آفیسر کی صحبت میں رہ کر خاصی پڑھ لکھ گئی تھیں۔ ایسی عورتوں کی اُن دِنوں شادی نہ ہو سکتی تھی۔ مندر کو سونپی ہوئی عورت کسی معمولی آدمی کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ رام سنگھ نیگی بڑا افسر تھا۔ مگر خدا یا خدا کا پادری تو نہ تھا۔ اُن کی موت کے بعد پجاری تک نے اعتراف کیا کہ وہ اُس کی ہر قسم کی کوشش کے باوجود کنواری تھیں۔ اے کاش میں نے خود اُسے اپنے ہاتھوں نیگی کے حوالے کر دیا ہوتا!"

"وہ ایک سنیاسن کی طرح گاؤں گاؤں گھوما کرتیں۔ فوجی کیمپوں میں جانے سے کبھی خوف نہ کھاتیں، فوجی اُن کا احترام کرتے تھے۔ وہ اُنہیں اِن پہاڑوں کی دیوی مانتے تھے۔ وہ سچ مچ ایک دیوی تھی، جس کو سامنے پا کر ہر کوئی احتراماً جھک جاتا تھا۔

"میں نے خود اپنی نگرانی میں رام سنگھ کی لاش ستلج کے برفیلے پانی سے نکلوا کر اناپورنا دیوی کے سپرد کی تھی۔ میں نے خود تو وہ منظر نہیں دیکھا، مگر آس پاس کے درجنوں مرد عورتیں اور خود میرے اپنے ٹاسک فورس کے کئی جوان موجود تھے، جب اناپورنا دیوی نے بڑے اہتمام سے دریا کے کنارے اُن کی چتا تیار کروائی اور خود اپنے ہاتھوں سے اُسے آگ لگا دی۔ جب آگ پوری طرح بھڑک اُٹھی اور لوگ بھڑکتے شعلوں سے پرے ہٹ گئے تو وہ سب کے سامنے، سب کے دیکھتے دیکھتے اُس میں کود کر ستی ہو گئیں۔ کوئی مائی کا لال آگے نہ بڑھا نہ کوئی واویلا ہی ہوا۔ ہر گردن احترام سے جھک گئی تھی۔۔۔

"ہمارے اِس دور میں ستی کی رسم بے معنی ہو گئی ہے۔ مگر جہاں اور جب کوئی عورت

اپنے پتی کے ساتھ ستی ہوتی ہے، ہم اُسے معمولی واقعہ کہہ کر درگذر نہیں کر دیتے بلکہ عقیدت سے سر جھکا کر آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔"

میجر سندرم جواب تک چپ چاپ بیٹھا تھا اپنے کمانڈر کو ساری کہانی کہہ چکنے کے بعد چپ ہوتے دیکھ کر کہنے لگا۔

"آپ کو تو معلوم ہے سر کہ کس طرح ہم پورے دو سال اُس ڈھانگ سے لڑتے رہے۔ درجنوں بار سڑک کاٹی اور درجنوں بار کھودی۔ ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے پہاڑ کا باہر کو نکلا ہوا حصہ کسی نہ کسی سبب سے گر جاتا۔ اور سڑک نیچے دب جاتی، مگر اُس نیک ساعت کے بعد جب جوانوں نے باہمی مشورہ سے یہاں انا پورنا دیوی کا مندر بنایا تو آس پاس اور اُوپر کی چٹانیں چند ہی دنوں میں اِدھر اُدھر بکھر کر کچھ ایسے جم گئیں کہ خود بخود ایک پکا راستہ نکل آیا۔ پچھلے دس سال سے ڈھانگ کے نیچے سے گزرتی ہوئی سڑک جوں کی توں قائم ہے۔"

"جب کبھی باہر کے لوگ اِس نیم سرنگ کو ایسی نفاست سے کاٹنے کے لیے سرحدی سڑکوں کی انجینیرنگ کا کمال کہہ کر ہماری پیٹھ ٹھونکتے ہیں تو ہمارے سر احترام سے کسی کی یاد میں جھک جاتے ہیں۔ ہم فوجی جب کبھی اِس راستہ سے گزرتے ہیں، مندر کے آگے دو منٹ کو ضرور رُکتے ہیں، ڈر یا خوف سے نہیں۔ احتراماً — دلی احترام سے۔"

کمشنر جیال نے کہا "تو رام سنگھ نیگی انا پورنا کا شوہر نہ تھا۔"

"سگریٹ کو حقارت سے پیروں تلے کچلتے ہوئے میجر سندرم نے ٹوکا۔ انا پورنا نہیں، انا پورنا دیوی۔ آپ کی سرکاری کتابوں میں وہ بھلے میاں بیوی نہ ہوں، مگر ہماری نگاہوں میں وہ پتی پتنی تھے۔ شوپاروتی"

کمشنر جیال نے میجر کے غصہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بیئر کی دسویں بوتل کا کاگ اُڑایا اور مگ بھر کر کرنل کمار کو تھما دیا۔

"آپ حضرات کی کہانی آپ کی نہیں، اِس علاقے کے دوسرے کئی حضرات کی جیتی داستان ہے۔ مجھے البتہ اعتراف ہے کہ جس قسم کا احترام میں نے اُن کے لیے فوجیوں میں دیکھا ہے۔ وہ اُن کے اپنے لوگوں میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ سوائے مندر کے بوڑھے پجاری کے جو آپ ہی کی طرح انہیں اِس علاقے کی دیوی مانتا ہے اور اپنے کیے پر آج تک

پشیمان ہے۔

"اس کہانی سے تعلق زاویہ ہمارا ابھی ہے جو اس کہانی کو ایک قطعی نیا موڑ دیکر پُراسرار اور مافوق الفطرت بنا دیتا ہے۔

کرنل کمار اور اُن کے ماتحت افسران نے اپنے میزبان کی بات سُن کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مُسکرا دیئے۔

کمشنر نے فوجی افسروں کی نگاہوں میں جھلکتے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"آپ جانتے ہیں کہ ہم حکومت ہند ایڈمنسٹریٹو سروس کے خاصے بڑے اور جانے مانے رکن ہیں، مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہم ایک اچھے فوٹوگرافر اور خاصے کامیاب ادیب اور صحافی بھی ہیں۔ کہانیاں لکھنا ہمارا محبوب مشغلہ ہے لیکن ہم آپ کو جو کچھ سُنانے والے ہیں وہ ہمارے افسانوی ذہن کی اختراع نہیں۔ افسانہ نہیں، حرف بہ حرف صحیح واقعہ ہے۔"

اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، دروازے پر دھیمی سی دستک سُن کر وہ رک گئے۔ نو وارد نئے ڈپٹی کمشنر صاحب کا ہیڈ کلرک رام لال تھا۔ جسے سبھی لوگ جانتے تھے۔

مہتہ جی کے پی اے کا ٹیلی فون تھا۔ وہ جیوری سے گیارہ بجے چل دیئے تھے یعنی اب پہنچنے ہی والے ہیں۔

رام لال کو رخصت کر کے کمشنر صاحب گویا ہوئے "اس سرحدی علاقے کے لوگوں نے اپنے ناموں میں بڑی ترمیمات کی ہیں اکثر تو اپنے ناموں کے آگے یا پیچھے رام یا کرشن لگا کر دیوتاؤں کے ناتی بن جاتے ہیں۔

کرنل کمار مُسکرائے "یہ ہماچل پردیش ہے۔ ایسا کرنا مناسب ہی ہے" سُندرم نے وضاحت کی "یہاں موت اور زندگی دونوں دیوں کی برکت سے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ کون پتھر کب اور کہاں سے لُڑھکتا ہوا آجائے اور کسی کی جان چلی جائے"

کرنل کمار بولے "میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اگر کسی پتھر پر تمہارا نام لکھا ہے تو تمہیں جانا ہی جانا ہے"

کمشنر جیال نے اس نئے موڈ میں بہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنی کہانی کہنے کے لئے بے قرار تھے۔

"وہ بڑی ہی تاریک اور ڈراؤنی رات تھی۔ تین دِن کی مسلسل بارش نے قومی شاہراہوں کا ستیاناس کر دیا تھا۔ سڑک جگہ جگہ سے اُکھڑ گئی تھی۔ اور اس میں جا بجا گڑھے پڑ گئے تھے۔ گاڑی چلانا مشکل ہو گیا تھا۔ اُوپر سے دسمبر کی برفیلی سردی۔ جیسے ہی ہم اس فارسٹ ریسٹ ہاؤس کے قریب پہنچے ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا کہ آگے بڑھنے کی بجائے رات ہم یہیں ٹھہر جائیں۔ جیپ کو ریسٹ ہاؤس کے احاطے میں کھڑا کر کے ہم باہر نکلے تو دیکھا کہ ریسٹ ہاؤس کے تینوں کمروں پر تالے پڑے ہیں۔ اور برآمدے کی رُوشنی بھی گُل ہے۔"

"ڈرائیور چوکیدار کے کمرے میں گیا، مگر وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ ابھی ہم اِسی ادھیڑ بن میں تھے کہ اچانک ایک کمرے کا دروازہ کُھلا اور ایک صاحب شب خوابی کے لباس میں باہر برآمدے میں تشریف لے آئے۔ میں ان حضرت کی موجودگی کو صرف محسوس کر سکتا تھا مگر اُنہیں دیکھ نہ سکتا تھا۔ اندھیرا خاصا گہرا ہو چلا تھا۔ اچانک آواز آئی "ارے کمشنر صاحب، حضور، آپ اِس وقت یہاں!"

"لگاتار بارش کی وجہ سے سڑک جگہ جگہ چھوٹے بڑے پتھروں سے اٹی پڑی ہے۔ ہر دس بارہ گز پر گڑھا پڑ گیا ہے۔ آگے کا راستہ اور بھی دشوار ہو گا۔ یہی سوچ کر ہم نے طے کیا ہے کہ اِس اندھیری رات اور برفیلی یخ فضا میں مزید بھٹکنے کی بجائے رات بھر یہیں رُک جائیں۔ مگر دیکھتا ہوں یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

کیوں! کیوں نہیں حضور۔ آپ کا یہ خادم تو ہے آپ نے بہت اچھا کیا۔ تین میل کے بعد راستہ بالکل بلاک ہے۔ آپ جاتے بھی تو لوٹ کے آنا پڑتا۔"

ہم نے ذرا جھجک کر اعتراف کیا "ہم نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

اِس رات کے اِس اندھیرے میں کون کس کو پہچان سکتا ہے۔ میں نیگی ہوں حضور والا —— رام سنگھ نیگی۔ منڈی کا فارسٹ آفیسر۔"

ابھی تک ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا نہ تھا۔ اور اغلب تھا کہ ہماری یہ رسمی گفتگو کچھ دیر اِسی طرح جاری رہتی کہ دُور سے لالٹین لئے ایک بوڑھا آدمی باہر سے ریسٹ ہاؤس کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ چوکیدار تھا۔ آتے ہی بولا "صاحب جی، مجھے معاف کرنا۔ بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے لالٹین میں تیل ڈلوانے اور یہ بوتل بھروانے بازار چلا گیا تھا۔

پھر کھلے دروازے کی طرف دیکھ کر قدرے خفگی سے بولا "دروازہ کس نے کھولا۔"

چوکیدار کے اِس جملہ نے ہمیں یاد دِلایا کہ جیپ کی ہیڈ لائٹ میں ہم نے بھی دیکھا تھا کہ سب دروازے مقفل تھے۔"

نیگی صاحب نے بِلا جھجک فرمایا۔ "دروازہ میں نے کھولا ہے رام چند۔ بلکہ میں نے بھی نہیں۔ دروازے کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ کھُل گیا۔ تم ساتھ والا دروازہ باہر سے مقفل کر کے غالباً بھول گئے تھے کہ اِس دروازے کی چٹخنی بھی اندر سے چڑھانی ہے — تمہاری بھُول سے ہماری جان بچ گئی، ورنہ اس سردی میں جم گئے ہوتے۔"

چوکیدار ذرا ڈھیلے پڑتے ہوئے مُسکرایا۔ "بھُول سب سے ہو جاتی ہے صاحب۔ اب دیکھئے نا میں لالٹین میں تیل تو ڈلوا لایا اور یہ خالی بوتل بھی بھروا لایا، مگر چابیوں کا گچھا بنئے کی دوکان پر ہی چھوڑ آیا۔ اب لوٹ کر لینے جاؤں بھی تو کچھ نہ ہوگا۔ وہ دوکان بند کر کے گھر جا ہی رہا تھا کہ میں پہنچ گیا یہ سامان لینے۔ اب وہ کہاں ملے گا۔ رات آپ دونوں صاحبان کسی طرح اِسی ایک کمرے میں گزار لیں تو تالے نہ توڑنے پڑیں گے۔" پھر تیل کی بوتل دکھاتے ہوئے بولا۔ "میں کمرہ ابھی جگمگائے دیتا ہوں۔"

"ہم نے دیکھا کہ چوکیدار بڑھاپے کے باوجود بے حد پھُرتیلا تھا۔ ہر کام بھاگ بھاگ کر کرتا تھا۔ منٹوں میں اُس نے ٹیبل لیمپ میں تیل ڈال کر جلا دیا۔ ڈرائیور سے مِل کر ہمارے بستر لگا دیئے۔ فائر پلیس میں آگ جلا دی اور ناشتے کے لیے چائے کے علاوہ آلو کی سبزی اور کرکرے پراٹھے بھی بنا لایا۔ اس کی گھر والی پراٹھے تلتی جاتی تھی اور وہ ہمیں بھاگ بھاگ کر پروستا جاتا تھا۔ ہم دونوں نے کم از کم چھ چھ پراٹھے کھائے ہوں گے اُس رات۔"

"یہ تمہاری گھر والی اب تک کہاں تھی؟" یکایک ہمیں یاد آیا تھا کہ جب ہم اِدھر پہنچے تھے تو اس کے کمرے کو بھی خالی ہی پایا تھا۔

"ایک دم چھوئی موئی ہے صاحب! میں ڈھونڈتا رہوں تو بھی نہیں ملتی اور جب ملتی ہے تو اپنے آپ مِل جاتی ہے۔ بتا رہی تھی کہ جب آپ کا ڈرائیور ہمارے کمرے میں گیا تھا، وہ وہیں تھی۔ مگر فوجی لباس میں ملبوس اس لمبے چوڑے اجنبی کو دیکھ کر ڈر گئی تھی اور وہیں کونے میں دبکی پڑی رہی تھی اور اُس بے چارے نے اندھیرے کی وجہ سے سمجھا تھا کہ کمرہ خالی ہے۔"

ڈرائیور کا ذکر آیا تو ہم نے پوچھا "ہمارا ڈرائیور کہاں ہے؟ اسے بھی کھانا دیا ہے کہ نہیں؟" "وہ گاڑی لے کر نیچے بازار میں چلا گیا ہے۔ کہتا تھا وہیں کھا لوں گا۔"

ہمیں اچھا نہیں لگا، مگر نیگی صاحب نے یاد دلایا کہ بازار میں درجنوں ایسی گاڑیاں کھڑی ہیں اور ٹھیکہ رات بھر کھلا رہتا ہے۔ موج میلہ کر رہا ہوگا۔ میرا اپنا ڈرائیور بھی وہیں ٹھہرا کرتا ہے۔ آدمی اپنے سماج میں ہی خوش رہتا ہے۔

چوتھا پراٹھا ہاتھ میں لیتے ہوئے ہم نے کہا "کیا پراٹھے بنائی ہے تمہاری گھر والی رام چندر جی اور یہ آلو کی بھاجی بھی بہت عمدہ ہے۔"

"گھر کے دیسی گھی میں بنی ہے نا صاحب۔ سارے مسالے دستیاب ہوتے تو آپ مدتوں ذائقہ نہ بھولتے۔"

"میری بڑھیا بھیم کی بیٹی ہے۔ بھیم سین جو رام پور کے راجہ جی کا رسوئیا تھا۔ کیا آدمی تھا صاحب! ایک دم مہابھارت کے بھیم کی طرح لحیم شحیم، تندرست اور توانا۔ کھانا بھی وہ پانڈو راجکمار جیسا ہی بناتا تھا۔"

"بھیم کے کھانا کھانے کی کہانیاں تو ہم نے سنی ہیں، مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ کھانا بنانے میں بھی ماہر تھا۔"

"واہ صاحب، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ پانڈوؤں نے اپنے بارہ سالہ بن باس کا آخری سال مہاراج دروپد کی ملازمت میں گزارا تھا۔ بھیم راجہ کا رسوئیا بن کر رہا تھا۔ وہ کھانا بنانے کی کلا میں ماہر تھا۔ جبھی تو رسوئیا بنا تھا اور وہ بھی ایک بڑے پراکرمی راجہ کا۔"

"نیگی صاحب مسکرائے "تمہیں مہابھارت کی کہانیوں کا اچھا گیان ہے رام چندر۔"

"میں اسی یگ کا آدمی ہوں صاحب۔ مگر میرا نام آپ کو کس نے بتایا۔"

"یہ فارسٹ ریسٹ ہاؤس ہے نا۔ ہم اپنے محکمے کے ہر اچھے کرمچاری کا نام جانتے ہیں۔"

"آپ؟"

"ہمارا نام رام سنگھ ہے۔ رام سنگھ نیگی!"

"آپ نیگی صاحب ہیں؟" نہ جانے کیا سوچ کر وہ ایک دم رک گیا اور پراٹھے رکھ کر لوٹ گیا اپنے کمرے میں۔

تھوڑی دیر بعد لوٹا تو اُس کی بیوی بھی اُس کے ساتھ تھی۔

"میری گھروالی ہے صاحب! آپ نے کھانے کی تعریف کی تھی نا یہ خود اپنے کانوں سے سُننا چاہتی ہے۔"

ہم نے دس دس کے دو نوٹ بڑھیا کو پیش کرتے ہوئے کہا "یہ ہمارا اندرانہ ہے آپ واقعی بہت عمدہ کھانا بناتی ہیں۔"

"کھانا بنانا بھی ایک کلا ہے۔" نیگی صاحب نے کہا۔ بڑھیا ایک ٹک اُنہیں دیکھے جارہی تھی۔ پھر اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہی ہو "بالکل وہی ہیں"

رام چندر اور اُس کی پتنی کے چلے جانے کے بعد ہم دوسری قسم کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اور گھنٹوں بیٹھے اپنے اپنے محکمے کی خصوصیات اور برائیاں جانچتے پرکھتے رہے۔ علاقے کی سیاست اِس کے مخصوص کلچر، قومی اور بین الاقوامی خبروں کا چرچا بھی ہوا۔

یکایک نیگی صاحب جو ابھی تک لیٹے لیٹے باتیں کر رہے تھے، اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"کیا آپ نے کبھی محبت کی ہے کمشنر صاحب؟"

"ہر کوئی محبت کرتا ہے۔ ہم نے بھی کی ہے۔ نتیجتاً چار فرشتوں ایسے بچوں کے باپ ہیں۔"

"میں محبت کی بات کر رہا تھا حضور، شادی کی نہیں"

"جس سے شادی کرتے ہیں، اُس سے محبت بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"ضرور کر سکتے ہوں گے۔ مجھے اِس کا تجربہ نہیں۔ میں نے کئی بار محبت کی ہے۔ مگر شادی کبھی نہیں کی۔ اِس جنم میں کیا کسی جنم میں بھی نہیں۔ جنم جنمانتر سے ہم پیار کر رہے ہیں۔ شادی ہماری کسی جنم میں نہیں ہوتی۔"

اب ہم بھی اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ نیگی دلچسپ آدمی ہے۔ ہم نے سوچا۔

اپنے سرہانے کے نیچے سے چاندی کے نازک سے فریم میں مڑھی ایک رنگین تصویر ہماری طرف سرکاتے ہوئے بولے "اسے دیکھتے ہیں؟"

"یہ کوئی جانی پہچانی صورت ہے۔"

ہے نا۔ یہ ایک شاہکار تصویر ہے، ایک ایسی [illegible] سے ساری دنیا مانوس ہے۔

غالباً کسی مشہور پینٹنگ کی کامیاب ری پروڈکشن"

"میلوں سے بھاگتے اُڑتے وقت کے لامتناہی تسلسل سے یہی ایک شے ہے، جسے میں کسی طرح بچا کر اپنے لئے محفوظ رکھ سکا ہوں۔ یہ انا پورنا کی تصویر ہے۔ بظاہر معمولی مگر میرے لئے ایک ایسی یاد کی شبیہہ جس میں میری سینکڑوں ناکام زندگیوں کے سارے رنگ، ولولے، امنگیں اور آرزوئیں سمٹ آئی ہیں۔ مغرب میں لوگ اسے مونا لیسا کہتے ہیں۔ مصور کا نام تک طے ہے۔ لیونارڈو ڈاونچی۔ ایک اطالوی نام ہے۔ میری انا پورنا کو مونا لیسا کہنے سے اس کا دیس اور بھیس بدل جائے گا۔ یہ ایک بھارتیہ لڑکی ہے تصویر کو ایک نظر دیکھ کر ہی نام اور نام والی یعنی لفظ اور معنی کا رشتہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اَن اپورن ا،

"انا پورنا دیوی آپ کی!"

"میں نے عرض کیا نا کہ میں نے کبھی شادی نہیں کی۔ راہِ محبت میں ہم دونوں ہمیشہ راسخ، ثابت قدم اور ایک دوسرے کے وفادار رہے ہیں۔ ہر زندگی میں ہر عہد میں، ہر یُگ میں، ہمارا رشتہ کوئی ایک یا دو یا دس بیس زندگیوں اور جنموں کا نہیں، ازلی اور ابدی ہے۔ اگر کسی جنم میں ہماری شادی ہو جاتی تو ہم جنم مرن سے آزاد ہو جاتے مگر ہماری قسمت کے ستارے بدستور گردش میں ہیں۔ پھر بھی مطمئن ہیں۔

محبت بڑی لطیف شے ہے کمشنر صاحب! بے حد پُر لطف۔ محبت اِس نٹ کھٹ زندگی کے گرم اور شیتل پانیوں کو اپنی چھاتیوں کی خوب صورت اور مضبوط گولائیوں میں جکڑے رکھنے کا بھرپور دم رکھتی ہے کمشنر صاحب۔

آپ ساحل اور سمندر کے رشتہ کو تو سمجھتے ہیں نا! کیسے خود کٹ پھٹ کر بھی بیچارہ ساحل کھلنڈرے سمندر کی ہر ادا کو جھیلتا ہے۔ ہر طوفان کی موج کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتا ہے ـــــ محبت ساحل ہے۔ کچھ ایسی ہی چیز ہے محبت"

ہم نے کچھ دیر چپ رہ کر کہا ـــــ آپ ایک اچھے خاصے عہدے دار ہیں۔ خاصے پڑھے لکھے ذہین اور صحت مند انسان ہیں۔ کوئی بھی لڑکی . . . ."

"ایسا ہو جاتا تو ہماری کہانی بھی تو ختم ہو جاتی"

ہم نے مسکرا کر کہا "شادی خانہ آبادی ہی نہیں، کبھی کبھی خانہ بربادی بھی۔

ہوتی ہے۔ یہ ایک سونے کی زنجیر ہے۔ مرد کے لیے پھندہ۔ عورت کے لئے طوقِ غلامی۔"
وہ عورت ہے اور نہ میں مرد ـــــ وہ تو ایک اپسرا ہے۔"
"اور آپ سورگ کا کوئی فرشتہ۔"
"آپ کے لہجے میں ـــــ مگر آپ کی بات واقعی سچی ہے۔ محبت کرنے والوں کی اصلی آماجگاہ دراصل سورگ ہی ہے۔"
"ہم نے اِس دھرتی پر جا بجا سورگ بکھرے دیکھے ہیں۔"
ہماری شادی ہو جاتی تو ہمارا گھر بھی ایک سورگ ہوتا۔ مگر ـــــ کہانی ختم ہو جاتی۔ محبت کی کہانی کبھی ختم نہ ہونی چاہیے۔ محبت کرنے والے بڑے لالچی ہوتے ہیں کمشنر صاحب! اپنی کہانی کو انجام تک لے آنا اُنہیں کبھی گوارا نہیں ہوتا۔ ہم جب جب اِس دھرتی سے لوٹے، دیوتاؤں اور سورگ کی اپسراؤں نے پھولوں سے ہمارا استقبال کیا۔ جب جب ہمیں مقدروں کے خدا کے حضور میں پیش کیا گیا۔ اُس کا فیصلہ ہر بار وہی رہا۔
"اناپورنا تم عورت ہو۔ تخلیق کی ساری رعنائیوں سے بھرپور۔ ایک مکمل اپسرا۔ تم نے دھرتی پر جا کر اپنا دھرم نہیں نبھایا اور اسی لباس میں لوٹ آئیں جس میں گئی تھیں۔ بھرپور جی کر اور پوری طرح داغ دار ہو کر زمین پر اپنا ثانی چھوڑ کر لوٹتیں تو ہم بھی تمہیں اِن سادہ لوح دیوتاؤں کی طرح خوش آمدید کہتے۔
اور تم رام سنگھ۔ تم نے پھر مرد کی مریادہ توڑی ہے۔ ہم تمہیں کوئی تیسری جنس بنا کر ہی زمین پر پھنکوا سکتے تھے۔ ہم نے بار بار تم پر رحم کھایا۔ تمہیں پھر جانا ہے۔ اناپورنا پانچ سال بعد جائے گی۔
خدائے مقدر کے غصے میں نفرت و حقارت نہیں ہوتی۔ جھوٹ موٹ کی بناوٹی خفگی ہوتی ہے۔ جسے وہ دیولوک کے سارے باسی جانتے ہیں۔ محبت کا نام مٹانے یا چھوٹا کرنے کا اُن کا ارادہ نہیں ہوتا۔ یہ بھید ہم نے جان لیا ہے۔ البتہ یہ بھی درست ہے کہ اُن کا کوئی بندہ حالات سے ہار کر جان دے دے تو یہ انہیں اچھا نہیں لگتا۔ مگر دو عاشقوں کی ناکامیٔ عشق کی وجہ سے خودکشی کر لینا انہیں کبھی بُرا نہیں معلوم ہوا۔ چونکہ اِن حالات کے ذمہ دار وہ خود ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر ایسی موت پر خود شرمسار ہوتے ہیں۔

اب ہم کچھ بور ہونے لگے تھے۔ ہم نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"اتنا پورنا کہاں ہے؟"

"آپ کے ہاتھ میں!"

"میرا مطلب تھا!"

اور آسمان کی طرف اشارہ کر کے اُنھوں نے آنکھیں مُوند لیں۔ "اپنے آبا کی اُسی پرانی حویلی میں، جہاں سے ہم سب اِس دھرتی پر اپنی اپنی باری سے بھیجے جاتے ہیں۔"

ہمیں آدمی کچھ تھیئٹریکل اور خبطی سا لگا۔ کیا سنک تھی۔ ہم نے تصویر لوٹاتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا۔ کچھ ایسے کہ دیکھ کر اُنھوں نے آنکھیں پھر موند لیں۔ جی چاہا کہ پوچھوں کہ وہ نہیں رہی تو آپ کیسے زندہ ہیں مگر بات بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اب مزید کچھ کہنے کے موڈ میں وہ بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا شب بخیر کہہ کر ہم نے پائنتی بدل لی۔ دن بھر کے تھکے ہوئے اور پیٹ بھر کھائے ہوئے تو تھے ہی۔ آن کی آن میں سو گئے

دوسری صبح ہم جاگے تو دیکھا نیگی کا بستر خالی ہے۔ نہ صرف خالی بلکہ ایسے سلیقے اور نفاست سے سجا سنوارا اور تنا ہوا۔ گویا ابھی ابھی نئی دُھلی اور باقاعدہ استری کی ہوئی چادر سے تیار کیا گیا ہو۔ چادر ایسی کہ نئے ڈٹرجنٹ کا اشتہار لگے۔ کہیں کوئی بَل نہ تھا۔ ہم دِل ہی دِل میں نیگی صاحب کے سونے کے انوکھے ڈھنگ کی تعریف تو کر ہی رہے تھے، ساتھ ہی اُن کے باتھ روم سے آنے کا اِنتظار بھی۔ مگر جب کافی دیر تک باہر نہ آئے تو لاچار اُٹھ کر ہم نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ جواب نہ پاکر ہم نے جیسے ہی دروازے کو کھٹکھٹانے کی غرض سے چھوا، وہ کُھل گیا۔ اندر کوئی نہ تھا۔ باتھ روم بھی ایک دم صاف شفاف تھا۔ پانی کی ایک بوند بھی نہ اِدھر نہ اُدھر دِکھائی دی۔ ہم نے سوچا پہاڑی آدمی ہیں۔ صبح کی تازہ ہوا خوری کے لیے باہر نکل گئے ہوں گے۔ لہٰذا اپنی کاہل طبیعت کو کوستے ہوئے ہم باتھ روم میں گھس گئے۔ روزمرہ کی ضروریات سے کسی طرح فارغ ہو کر ہم باہر آئے تو ہماری نظر اپنے شب خوابی کے کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ ایک دروازے کی چٹخنی کھلی تھی اور دوسرے کی اندر سے بند۔ یکایک ہمیں یاد آیا کہ کھلی چٹخنی والا دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ ہم نے بڑھ کر اسے کھولنا چاہا۔ وہ واقعی بند تھا۔ دوسرے دروازے کی چٹخنی اُٹھا کر باہر آئے تو دیکھا رات والا

نالاجوں کا توں اُسی دروازے پر پڑا ہوا ہے۔
ہم ایک دم سکتے میں آگئے۔ گھبرا کر اندر باتھ روم میں گئے۔ اس کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا، مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اب تو ہم ایک دم پریشان ہو گئے۔ نیگی صاحب کمرے میں نہیں تھے۔ دروازے اندر سے بند تھے۔ وہ باہر کیسے گئے۔ سردی کی وجہ سے کھڑکیاں اور روشن دان تک اندر سے بند رکھے ہوئے تھے۔ تو پھر۔
ایک بھرپور مرد تو کیا ایک بندر کا بچہ بھی ایک بار اندر آکر دروازہ یا کھڑکی کھولے بغیر کسی طرح باہر نہیں جا سکتا تھا ـــــ تو پھر ـــــ
ابھی ہم اِسی اُدھیڑ بن میں تھے کہ ہمیں اپنے اندر ایک قطعی نئی اور انوکھی قسم کی کیفیت کا احساس ہوا۔ ہمیں لگا کہ ہم بے حد بھوکے ہیں۔ جیسے ہم نے برسوں سے کچھ کھایا نہیں۔
رات ہم نے ضرورت سے زیادہ کھا لیا تھا۔ مگر اِن چھ سات گھنٹوں میں اِتنا ڈھیر سا کھانا۔ ایک دم کیسے ہضم ہو گیا۔ ہضم ہو گیا تو گیا کہاں ؟
آدمی صحت مند ہو، بھوکا رہا ہو، کھانا اچھا اور لذیذ ہو تو اِتنے عرصہ میں ہضم بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی کیفیت تو ایسی تھی گویا کئی رات سے ہم نے کچھ نہ کھایا ہو۔ کبھی کچھ نہ کھایا ہو۔ ہم باتھ روم میں گئے تو تھے مگر ایسے ہی اُٹھ آئے تھے۔ فارغ ہوئے بغیر۔
ہمیں تب یاد آیا کہ بیڑی اور دو تین سگریٹوں کو پھونکے بغیر ہمارا صبح کا کلیان کبھی نہیں ہوا۔
نیگی صاحب اور رات کی واردات ہمارے ذہن میں ابھی تازہ تھی۔
چائے کا آرڈر دینے کے لئے ہم باہر آئے تو دیکھا کہ ہمارا ڈرائیور برآمدے میں ایک نوجوان سے محوِ گفتگو ہے۔ ہمیں دیکھ کر وہ نوجوان قدرے جھجکا۔ پھر مسکرا کر بولا۔
"معاف کرنا صاحب جی! میں رات حاضر نہ ہو سکا۔ کل شام گاؤں گیا تھا۔ بارش کی وجہ سے مجبوراً اُدھر ہی رُکا رہا رات بھر۔"
"تم کون ہو!"
"چوکیدار ہوں صاحب ـــــ چائے تیار ہے۔ میں ابھی اِن سے یہی پوچھ رہا تھا کہ ناشتہ میں صاحب کیا لیتے ہیں؟ انڈے، پراٹھے، سبزی سب بن جائے گا۔ اور حسب منشاء"

"رام چندر کہاں ہے ؟"

"کون رام چندر صاحب ؟"

"ریسٹ ہاؤس کا بوڑھا چوکیدار ۔"

"میں آپ کو بوڑھا دکھائی دیتا ہوں صاحب!"

"تم ــــ تم ــــ تو پھر ــــ وہ کون تھا ؟"

"وہ کون صاحب ؟"

"بوڑھا رام چندر اور اُس کی بیوی۔ بھیم سین کی بیٹی!"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں صاحب ؟۔ رام چندر ــ اُس کی بیوی ــــ بھیم سین ؟

اور وہ ــــ رام سنگھ ــــ نیگی صاحب !

نوجوان کا جواب سُنے بغیر ہم بھاگ کر پچھواڑے چوکیدار کے کمرے میں گھُس گئے چند ایک قرینے سے رکھے برتنوں کے سوا وہاں ایسا کچھ نہ تھا، جس سے اندازہ ہوتا کہ وہاں آگ جلی تھی اور کھانا پکا تھا۔

ہم پھر بھاگ کر اپنے کمرے میں لوٹے ۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ فائر پلیس میں رات بھر جلی آگ کا کوئی نشان ہے کہ نہیں ۔ وہاں ایسا کچھ نہ تھا۔ وہ جگہ اِتنی صاف تھی کہ گمان تک نہ ہوتا تھا کہ وہاں آگ کبھی جلی بھی تھی۔

"آتش دان کی طرف یوں گھُور گھُور کر کیا دیکھ رہے ہیں صاحب! یہ مصنوعی ہے۔ محض سجاوٹ ہے۔ بجلی ہوتی ہے تو ہم مہمان کے لیے ہیٹر لگا دیتے ہیں۔"

ہماری نظر یکایک ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کی جانب گھوم گئی ۔ وہاں ہم نے جو دیکھا وہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا نہ بعد ہی میں کبھی دیکھا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ شیشے میں جو عکس پڑ رہا ہے، وہ ہمارا نہیں ،نیگی صاحب کا ہے ۔ دھیرے دھیرے وہ عکس اُس تصویر میں بدل گیا جو ہم نے رات دیکھی تھی. دھندلائی ہوئی. پھر وہاں ایک بوڑھا اور اُس کے پیچھے رینگتی ہوئی ایک بڑھیا دکھائی دینے لگی ۔

ہمیں لگا کہ ہم ایک دم بوڑھے ہو گئے ہیں ۔ شیشے والا بوڑھا ۔ بیمار، لاغر، تھکا ہارا ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ ہم ایک دم پاس پڑی کرسی پر لُڑھک گئے ۔

نہ جانے ہم کب تک ویسے ہی پڑے رہے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا ساتھ والی کرسی پر بیٹھے مہتہ صاحب چائے بنا رہے ہیں۔ پیالا ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے "بجلی نہ ہونے کی وجہ سے آپ ڈسٹرب رہے۔ اِس کا مجھے افسوس ہے۔ اِس کمرے میں کمبخت ٹیبل لیمپ بھی تو نہیں ہے"

اور تب ہمیں احساس ہوا کہ وہاں ٹیبل لیمپ واقعی نہیں تھا۔

ایک کے بعد ایک چائے کے تین پیالے اور آٹھ دس سگریٹ پھونکنے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم، ہم ہی ہیں، زندہ ہیں اور سالم ہیں۔

پچھلی رات ریسٹ ہاؤس میں داخل ہونے سے تب تک کا سارا قصہ! اب ہم اپنے پر بیتی اِس واردات کو من گھڑت بھی کیسے کہتے۔ مناسب یہی تھا کہ چپ رہتے۔

کہانی سنتے سنتے چاروں فوجی افسر گویا بے جان مورتیاں بن گئے تھے۔

اِس سے پہلے کہ کوئی زبان کھولتا کہ دروازہ کھول کر ڈسٹرکٹ فارسٹ آفیسر گوبند نرائن مہتہ تشریف لے آئے۔

"مجھے کچھ دیر تو ضرور ہو گئی ہے سر۔ مگر میں نے اطمینان کر لیا ہے کہ آپ لوگوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ لہٰذا (وہ مُسکرائے) میں وقت پر آیا ہوں"

کمشنر صاحب مُسکرائے "تم ہمیشہ وقت پر آتے ہو، ہم اپنے اِن دوستوں کو اُس رات والی کہانی سنا رہے تھے"

مہتہ صاحب بولے "میں نے پتہ لگا لیا ہے سر۔ رام سنگھ نیگی نام کا ڈی۔ ایف۔ او۔ منڈی کے علاقے میں دس سال پہلے تعینات تھا۔ اس نے چینی ویلی کی ایک حسینہ کے عشق میں خودکشی کر لی تھی۔ بالکل ویسی ہی کہانی رام چندر کی ہے۔ جو رام پور کے راجہ کے گھریلو خدمت گار کی جوان بیٹی کو بھگا کر لے گیا تھا اور کبھی پکڑا نہیں گیا"

نوجوان لیفٹننٹ حبیب جو ظاہر تھا کہ کمشنر صاحب کی کہانی سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا یکایک چلا پڑا ——— "اور وہ تصویر"

کمشنر صاحب مسکرائے "وہاں کوئی تصویر نہ تھی، جو تصویر ہمیں نیگی صاحب نے دکھائی تھی وہ غالباً انا پورنا دیوی کی تھی۔ ہم نے نیگی صاحب کی لاش کی تصویر بھی پولیس ریکارڈ میں دیکھی ہے۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ دونوں روپ ایک ہی آدمی کے تھے"

موت کے بعد آدمی کے خدو خال بدل جاتے ہیں۔ اُن کی لاش تو جانے کتنے گھنٹے پانی میں پڑی رہی تھی اور تصویر اُتارتے وقت ایک دم نیلی پڑ گئی تھی۔"

"ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ کمشنر صاحب کرنل کمار کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔" اس کی تصدیق آپ کا سیکٹر کمانڈر کر سکتا ہے۔"

نیگی صاحب یا ان کی بھٹکتی آتما سے ہماری مختصر سی ملاقات ۳۱ دسمبر کی رات کو ہوئی تھی۔ اس ریسٹ ہاؤس سے تین میل کی دوری پر ایک ری ٹینگ وال اس دن کی بارش کے کارن گر گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر اُس رات ہم اپنا سفر جاری رکھتے تو آج آپ کے سامنے یہ کہانی نہ سنا رہے ہوتے۔

عاشقوں کی آتمائیں بڑی مہربان ہوتی ہیں صاحب!"

دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ نو وارد رام لال تھا۔

یہ ریسٹ ہاؤس آسیب زدہ ہے صاحب کھانا بنا تھا تو میں نے خود چکھ کر اطمینان کر لیا تھا کہ صاحب لوگوں کے حسب منشا ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب کو چکھایا تو اُنہوں نے یہ کہہ کر تھوک دیا کہ سالن نمک کی زیادتی کی وجہ سے زہر ہو رہا ہے۔ میں نے پھر دیکھا۔ سالن میں نمک واقعی بہت زیادہ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا صاحب۔

سب نے باہر کی طرف دیکھا۔ لوگ ڈاکٹر کو گھیرے کھڑے ہیں اور وہ کُلّی پر کُلّی کیے جا رہا ہے۔

یہ بھیم سین کی بیٹی کی شرارت ہے۔ کمشنر صاحب نے سالن پلیٹ میں ڈلوا کر چکھا۔

ایک دم اے ون تھا۔ جانے کہاں سے ایک بھولی بھٹکی آواز ان کے کانوں میں گونج گئی۔" دیسی گھی میں بنا ہے نا صاحب! مسالے بھی ہوتے تو آپ مدتوں ذائقہ نہ بھولتے۔"

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ یہ کھانا تو ایک دم بڑھیا ہے۔ میجر سُندرم نے بھی ایک لقمہ مونہہ میں ڈالا ——— اے ون، اے ون!"

ڈاکٹر صاحب نے کھانا دوبارہ چکھا۔ ذائقہ ان کی آنکھوں میں ناچنے لگا۔

جادو، وہ جو سر چڑھ کر بولے۔

کھانے کے بعد مہتہ صاحب نے اپنے باورچی کو بلایا۔

"کیوں باد رام سنگھ جی، ایسا کون سا مسالہ ڈالا ہے آپ نے جو سارے سالن

اس قدر لذیذ بنے ہیں۔"

"یہ دیسی گھی کا کمال ہے صاحب جی ۔ میں نے کوئی خاص مسالہ نہیں ڈالا ۔ سوائے انا پورنا دیوی کے مندر کی بھبھوتی کے ۔ ہمیں جب بھی خاص خاص مہمانوں کا کھانا بنانے کے لیے بُلوایا جاتا ہے، ہم احتیاطاً مندر سے تھوڑی سی بھبھوتی ساتھ لے کر آتے ہیں ۔ کھانا تیار ہو جائے تو اُتارنے سے پہلے اُس میں تھوڑی بھبھوتی بطور خوشبو ڈال دیتے ہیں، کھانا مہک اٹھتا ہے ۔

ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب اور رام لال جی نے جو کھایا وہ بھبھوتی سے پہلے کا کھانا تھا ۔ آپ سب نے جو کھایا وہ دیوی کا پرساد تھا۔"

آگ اور آگ کے دن

اُٹھالا ہو چکا تھا۔ دُور دراز سے آئے ہوئے چھوٹے بڑے سب رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ ایک دو روز بعد جب اس کے ماں باپ بھی چلے جائیں گے تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ساتھ اکیلی رہ جائے گی۔

جس عورت کے ایک دو چھوڑ پورے چھ بچّے ہوں، وہ اکیلی کیسے کہی جا سکتی ہے مگر وہ اکیلی ہی تھی۔ تینوں بڑے بچّے اُس کے مرحوم شوہر کی پہلی یعنی اُس کی سوتن کی اولاد تھے، جو بے چاری کب کی مر چکی تھی۔

جو اُس کے لئے کبھی تھی ہی نہیں۔ اُسے سوتن کہہ کر یاد کرنا غالباً واجب نہیں، مگر سوتن؛ سوتن ہی ہوتی ہے۔ وہ زندہ ہو یا مُردہ۔ ایسی کون عورت ہے اس یُگ میں جو پتی کی پہلی بیوی کی بے ماں اولاد کو اپنی اولاد سمجھے اس نے بھی ان بچوں کو اپنی اولاد کبھی نہیں مانا۔ نہ شادی کے پہلے دن، جب اسے ان بچّوں سے ملوایا گیا تھا نہ اپنی ازدواجی زندگی کے دس برسوں میں کبھی۔

رانا صاحب جب زندہ تھے تو وہ سب سے بڑے رانا صاحب یعنی اس کے سسُر جی کی کوٹھی میں مل کر رہتے تھے۔ رانا صاحب اس سے عمر میں کم از کم بیس سال بڑے تھے۔ مگر چونکہ وہ رانا صاحب تھے۔

خاندانی رئیس اور حکومت کے ایک بڑے عہدہ دار۔ لہٰذا اس فرق پر سوائے اس کے کسی نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ دیکھنے میں وہ اپنی عمر سے کئی سال کم دکھائی دیتے تھے۔ جب کہ پورنیما اپنی غیر معمولی تندرستی اور قد و قامت کی وجہ سے اپنی اصلی عمر سے کافی بڑی لگتی تھی۔ لہٰذا دونوں کی عمر میں خاصا فرق ہوتے ہوئے بھی دوسرے دیکھنے والوں کو کوئی ایسا غیر معمولی نہ لگتا تھا۔

شادی کی پہلی رات ہی رانا صاحب نے پورنیما کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ بھرپور مرد ہیں اور جب اس نے بچوں کی بات اٹھائی تھی تو انہوں نے مسکرا کر کہا تھا کہ وہ سچے راجپوت ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ وہ تب تک ضرور زندہ رہیں گے جب تک اسے بھی ایسی ہی تین بچوں کی ماں نہ بنا دیں گے۔

کوٹھی کی غیر معمولی شان و شوکت۔ بڑے رانا اور رانی صاحبہ کی پدرانہ شفقت اور خود رانا صاحب کی غیر معمولی شخصیت سے پورنیما اتنی متاثر تھی کہ اس نے پھر کبھی اپنی کم عمری اور اپنے شوہر کی ادھیڑ عمری کا سوال نہیں اٹھایا۔ عقلمندی اسی میں تھی کہ وہ وِدھی کے وِدھان کو دل و جان سے مان کر ایک شریف عورت اور بڑے گھر کی سگھڑ بہو کی طرح اس گھر کی مان مریادہ کے مطابق ہی اپنے آپ کو ڈھال کر چلے۔ مگر زندگی تو کم بخت ایک شیشہ ہے جس میں کبھی کوئی بال آ جائے تو کبھی نہیں مٹتا۔ ہمیشہ اسی طرح بنا رہتا ہے۔ پہلا بال تو اندرا کی پیدائش تھی۔ اس کی یہ پہلی اولاد لڑکی تھی جب کہ اس کی سوتن کی پہلی اولاد لڑکا تھی۔ رنجیت، رانا رنجیت سنگھ بہادر جو بارہ سال کی عمر میں ہی گھوڑے کی سواری کرنا سیکھ گیا تھا۔ اور اب ماشاء اللہ ایک عمدہ اور منجھا ہوا گھڑ سوار تھا۔

جب چار سال بعد ایک ساتھ منوج اور دلیپ پیدا ہوئے تو شیشے میں آیا ہوا بال کچھ کم گھناؤنا لگنے لگا۔ یہ جڑواں بچے عام جڑواں بچوں کی طرح شکل و صورت میں ایک جیسے تھے۔ رانا صاحب نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ شادی کے چھ سالوں میں جب کہ رانا صاحب کی پہلی بیوی نے تین بچے چار چار سال کے وقفے کے بعد یعنی پورے دس برسوں میں جنے تھے۔ اب پہلی سے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی تو پورنیما نے بھی رانا پریوار کو ایک لڑکی اور دو لڑکے پیش کر دئے تھے۔ یہ جڑواں بچے دیکھنے میں تو اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح گورے چٹے اور توانا تھے، مگر شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل انوکھے تھے۔ ان کے خد و خال رانا پریوار کے کسی فرد سے نہ ملتے تھے۔

اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ رانا صاحب کی صحت آہستہ آہستہ گرنے لگی ۔ بیمار جمائی کو دیکھنے آئی تھی پورنیما کی ماں ۔ مگر اپنے چند روزہ قیام میں ہی شیشے میں اور درجنوں بال ڈال گئی ۔

گھر کا زیور ـــــ رانا صاحب کی ماں کا۔ اُن کی مرحومہ بیوی کا اور خود پورنیما کے اپنے زیورات حفاظت کی غرض سے مقامی بینک کے لاکر میں رکھے رہتے تھے، جس کی چابی رانا صاحب کے پاس رہتی تھی یا پورنیما کے پاس ۔ بڑے گھر کے زیور سب کچھ نہیں ہوتے، مگر خاصے کی چیز ہوتے ہیں ۔ سونا تو تھا ہی ساتھ میں ہیرے موتی اور جواہرات بھی تھے ۔

گھوڑوں کی سواری راجپوتوں کا خاندانی شوق ہوتا ہے ۔ گھوڑوں سے لگاؤ کے ساتھ رانا صاحب کو گھڑ دوڑ کا بھی چسکا تھا، جو ہوتے ہوتے ان کی زندگی کا سب سے بڑا ولولہ بن گیا تھا ۔ ریس میں کبھی جیت ہوتی ہے تو کبھی ہار ۔ پچھلے ایک دو سال سے ہار کا پلڑا نسبتاً بھاری ہوتا جا رہا تھا ۔ لوگوں کا اور ان کے ماں باپ کا بھی خیال تھا کہ ان کی علالت کی وجہ یہ کم بخت ریس ہی ہے ۔

جس دن دل کے دورے سے ان کی موت ہوئی اس سے ایک دن پہلے انہوں نے منوج اور دلیپ کی تیسری سال گرہ بڑی دھوم دھام سے منائی تھی ۔ دوسرے دن ریس میں محض ایک ہزار روپے کی رقم گنوا دینے ہی سے وہ مٹی ہو گئے ۔ لاکھوں کے مالک رانا بہادر کے لئے ایک ہزار روپے کی حقیر رقم اتنی گہری چوٹ ثابت ہو سکتی ہے، ایسا کوئی بھی نہ سوچ سکتا تھا ۔ مگر راز جلد ہی فاش ہو گیا ۔ بینک میں صرف دس ہزار روپے کی رقم بچی تھی ۔ اور لاکر میں وہی زیورات بچے تھے جنہیں آسانی سے فروخت نہ کیا جا سکتا تھا ۔

ماں باپ نے اسے میکے چلنے کے لئے کہا ۔ مگر اس نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا ۔ لاکر سے زیورات نکال لینے کا مشورہ اُسے اُس کی ماں نے ہی دیا تھا، مگر اس نے اپنی ماں کو بھی نہ بتایا کہ اس نے زیورات سنبھال لیئے ہیں ۔ ساس سسر نے ودھوا بہو کو سراہا ۔ ہر کسی نے اس کی تعریف کی ۔ وہ ان کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی بلکہ ان کے بڑھاپے کا سہارا بن کر رہنا چاہتی ہے ۔ جس نے سُنا سراہا ۔ بڑے گھر کی بہو بیٹیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے ۔

رانا صاحب کے ماتحت پریم جی جو اُن کے اچھے خاصے دوست بھی تھے ۔ ان کے

گھر اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ رانا صاحب کی زندگی چونکہ خاصی مصروف تھی وہ پورنیما کو اکثر پریم جی کے ساتھ سینما وغیرہ بھیج دیا کرتے تھے۔ پریم جی بھی ایک وفادار دوست کی طرح ان کا ہر حکم بجا لاتے۔ رانا صاحب کی وفات کے بعد پریم جی نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے پورنیما کو اپنے دفتر میں ایک معقول ملازمت دلا دی۔ نوکری دلانے میں پریم جی کے علاوہ بڑے رانا صاحب کا بھی ہاتھ تھا۔ کبھی خود بھی وہ اس دفتر کے بڑے عہدہ دار رہ چکے تھے۔ نوکری نے پورنیما کی بیوگی کا غم ہی ہلکا نہ کیا تھا بلکہ اسے ایک قطعی نئی قسم کی شخصیت بھی عطا کر دی تھی۔ یہ نئی شخصیت جو ظاہر ہے کہ خود برداری اور خود پروری یعنی بغیر کسی کی مدد اور سہارے کے اپنی بسر اوقات کر سکنے کے اطمینان سے پیدا ہوئی تھی۔ اچھی بھلی پورنیما کو چند ہی مہینوں میں ایسی خود غرض، مغرور، بد دماغ اور خود پرست بنا دیا کہ اس کے شوہر کے والدین اور پہلی بیوی کی اولاد کا اعتماد اس کی ذات سے قطعی اٹھ گیا اور انھوں نے یہی غنیمت سمجھا کہ شہر کی جائیداد کا بٹوارہ کر دیا جائے۔ اس کے سُسر کے لئے، جو ایک شریف آدمی تھا بہُو کا یہ باغیانہ روّیہ ناقابل برداشت تھا۔ بہُو کو خود کفیل بنانے کے لئے وہ اب اپنے آپ کو کوسنے لگے۔ اس بڑے شہر میں جہاں سینکڑوں لوگ ان کو جانتے پہچانتے تھے، اپنے بیٹے کی بہو کو الگ کر دینا ان کے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ نتیجتاً انہوں نے کوٹھی بیچ دی۔ اور بیٹے کی پہلی اولاد کو لے کر اپنے آبائی گاؤں منتقل ہو گئے۔ مکان اُن کی اپنی کمائی کا تھا۔ پھر بھی اُنھوں نے اِسے فروخت کرنے سے جو رقم ملی تھی، اُس کا ایک معقول حصہ پورنیما کی اولاد کے نام بینک میں جمع کرا دیا تھا تاکہ بچّے جب بڑے ہوں تو ان کی تعلیم اور شادی بیاہ پر انہیں اچھی خاصی مدد مل جائے۔

رنجیت اور اس کا چھوٹا بھائی منجیت چند ہی برسوں میں یکے بعد دیگرے فوجی افسر بن گئے اور بڑی بیٹی سوشیلا کا بیاہ بھی ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں ہو گیا۔

پورنیما نے اپنی سسرال کو ایسے فراموش کر دیا جیسے وہ تھے ہی نہیں۔ لوگ حیران تھے کہ بیوہ ہوتے ہوئے بھی نہ اس نے ماتھے کی بندیا اتاری اور نہ منگل سُوتر۔ بس مانگ میں سیندور بھرنا بند کر دیا۔ کیونکہ اس طرح اپنے بالوں کی خوب صورتی بگاڑنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔

پریم جی جو رفتہ رفتہ سیڑھی در سیڑھی چڑھتے چڑھتے اب خود بھی ایک بڑے افسر

بن گئے تھے ۔ رانا پریوار سے پرانی دوستی نبھائے جا رہے تھے ۔ انہوں نے پورنیما کو اپنے یونٹ میں لے لیا تھا۔ پورنیما ایک گھنٹہ دیر سے دفتر جاتی اور دو گھنٹہ پہلے گھر لوٹ آتی ۔ اس کے ذمہ دفتر میں کوئی قابل ذکر کام نہ تھا۔ پریم جی کو جب بھی فرصت ملتی چلے آتے ۔ جب تک من ہوتا ٹھہرتے ۔ وہ بچوں سے ایسے گھل مل گئے تھے جیسے وہ ان کے حقیقی چچا ہوں۔ دفتر میں اور سرکاری ملازمین کی اس کالونی میں جہاں پورنیما کو سرکار کی طرف سے رعایتاً کوارٹر مل گیا تھا، ہر قسم کے چرچے ہوتے ۔ مگر وہ اس قسم کی چرچا سے بے نیاز اپنے ڈھنگ سے اپنی خوشی کے لیے جی رہی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن سینما جاتی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ ہو، کوئی اچھا کلچرل پروگرام ہو، وہ ضرور دیکھتی ۔ اکثر پریم جی کے ساتھ ۔ کبھی کبھار اکیلی یا اپنی ہی کسی ایسی پڑوسن یا دفتر کی ساتھن کے ساتھ۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی ۔ ڈھیروں سونا تھا۔ خاصی رقم بینک میں بھی جمع تھی اوپر سے معقول ماہانہ تنخواہ اور پریم جی کی سرپرستی ۔

پریم جی کی بیوی کو بریسٹ کینسر تھا۔ اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ کینسر کی مریضہ کب تک جیتی ہے ۔ اب پورنیما کو بس اسی کا انتظار تھا۔ لیکن یہ عورت جانے کس مٹی کی تھی کہ دو آپریشن ہو جانے کے باوجود مرنے کا نام نہ لیتی تھی ۔ پورنیما جانتی تھی کہ زندگی کی سانسیں اوپر والا گنتا ہے اور موت کا دن بھی وہی طے کرتا ہے ۔ مگر وہ پریم جی کی ہو کر رہنے کے لئے اتنی بے قرار تھی کہ اکثر ان سے جھگڑا کر بیٹھتی ۔

”جب تک تیری بیٹی کا بیاہ نہیں ہو جاتا ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ کھلم کھلا میاں بیوی بن کر رہنا کسی صورت مناسب نہیں ۔ لاکھ اڑچنیں کھڑی ہو سکتی ہیں ۔ ہمارے لئے اسی طرح شرافت کا بھرم بنائے رکھنا ضروری ہے ۔“ پریم جی اُسے اکثر سمجھاتے ۔ وہ بڑے محتاط اور سمجھدار قسم کے صلاح کار تھے ۔

دونوں اڑچنیں برابر بنی ہوئی تھیں ۔ لڑکی ابھی معصوم بچی تھی اور پریم جی کی بیوی ضرورت سے زیادہ سخت جان ۔

ان کا یہ رشتہ کوئی ایسا خفیہ نہ تھا مگر پریم جی کی نیک نامی کی ساکھ اور شہرت اور سماج میں ان کا ایک معزز مقام ایسے پردے تھے ۔ جن کی آڑ میں سب کچھ چھپا رہتا تھا۔ اکثر لوگ پورنیما سے ان کے غیر معمولی لگاؤ کو ان کی خاندانی شرافت اور ایک پرانے مہربان

دوست کی بیوہ کے لئے ہمدردی سمجھتے تھے۔ جو اصلیت سے واقف تھے وہ بھی چپ رہتے پریم جی بے حد محتاط قسم کے آدمی تھے۔ پورنیما بھی ان ہی کی طرح پردے کے پیچھے رہنے کا ہنر جانتی تو لوگوں کو دونوں کے اصلی رشتہ کے بارے میں ذرا بھی شک نہ ہوتا۔ مگر پورنیما نا سمجھ تھی۔ طبعاً شیخی خور تھی اور پریم جی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس نے ماتھے کی بندیا اور منگل سوتر نہ اتارا تھا۔

"میں اپنے آپ کو بیوہ نہیں سمجھتی۔ رانا میرے والد کے برابر تھے۔ میں نے انھیں کبھی شوہر نہیں مانا۔ کم از کم تم سے ملنے کے بعد نہیں۔ میرے لئے تم ہی سب کچھ تھے، ہو اور رہو گے۔ رانا کو ہمارے تعلقات کا علم تھا، مگر وہ اپنی راجپوتی آن بان کی وجہ سے اس حقیقت سے جان بوجھ کر منکر بنے رہے۔ یہ فریب ان کے لئے ضروری تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو قتل کرنے کے بجائے وہ خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ گئے۔"

"تم سمجھتی ہو انہوں نے خود کشی کی تھی؟"

"سمجھتی نہیں، میں جانتی ہوں کہ انہوں نے خود کشی کی تھی۔"

"تم مغالطے میں ہو۔ وہ ایک کامیاب آدمی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے لئے تمہیں اپنے راستے سے ہٹا دینا ذرا بھی مشکل نہ تھا۔"

"تم بھولتے ہو کہ وہ ایک شفیق باپ بھی تھے اور جانتے تھے کہ کم از کم اِندرا ان کی اپنی بیٹی ہے۔"

"اور تمہارے یہ جڑواں شہزادے؟"

"کوئی اندھا بھی ایک نظر دیکھ کر بتا دے گا کہ تم ہی ان کے باپ ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنے لئے موت کی سزا خود طے کی تھی۔"

"وہ ایک ذہین، خود شناس اور خوددار آدمی تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس دوسرا راستہ بھی کہاں تھا۔ وہ دل کے مریض تو تھے ہی۔ مجھ ایسی عورت کو اپنے راستے سے ہٹانے کی بجائے، خود میرے راستے سے ہٹ جانا انہوں نے زیادہ مناسب سمجھا۔ میں کیسی سہی، کتنی بُری سہی، مگر میں ان کی چہیتی بیٹی کی ماں تھی اور میری جان بخشی کے لئے یہ کافی تھا۔"

"تم بڑی ظالم عورت ہو پونم۔ خدا قسم کبھی کبھی تو مجھے بھی تم سے خوف آنے لگتا ہے"

میں نے تم سے محبت کی ہے۔ میں تمہارے ایک معمولی اشارے پر بھی مرنے کو تیار ہوں۔ کبھی آزما کر دیکھ لینا۔

اندرا بڑی سمجھ دار بچی تھی۔ کچھ بچے اپنی عمر سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ ہاتھوں اور پاؤں پر آلتا پوچنا ناخنوں کو ہمیشہ سرخ بنائے رکھنا اور رنگ برنگے کپڑے پہننا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اسے پریم انکل سے بھی بے حد نفرت تھی، مگر وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ جب گھر میں آتے وہ خود پڑوس میں کسی نہ کسی سہیلی کے گھر چلی جاتی۔

پریم جی اس کی سال گرہ بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے۔ اسے نئے نئے کپڑے لاکر دیتے۔ ہر سال گرہ پر پچھلے کی نسبت بڑا کیک بنوا کر لاتے۔ مگر اس کے رویے میں کبھی کوئی فرق نہ آتا۔ وہ انہیں اپنے مرحوم باپ کا قاتل سمجھتی تھی، جسے اگر اس کا بس چلتا تو زندہ زمین میں گاڑ دیتی۔ مگر وہ ایک چھوٹی سی معصوم بچی تھی۔ اس کی سہیلی کے باپ کی ترقی ہوئی تو وہ لوگ اس کالونی کو چھوڑ کر ایک دوسری کالونی کے نسبتاً بڑے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ اسے اپنی یہ سہیلی بڑی عزیز تھی۔ اسے وہ اپنے گھر کی ہر بات بتا دیتی تھی۔

"کہاں تمہارے ماں باپ ہیں رانو اور کہاں میری یہ نرلج ماں۔ بھگوان قسم رانو، مجھے تو اس کلٹا کو ماں کہتے ہوئے بھی لجّا آتی ہے۔"

پریم جی کی بیوی اسپتال میں تھی۔ یہ اس کا آخری میجر آپریشن تھا۔ بے چاری بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ہسپتال چونکہ پورنیما کے کوارٹر کے قریب تھا لہٰذا پریم جی اب اکثر وہیں رہ جاتے تھے۔ انہیں دنوں اس کی سہیلی کا بیاہ آ گیا۔ ایک ہی بار کہنے پر کہ وہ اپنی سہیلی کے گھر مہینہ بھر رہنا چاہتی ہے، اسے اجازت مل گئی۔ سہیلی کے ماں باپ اور بھائی بہن حیران تھے کہ اس پورے مہینے میں کبھی ایک بار بھی اس کی ماں نے آکر اس کی خبر نہ لی تھی۔ ایک دن اسے خبر ملی تھی کہ پریم جی اس مابین پورے طور پر پورنیما کے گھر آ جمے تھے۔ ہسپتال کے قریب ہونے کا بہانہ کافی تھا۔ وہ ہر روز دو بار ہسپتال جاتے۔ کبھی کبھی پورنیما بھی ان کے ساتھ مسز پریم جی کی مزاج پرسی کے لیے چلی جاتی ایسے موقعوں پر وہ نہایت سادہ لباس میں ملبوس ہوتی۔ نہ کبھی میک اپ کرتی نہ

بندیا لگاتی، جو اُسے بے حد عزیز تھی۔ مرتی ہوئی اس عورت کا دم دیکھنے والا ہوتا۔ وہ پورنیما اور اپنے شوہر کے تعلقات سے بے خبر نہ تھی۔ مگر مجال ہے جو اس نے کبھی بھولے سے بھی یہ ظاہر ہونے دیا ہو۔ عورت کے لئے یہ شرم کی بات ہوتی ہے۔ مگر وہ چپ چاپ سب سہے جاتی تھی۔ اسے اب صرف اپنی موت کا انتظار تھا۔

اس کا آپریشن ہوا۔ کینسر کی مریضہ کب بچتی ہے۔ جو وہ بچتی۔ آپریشن والے دن وہ دن بھر شوہر سے باتیں کرتی رہی۔ یہ شکتی کہاں سے آگئی تھی اس میں وہ نہ جانتی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے شوہر سے نہ جانے کیا کیا کہا کہ اس کے بعد پریم جی نے پورنیما کے ہاں آنا جانا بالکل بند کر دیا۔ وہ دفتر میں بھی اس سے بات نہ کرتے۔ پھر ایک دن پورنیما نے بیماری کا بہانہ کر کے چھٹی لے لی۔ گھر بیٹھ گئی۔ اسے یقین تھا کہ پریم جی اسے دیکھنے آئیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

چھٹی کے بعد وہ دفتر گئی تو پریم جی جا چکے تھے۔ گھر بار سب خالی کر کے۔ "مجھے ان کے جانے کا اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے سنے چلے گئے۔ کاٹھ کی ہانڈی کو ایک دن تو جلنا ہی تھا۔ میں ان سے پریم کرتی تھی۔ اور اس پریم پر میں نے اپنی سونے کی گرہستی نچھاور کر دی"، اپنی ہمراز سہیلی سے باتیں کرتی وہ سارا دن روتی رہی۔

چند ہی دنوں میں لوگوں نے دیکھا کہ اس کی زندگی کا رنگ ڈھنگ بالکل ہی بدل گیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ سادہ سفید لباس میں دفتر جاتی۔ وقت پر جاتی وقت پر آتی اور سارا دن جی لگا کر کام کرتی۔ بندیا لگانا یا ناخنوں پر نیل پالش تو ایک طرف اس نے لپ اسٹک کا استعمال بھی ایک دم ترک کر دیا تھا۔ پورے گھر کا ماحول بدل گیا۔ اس تبدیلی سے کوئی مطمئن تھا تو وہ تھی اندرا۔

کئی مہینوں کے بعد پونم کو پریم جی کا ایک خط ملا۔ لکھا تھا۔

پورنیما جی!

ایک قتل کا بوجھ آدمی کو عمر بھر بد حواس کئے رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے میرے سر پر تو دو خون ہیں۔ میں نے کبھی نہ سمجھا تھا کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ میں نے اس کی محبت کی بے قدری کی تھی اور وہ جو ایک

اچھی بھلی تندرست عورت تھی بیمار رہنے لگی اور پھر ایسی بیمار ہوئی کہ۔۔
تم ساری کہانی جانتی ہو۔

میں تمہارا بھی اتنا ہی قصوروار ہوں جتنا مرنے والی کا۔ وہ کیسے گھل گھل کر مری۔ غالبًا رانا صاحب بھی اسی طرح گھل گھل کر مرے تھے۔ مرنا تو سب کو ہی ہے تمہیں بھی مرنا ہے مجھے بھی مرنا ہے۔ مگر ایسا مرنا بھی کیا؟

ہم نے مل کر ایک شریف آدمی اور ایک شریف عورت کو مار ڈالا۔ ہم دونوں قاتل ہیں۔ یہ سچائی مجھ پر اس دن آشکار ہو گئی تھی، جس دن میری بیوی نے یہ دنیا چھوڑی۔ اس سے پہلے میں نے ایسا کیوں نہ سوچا۔ حقیقت میں، میں اندھا تھا۔ اندھا بھی اور بہرہ بھی!

میں نے تمہاری سونے کی گرہستی کو آگ میں جھونک دیا اور ایک ایسے آدمی سے بے وفائی کی جو مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا۔ مجھ پر پورا بھروسہ رکھتا تھا۔ جس کی مہربانیوں کا صلہ میں سات جنم نہیں لوٹا سکتا۔ میں آج جو کچھ ہوں رانا صاحب کی بدولت ہوں۔

ہاں پورنیما۔ میں اپنے آپ کو تمہارے شوہر اور اپنی بیوی کا قاتل سمجھتا ہوں۔ مجھ جیسے آدمی کے لئے مر جانا بھی کافی سزا نہیں۔ میں تل تل بوند بوند مرنا چاہتا ہوں تاکہ اس ناکارہ زندگی کے جتنے دن بھی باقی ہیں انہیں میں میرے گناہوں کا کفارہ ہو سکے۔ رانا صاحب بہت عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ میں ایک معمولی۔ بے عدادتی قسم کا بڑے ہی چھوٹے دل والا آدمی ہوں۔ ان کی طرح چپ چاپ جامِ شہادت پی جانا مجھ جیسے حقیر اور بزدل آدمی کے لئے ممکن بھی نہیں۔ لہٰذا میں نے ہر روز سو بار مرنے کی سزا چنی ہے اپنے لئے۔

تمہارے شوہر کے دونوں بیٹے آج کل ادھر یونا ہی میں قیام فرما ہیں۔ بڑا فوج میں میجر ہے۔ چھوٹا کپتان۔ فرشتہ ایسے دو دو بچوں کے باپ اور دیوی جیسی بیویوں کے شوہر ہیں۔ دونوں ادھر میرے

پڑوس میں رہتے ہیں۔ سچ مچ بڑے پیارے بچے ہیں، جیسے ایک بڑے آدمی کی اولاد ہوتی ہے۔

تمہارے شوہر کی بڑی بیٹی بھی اسی شہر میں آباد ہے۔ اس کا شوہر ایک رولنگ اسٹیل مل کا مالک ہے۔ راجہ آدمی ہے۔ بیٹی لاکھوں میں کھیلتی ہے۔

ان بچوں کے برعکس تمہارے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر میں اکثر بوکھلا جاتا ہوں۔ ماں کے گناہوں کا سایہ اولاد پر پڑنا لازمی ہے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو اور تمہارے بچے بھی ان بچوں کی طرح پھولیں پھلیں۔

تم مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ کبھی ادھر اپنے بچوں کے ہاں آنے کا پروگرام بناؤ تو مجھے اطلاع کر دینا تاکہ میں اپنا منحوس چہرہ لے کر کہیں روپوش ہو جاؤں۔ تم سے آنکھ ملانے کی سکت اب مجھ میں نہیں ہے۔

بہتر ہے کہ ہمیں جتنے دن اور دھرتی کا بوجھ بنے رہنا ہے ایسے ہی چلتے رہیں اور جب اپنے بنانے والے کے گھر جائیں تو اس تسلی کے ساتھ جائیں کہ اپنے گناہوں کا اقرار کر کے ہم اس کے رحم وکرم کے کچھ تو حق دار ہو ہی گئے ہیں۔

تم نے مجھے ہمیشہ یقین دلایا ہے کہ تمہارے جڑواں بچے میرے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو خدا ان کو بچائے۔ تم عورت ہو۔ ماں ہو۔ تم سچائی کو میری نسبت زیادہ جانتی ہو۔ تمہاری بات پر اعتبار کر کے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان دونوں بچوں کی پرورش کرنا میرا فرض ہے میں یہ فرض مرتے دم تک پورا کرتا رہوں گا۔ دس ہزار کا چیک بھیج رہا ہوں۔ اسی طرح جب ممکن ہو گا کچھ نہ کچھ بھیجتا رہوں گا۔ اپنے گناہ کے کفارے کے طور پر۔ اسے لوٹا کر مجھے مزید ذلیل نہ کرنا۔ یہ میری التجا ہے۔

تمہاری بیٹی اندرا اپنے باپ کی بیٹی ہے۔ اس کی نگاہوں میں،

میں نے نفرت کے شعلے لپکتے دیکھے ہیں۔ راجپوت کا خون ایسا ہی ہوتا ہے۔ ادھر تھا تو میں اس سے خوف کھاتا تھا۔ اب ادھر اتنی دور ہوں تو بھی اس کی نگاہوں کا بے بس غصہ یاد کر کے اکثر کانپ جاتا ہوں۔ وہ لڑکا ہوتی تو میرا خون کر دیتی۔ راناصاحب کی اس بیٹی کے لئے ان کا دیا ہوا تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔ ایشورا سے سکھی رکھے اور وہی تقدیر بھی دے جو اس کا حق ہے۔

تمہارے ساس سسر ابھی زندہ ہیں بہت بوڑھے ہو گئے ہیں بے چارے۔ تم مناسب سمجھو تو انہیں اپنے پاس لے آؤ یا خود ان کے پاس چلی جاؤ۔ میں جانتا ہوں تمہیں ملازمت کی ضرورت نہیں میں آسیب تھا، تمہاری اور تمہارے پیارے بچوں کی زندگیوں پر۔ مجھے تسلی ہے کہ میرے منحوس سائے سے وہ اب محفوظ ہیں۔

تمہارا گناہ گار:

پریم جی۔

اس شام اندرا اسکول سے لوٹی تو دیکھا کہ ماں نے رو رو کر اپنی صورت بگاڑ لی ہے۔ آج صبح ہی وہ مقامی بیوٹیشین سے سر کے بال اور چہرہ کی سٹنگ کروا کر لوٹی تھی، کتنے ہی دنوں بعد۔ آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کا کالا کجرا اور چہرے پر تپی کریم اور پاؤڈر کی تہوں میں عجیب و غریب دراڑیں ڈال دی تھیں جیسے پہاڑوں سے اچھلتی کودتی پانی کی دھارائیں نیچے میدانوں میں پہنچ کر ادھر اُدھر چھوٹی چھوٹی نالیوں میں بٹ جاتی ہیں۔

اندرا نے اس سے پہلے ماں کو کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ اس کے باپ کی موت پر بھی وہ خاصی روئی پیٹی تھی، مگر ایسے نہیں۔ آج بھی دیکھا تو اس کے دل میں رحم نام کا کوئی جذبہ نہ ابھرا۔ اس کی نفرت میں اضافہ ہی ہوا۔ کم از کم پچاس روپے خرچ کر کے اس ناہنجار نے شام کے کلچرل پروگرام میں شریک ہونے کے لئے اپنے چہرے کو بنایا سنوارا تھا۔ جو ظاہر ہے کہ سب کے سب برباد ہو گئے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے باپ کی یاد میں نہیں، اپنے ناپاک عاشق کی یاد میں آنسو

بہار ہی ہے۔ جو اندرا کی نگاہوں میں ایک نہایت نامناسب فعل تھا۔ وہ چپ چاپ دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ اور بغیر کچھ کھائے پیے کچھ ایسے ہی خیالات کے بوجھ سے دبی دبی سو گئی۔

گھنٹہ دو گھنٹہ بھر کی نیند کے بعد اس کی آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ گھر میں مکمّل سناٹا ہے نہ ریڈیو چل رہا ہے نہ ٹی وی۔ البتہ دوسرے کمرے سے دھیمی دھیمی سسکیوں کی آواز بدستور آ رہی تھی۔

کیا وجہ ہے یقیناً کوئی غیر معمولی حادثہ ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے پریم جی انکل کے مرنے کی خبر آئی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل بھر آیا، جو بھی ہو اس کی تصدیق اس کا دل بھی کرتا تھا کہ پریم انکل غیر معمولی آدمی تھے اور اس کی ماں سے بے حد پیار کرتے تھے۔

تھے ؟

یعنی کہ ؟

وہ دوڑی دوڑی ماں کے کمرے میں گئی اور اس سے لپٹ کر خود بھی رونے لگی۔ پورنیما جو ابھی تک ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ بیٹی کا پیار پا کر ایک دم پھوٹ پڑی۔ کسی نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ کچھ نہیں پوچھا۔ بس روتی رہیں، ایک دوسرے سے چمٹ کر۔ ایکا ایک اندرا نے بھی وہ لفافہ دیکھ لیا اور ایک ہی نظر میں بھانپ گئی کہ اس منحوس لفافے میں پریم انکل کی موت کی خبر تھی۔

تو کیا جسے وہ ناواجب تعلق سمجھتی تھی درحقیقت ایک سچی محبت تھی؟۔ نئے اور پرانے ساتھ کے درجنوں کتابیں پڑھ چکنے کے بعد وہ جان گئی تھی کہ آدمی کبھی کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی زندگی کے وہی رشتے سچے اور درست ہوتے ہیں جنہیں آدمی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قبول کر لیتا ہے۔

شادی بیاہ تو رسمی اور سماجی بندھن ہوتے ہیں۔ وہ رشتہ داری اور دوستی کا فرق بھی سمجھنے لگی تھی۔ اس کا باپ اس کی ماں کا رشتہ دار تھا دوست نہیں تھا۔

اسے اپنے مرحوم باپ سے بے انتہا محبت تھی۔ مگر وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ

انہوں نے اس کی ماں سے بیاہ کر کے اس پر ظلم کیا تھا۔ایک طرح سے انہوں نے اپنی دولت اور اپنے بڑے رتبہ کی بنا پر اس کی ماں کو خریدا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے نانا نانی اس کے دادا دادی کے سامنے سمدھیوں کی نہیں، حقیر فقیروں کی طرح اٹھتے بیٹھتے اور بات چیت کرتے تھے۔ یہ تمیزداری یا سلیقہ نہ تھا۔ سمدھیوں میں برابر کا رشتہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے مسکین برتاؤ کے پس پردہ غالباً کوئی ایسا جرم، کوئی ایسا گناہ تھا، جس کی نوعیت سے ناواقفیت کے باوجود وہ کسی طرح جان گئی تھی کہ یہ ایک طرح کا اعترافِ جرم تھا۔ اس کی ماں جو آج بھی ایک حسین وجمیل عورت تھی۔ شادی سے پہلے یعنی اپنے کنوارے پن میں یقیناً بے حد حسین رہی ہوگی۔ ایسی کہ جسے کوئی بھی شریف زادہ بیاہ لیتا۔ مگر اس کے ماں باپ نے اس کی شادی ایک ایسے آدمی سے کردی تھی، جو اس سے کم از کم بیس سال بڑا تھا اور تقریباً اتنے ہی سال شادی شدہ زندگی گزار چکا تھا۔ رنجیت اس کا بڑا بھائی اس کی ماں کی ہی عمر کا تھا۔ یقیناً اس کے نانا نے اس کی ماں کا سودا کیا تھا روپے لے کر لڑکی دینا بڑی گھٹیا حرکت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ اپنے داماد اور اس کے والدین کے سامنے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ غریب تھے تو کیا ہوا غریبی میں بھی آدمی کو اپنی عزت کا پاس ہوتا ہے بلکہ غریب کو تو اپنے وقار کا خاص دھیان رہتا ہے۔ وہ جب بھی اس کی ماں کو ملنے آتے تھے، ماں ان سے سیدھے موئہہ بات نہ کرتی تھی۔ وہ کسی طرح ایک دو دن رہ کر لوٹ جاتے تھے۔ اسے شک تھا کہ وہ اپنی بیٹی اور نواسے نواسی کو دیکھنے کی غرض سے نہیں کچھ نہ کچھ مانگنے کے لئے ہی آتے تھے اور بھک منگوں کی طرح جو ملتا لے کر لوٹ جاتے۔ ماں کو ان کی موجودگی بڑی کھلتی تھی۔ اس کے برعکس اس کے دادا دادی کی شخصیتوں میں بڑا وقار تھا۔ آج کل وہ بہت کم آتے تھے۔ مگر جب بھی آتے ڈھیر سی چیزیں لے کر آتے تھے۔ گھر کا گھی، گڑ، شکر، چاول، دالیں، اپنے کھیتوں کا اناج اور روپے پیسے بھی ان کو اپنی بیوہ بہو سے آج بھی پوری ہمدردی تھی۔ پوتوں اور پوتی پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس مہنگائی کے زمانے میں پانچ چھ سو روپے کچھ نہیں ہوتے۔ اتنی رقم میں تین بچوں کی پرورش، پڑھائی وغیرہ بہت مشکل ہے۔

کھیتوں سے ان کی آمدنی کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ دادا کی پینشن البتہ خاصی تھی۔ لہٰذا وہ جب آتے ہزار دو ہزار کی رقم ماں کو تھما جاتے۔ ماں خود ہی ان کے ساتھ رہنے کو تیار نہ تھی۔ ورنہ وہ کبھی اسے اکیلی نہ چھوڑتے۔

زمین آسمان کا فرق تھا اس کے دادا دادی اور نانا نانی میں۔ مگر اس کے دادا دادی نے بھول کر بھی کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی، جس سے ظاہر ہو وہ اس کے نانا نانی کا مناسب احترام نہیں کرتے۔

روتے روتے تھک کر جب اس کی ماں بالآخر سو گئی تو وہ خط اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بھائی، جو بڑے درجے کے لوفر تھے، ابھی تک گھر نہ لوٹے تھے۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں گئی وہ بھی حسب معمول شور مچاتے آدھمکے اس نے انگلی کے اشارہ سے انہیں چپ کرا دیا اور جو کچھ بھی گھر میں تھا، کھلا پلا کر سلا دیا۔ خط کا ذکر نہیں کیا۔ بس اتنا ہی بتایا کہ ماں کو تیز بخار ہے۔ اور بڑی مشکل سے کسی طرح سو پائی ہے۔ وہ ماں کے غصے سے واقف تھے۔ روز پٹتے تھے، مگر آوارگی سے باز نہ آتے تھے۔ ہر شام تبھی گھر لوٹتے جب محلہ کا کوئی لڑکا ان کے ساتھ کھیلنے کو تیار نہ ہوتا۔

بھائیوں کو سلا کر اور پوری طرح سے اطمینان کر کے کہ سب سو گئے ہیں، اس نے لفافہ کھولا اور خط پڑھا ـــــ ایک بار ـــــ دو بار ـــــ تین بار۔ کتنی ہی بار اس کی آنکھیں بھیگیں۔ مگر خط میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ بار بار پڑھے جانے کے باوجود تسلی نہ ہوتی تھی۔ آخر خط کا لفظ لفظ اس کے ذہن میں جم کر رہ گیا۔ حفظ ہو گیا۔ تو زندگی میں اپنی نئی سچوایشن اس کے سامنے ایک مکمل تصویر بن کر آشکار ہو گئی۔

اس نے سوچا کہ وہ خط کو وہیں چھوڑ آئے جہاں سے اٹھایا تھا تا کہ اس کی ماں کا بھرم کہ کسی نے اس خط کو دیکھا نہیں بنا رہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ ماں غالباً خود ہی چاہتی تھی کہ وہ یہ خط پڑھ لے۔ نہیں تو وہ اسے کہیں چھپا بھی سکتی تھی۔ آخر بہت دیر تک سوچتے سوچتے وہ خط کو اپنے سینے پر رکھے رکھے سو گئی۔

دوسرے دن جب ماں بیٹی کی آنکھیں ملیں تو وہ دو ہمراز سہیلیوں کی آنکھیں تھیں۔ اس نے ماں کو ایسے چمٹا لیا اپنی چھاتی سے گویا بیٹی نہ ہو، اپنی ماں کی

ماں ہو۔ ماتا کیا ہوتی ہے ؟ پیار کیا ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی جان کو اس کا پہلا تجربہ ہو رہا تھا۔ پورنیما کو بیٹی کا یہ انوکھا آلنگن بڑا اچھا لگا۔ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی وہ دیوار جو برسوں سے ماں بیٹی کے درمیان بنتی اور بلند ہوتی جارہی تھی، ایکا ایک نہ جانے کہاں پست ہوگئی۔

ماہ وسال سے چلے آرہے۔ زندگی کے بکھرے، بگڑے شب وروز دھیرے دھیرے بدلنے سدھرنے لگے۔ لڑکوں میں بھی خاصی تبدیلی آگئی۔ اب کی بار جب اس کے نانا نانی آئے تو ماں ان سے بے رخی سے نہ بولی۔ انہیں پوری عزت دی۔ مگر جب وہ لوٹنے لگے تو اس نے بیٹی کے سامنے انہیں دو ہزار کی رقم تھماتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا "میری التجا ہے کہ آپ پھر کبھی مجھے اپنے درشن نہ دیں۔ آپ کو اپنی بیٹی کے پورے دام مل چکے ہیں۔ اس رقم کو آخری قسط سمجھ کر اب آپ مجھے بھول جائیں۔ میری رگوں میں آپ کا خون تھا، اسی وجہ سے میں نے ایک بڑے گھر کی مریادا بھنگ کی۔ اب میں اپنے ہر اس قصور کو جس کی وجہ سے میری گرہستی اجڑی ہے، اپنے بھگوان کے سامنے رکھ کر پرائشچت کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ لوگوں سے کوئی گلہ نہیں، صرف اپنے بنانے والے سے شکایت ہے کہ اس نے مجھے آپ کے گھر میں پیدا کیا۔"

یہ بات اس نے اندرا کے سامنے کہی تھی۔ اندرا جس کے تیج پرتاپ کے سامنے ہر غلط حرکت کرنے والا خود بخود شرمسار ہو جاتا تھا، جھک جاتا تھا وہ لوگ بھی چپ چاپ اٹھے اور چلے گئے۔ کہاں گئے۔ کسی کو کچھ پتہ نہ چلا ۔ کیونکہ وہ اپنے گاؤں کبھی نہ لوٹے تھے۔

ہفتہ بھر بعد اس شام ماں دفتر سے لوٹی تو دیکھا کہ بیٹی اور دونوں بیٹے نہا دھو کر اور نئے کپڑے پہن کر تیار بیٹھے ہیں۔ ماں نے سوالیہ نگاہ اٹھائی تو اندرا نے مسکرا کر کہا "آج ہم سنیما دیکھنے چلیں گے۔"

"پورنیما نے مسکرا کر کہا "کس خوشی میں ؟"

"میں کلاس میں اول آئی ہوں۔ منوج اور دلیپ بھی پاس ہوگئے ہیں۔"

۵

پورنیما نے تینوں بچوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اُس کے آنسو اور مُسکراتا چہرہ دیوار پر ٹنگی رانا صاحب کی تصویر سے مخاطب تھا، جیسے کہہ رہا ہو۔ سب پھر سے ویسا ہی ہو گیا ہے جی۔ تم دیکھ رہے ہو نا۔

نخل دل اور برگ و بار

راج کشور کے ڈرائیور نے پرشانت کے بنگلے کے سامنے کار روکی اور باہر نکل کر پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ پرشانت کی گاڑی دروازے کے سامنے پہلے ہی سے کھڑی تھی۔ گاڑی سے اتر کر ارچنا نے ڈرائیور کو دس کا نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔

"لوٹتے ہوئے صاحب کے لئے فروٹ سالٹ کی شیشی لے جانا۔ آج انھوں نے جس قسم کے پکوان کھائے ہیں وہ انھیں رات بھر پریشان رکھیں گے۔ اینو کے دو گلاس پی لیں گے تو ہی سو سکیں گے۔"

ڈرائیور نے نوٹ جیب میں ڈال لیا اور سیلوٹ کر کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ رامو چائے لے کر حاضر ہو گیا۔ ٹرے میں چائے اور کھانے کی چند ایک اشیا کے علاوہ ایک بند لفافہ بھی تھا۔

آج صاحب بہت جلد آ گئے رامو کاکا؟

جی ہاں بی بی جی۔

آرام کر رہے ہیں؟

رامو کچھ جھجکا تو ارچنا نے پھر وہی سوال دہرایا۔

"آج وہ بہت پریشان ہیں۔ جب سے آئے ہیں بپھرے شیر کی طرح کمرہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر پر چکر لگائے جا رہے ہیں۔ غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ اور منھ سے۔۔۔

ارچنا نے فقرہ مکمل کیا۔ ہمیشہ کی طرح جھاگ نکل رہی ہے۔

پھر ٹرے میں پڑے لفافہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ یہ کیا انھوں نے بھیجا ہے"،

"جی ہاں بی بی جی"

"تم جاؤ کاکا۔ میں چائے خود بنا لوں گی"

ارچنا کے چہرے پر ڈر یا خوف ایسا کوئی جذبہ نہ ابھرا کہیں کچھ تھا تو بس رحم کا جذبہ تھا جو اسے اپنے شوہر کی بیچارگی پر محسوس ہو رہا تھا۔ کتنا بے بس ہو جاتا ہے پرشانت کبھی کبھی مرد ہو کر بھی غصہ کا اظہار کرنا نہیں جانتا۔ بیچارہ۔

وہ چپ چاپ بیٹھی چائے پیتی رہی اور خط پڑھتی رہی۔

ارچنا۔

ہماری زندگی کی دھارائیں رسماً متوازی ہوتی ہوئی بھی الگ الگ سمتوں میں بہہ رہی ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی۔ بہت حیلے بہانے تلاش کیے اسی طرح خانماں برباد چلے چلنے کے مگر کوئی تجویز، کوئی تدبیر، کوئی معقول راستہ نہیں سوجھ رہا جو مجھے اس تباہی اور بربادی سے کسی طرح بچ نکلنے کی ترکیب سجھا سکے۔

میرے پاس کیا نہیں ہے۔ بے شمار دھن دولت ہے۔ اچھی خاصی پُرکھوں کی جائیداد ہے، خاصی اچھی پریکٹس ہے۔ باپ دادا کا بڑا نام ہے۔ سماج میں قدر و منزلت ہے ہمارے اونچے خاندان کی مگر تجھے ان میں سے کسی بھی شئے نے کبھی مرعوب نہیں کیا۔ میرے پیار نے بھی نہیں۔ اگر تیرا اُس سے اتنا لگاؤ تھا تو تو نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی۔ کس جنم کا بیر تھا تجھے مجھ سے۔ میرے خاندان کے نام و ناموس سے۔ اور محبت بھی تو نے کی تو کہاں ایک بدقماش لچے اور بیمار ذہن شرابی سے! کسی بھلے آدمی کو مجھ پر ترجیح دی ہوتی تو نے تو مجھے وہ ذہنی کوفت نہ ہوتی جو آج ہو رہی ہے۔ سارا شہر میری ہنسی اڑا رہا ہے اور میں شرم سے مرا جا رہا ہوں۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ میں تیری خوشی

کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوں ۔۔۔ طلاق کے لیے بھی۔

پرشانت

پرشانت نے اس قسم کا زہر پہلی بار نہ اگلا تھا۔ البتہ تحریری طور پر اپنے اختلافات کا اظہار پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ ارچنا بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی آخر اس نے بھی لکھنا شروع کیا۔

"پرشانت ـــــ یہ ضروری تو نہیں کہ جس سے شادی ہو محبت بھی اسی سے ہو۔ تم نے اپنے اور اپنے خاندان کے جھوٹے وقار کے علاوہ کبھی کسی چیز، کسی جذبہ کی کبھی قدر کی ہوتی تو سمجھ جاتے کہ محبت کیا شے ہے، میرے جسم سے اپنی ہوس کی پیاس بجھانے کو تم پیار کہتے ہو اور میرے محبوب کو جس نے غالباً پرائی امانت سمجھ کر مجھے کبھی بھولے سے بھی چھوا تک نہیں بدقماش شرابی کہتے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم محبت کے معنی سرے سے ہی نہیں سمجھے میں تم سے متفق ہوں کہ ہمارا تمہارا یوں اس طرح مزید چلے چلنا اب ممکن نہیں ہے ـــــ تمہیں میری ضرورت نہیں مگر اسے ہے۔ میں آج رات ہی تمہارے سونے کے پنجرے اور تمہارے خاندان کے نام و ناموس کو تلانجلی دے رہی ہوں۔ اب آئندہ تمہیں اپنی منحوس صورت کبھی نہ دکھاؤں گی ـــــ تمہارے گھر میں میرا یہ آخری دن ہے۔ ممکن ہوا تو ہم تمہارا یہ شہر بھی چھوڑ دیں گے ـــــ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

راجی تم سے طلاق لینے کو تیار نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس کی ضرورت نہ ہو گی گڈ بائی پرشانت ـــــ

ارچنا۔

دن بیت گیا۔ رات بھی آئی اور گذر گئی ـــــ اپنے کمرے میں پرشانت سارا دن اور ساری رات ارچنا کے بارے میں سوچتا رہا۔ جانے سے پہلے اس نے رسمی طور پر بھی اس سے ملنا گوارہ نہ کیا۔ تو نے اچھا ہی کیا ارچنا ـــــ گڈ بائی

ہم واقعی ہی ایک دوسرے کے لئے نہ بنے تھے۔ مگر یہ کیا لکھا ہے ارچنا نے! راجی نے اسے کبھی چھوا تک نہ تھا ـــــ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ـــــ اس خیال کا ذہن میں ابھرنا تھا کہ اس کا خون اور خواہش اپنی بیوی کے حسین و جمیل پیکر کے لئے سمندر کی بے چین لہروں کی طرح بے قرار ہو اٹھے، اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہی تو لکھا ہے ارچنا نے ـــــ میری محبت میرا پیار ہوس ہی تو ہے
کیا میں واقعی ہوس کا کیڑا ہوں ـــــ اپنی بیوی کے بدن کے لئے میری ہوس جائز
ہے۔ میرا حق ہے ـــــ میں اس کا شوہر ہوں ـــــ ہوں کہ نہیں۔ تو پھر ـــــ اگر
میرا پیار محض ہوس ہے۔ تو یہ اس کے جسم تک ہی کیوں محدود نہیں رہا ـــــ اس کا جسم
تو مجھے ہمیشہ ہی میسر تھا۔ وہ اسے میرا حق اور اپنا فرض سمجھتی تھی۔ جبھی تو کسی دوسرے
کی محبت کا دم بھرتی ہوئی بھی ہمارے رشتہ سے کبھی منکر نہیں ہوئی ـــــ شریف زادی
ـــــ مگر محبت اور شرافت میں فرق ہوتا ہے میاں۔

تمہیں خاندان کی رسوائی کا ڈر ہے ـــــ راجی کو کیا ڈر ہو سکتا ہے ـــــ نہ باپ
نہ ماں ـــــ نہ بہن نہ بھائی دور نزدیک میں بھی ایسا کون ہے جسے وہ اپنا کہہ سکے۔

ـــــ مت بھول گھر کبھی اس کا بھی تھا ـــــ تیرے گھر سے بھی بڑا ـــــ موٹر گاڑی نوکر چاکر
سبھی کچھ تھا ـــــ اس نے سب بیچ بانٹ دیا اور خاندانی حویلی چھوڑ کر سمندر کے کنارے
چار چھ کمروں کے اس فلیٹ میں منتقل ہو گیا جہاں آج کل اس کے اپنی ہی قماش کے نکمے
اور بے فکرے مفلوج ہر دوسرے تیسرے دن اکٹھے ہو جاتے ہیں اور شعر و ادب کی
بے تکی باتوں میں گھنٹوں گذار دیتے ہیں ـــــ باتیں کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں،
کباب اڑاتے ہیں اور بیچارے راجی کو اسی طرح جیئے جانے کی بد دعائیں دے کر بالآخر
اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں یا پھر وہیں پڑے رہتے ہیں کئی کئی دن ـــــ اس
کے دل میں راجی کے لئے نہ جانے کیسے ایکا ایک عجیب قسم کے رحم کا جذبہ ابھرنے لگا۔ کیا
زندگی ہے بیچارے کی ـــــ کم بخت کتنا ذہین طالب علم تھا۔

اور یہ ارچنا بھی خوب ہے ـــــ شہر کے معروف سرجن پرشانت ورما کی بیوی۔ ہر
ہفتے ایک حقیر ملازمہ کی طرح اس کا فلیٹ صاف کرتی ہے۔ چیزیں قرینے سے سجاتی ہے۔
شرابیوں کی اگلی ہوئی پان کی پیک بھرے اگالدان دھو دھلا کر صاف کر آتی ہے۔ قسم
قسم کے لذیذ پکوان بنا کر اس کا فرج بھر آتی ہے اور لکھتی ہے کہ راجی نے اسے کبھی بھولے
سے بھی نہیں چھوا ـــــ میں جانتا ہوں کہ ارچنا کبھی جھوٹ نہیں بولتی ـــــ وہ بھی
دوسری عورتوں کی طرح جھوٹ بول سکتی تو کتنا اچھا ہوتا! اے کاش۔

راجی نے ارچنا کو کبھی چھوا تک نہیں ـــــ شرابی کے نیم مردہ تھکے ہارے بدن میں

وہ سکت، وہ ولولہ، وہ امنگ کہاں جو ایک صحت مند آدمی کا خاصہ ہوتی ہے۔

ارچنا جیسی اپسرا کو اتنے قریب پاکر اس کی چاہ نہ کرنا اس کے بے پناہ حسن کی توہین ہے — حیرت ہے کہ ارچنا — اے کاش جانے سے پہلے — ارچنا ایک بار آخری بار ہی سہی — ارچنا ٹھیک کہتی ہے — میں واقعی ہوس کا کیڑا ہوں — مگر بدن بھی کیا پایا ہے کافرہ نے — خدا کی قسم۔

دروازہ پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اجازت پاکر رامو صبح کی چائے لے آیا۔

"آج کا اخبار؟"

"بی بی جی پڑھ رہی ہیں۔ ابھی مانگ لاتا ہوں۔"

"بی بی جی؟ نہیں جانے دو — کل شام کی ایوننگ نیوز ہی لے آؤ — اخبار والا باہر برآمدے میں پھینک گیا ہوگا۔"

تو ارچنا نہ گئی تھی — میں ناحق اتنا پریشان رہا۔ بلاوجہ رات بھر جاگا کیا — جب کہ وہ مزے سے اپنے کمرے میں سوتی رہی۔

ارچنا کا نہ جانا — یا جاتے جاتے رک جانا — کتنا اچھا لگ رہا ہے مجھے۔

وہ خط مجھے نہ لکھنا چاہئے تھا۔ میں وہ سب لکھ کر کتنا پریشان رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی وجہ سے پشیمان ہوکر رک گئی ہے۔ بیٹی کس کی ہے — پروفیسر راد ھے شام جی تو دیوتا پرش تھے — اتنے بڑے ودوان اور اتنے حلیم۔

رامو ایوننگ نیوز لے آیا — سامنے پہلے ہی ورق پر وہ منحوس خبر چھپی تھی۔

"کل رات مشہور ادیب، شاعر اور دانشور جناب راج کشور راجی کی دل کی حرکت کے یکایک بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک موت ہو گئی۔ مرحوم . . . . . "

چائے کی پیالی وہیں بن پیئے چھوڑ کر پرشانت اپنی بیوی کے کمرے کی طرف لپکا — ارچنا صبح کے اخبار کو چھاتی سے چمٹائے گہری نیند سو رہی تھی — اس کا تکیہ آنسوؤں سے گیلا ہو رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ رات بھر جاگتی رہی تھی اور روتے روتے بالآخر بے حال ہوکر۔

کتنی سندر ہے تیری بیوی — پیار کا جیسے دریا اُمڈ آیا پرشانت کے دل

ہیں ــــ سونپ دو بیچاری کو ــــ اس کا طلسم ٹوٹ گیا ہے ــــ اس کا آدرش ــــ وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آیا۔

کوئی ایک ہفتہ بعد رابن لال واڈی شاہ کی مشہور فرم کے سالیسٹر اروند بھائی شاہ تشریف لائے اور انکشاف فرمایا کہ جناب راج کشور راجی جو بظاہر ایک معمولی فلیٹ کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ درحقیقت خاصے امیر آدمی تھے۔ اور فلیٹ کے علاوہ وہ لاکھوں نقد چھوڑ کر مرے تھے۔ روپیہ تو ان کی وصیت کے مطابق ان کے اسکول اور کالج کے علاوہ چند دوسرے ادبی سماجی اور تعلیمی اداروں اور گنے چنے ضرورتمند احباب کے لئے تھا مگر اپنا فلیٹ وہ اپنے منھ بولے بھائی اور بھاوج ڈاکٹر پرشانت ورما اور محترمہ ارچنا ورما کے نام چھوڑ گئے ہیں۔

اروند بھائی نے کہا ــــ ہم سب حیران تھے کہ اتنے نزدیکی ہوتے ہوئے بھی آپ دونوں میں سے کوئی بھی ان کی میئت میں شریک نہیں ہوا۔ مگر خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے میں تو آپ لوگوں کو مرحوم کا یہ سیل بند لفافہ، فلیٹ کی ملکیت کے کاغذات چابیاں اور وصیت نامہ کی یہ کاپی سونپنے آیا ہوں۔

فلیٹ آپ لوگوں نے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہوگا ــــ مگر آج وہ قطعی نیا فلیٹ ہے۔ پورے پچاس ہزار روپے خرچ کر کے انھوں نے اس کی تقریباً ہر چیز بدل ڈالی ہے۔ پرانی چیزیں مختلف دوستوں کو اٹھوا دیں۔ مختصر سے فرنیچر اور کچن کے سامان کے علاوہ ہر چیز نئی ہے ماسوائے کتابوں کی ایک پرانی الماری کے جس میں سے ان کی ایک ذاتی تصویر بھی ملی ہے۔ تصویر کو چاندی کے فریم میں مڑھا کر میں ان کے بڑے کمرے کی مصنوعی فائر پلیس کے اوپر ٹانگ آیا ہوں۔ ہو سکے تو تصویر کو آپ وہیں رہنے دیں۔ وہ گوشہ نشیں فقیر ظاہر ہے کہ خود تو اب آئے گا نہیں خدا قسم بڑا شاندار آدمی تھا ــــ بادہ خوار ہوتے ہوئے بھی بڑا ہی نیک، رحم دل اور ذہین انسان۔

سالیسٹر چلا گیا تو پرشانت نے دیکھا کہ ارچنا اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی ہے اور اس کی نگاہ میں ایک عجیب قسم کی فاتحانہ چمک ہے ــــ ایک قطعی نئی اور انوکھی آن بان اور شان۔ ناز و وقار سے اس کی گردن کا تناؤ اتنا کھنچ آیا تھا جیسے یکا یک

اس کی لمبائی میں خاصا اضافہ ہو گیا ہو ـــــ اس کی بیوی کا قد اس کے اپنے قد سے کتنا اونچا اٹھ آیا تھا۔

تمہارا خط؟

کھول کر پڑھ لو۔ خط پر ہم دونوں کا نام ہے۔

پرشانت نے لفافہ چاک کیا۔ خط ارچنا کے نام تھا۔

خط پر کوئی تاریخ نہ تھی۔

خط تمہارے نام ہے۔

جس ارچنا کے نام یہ خط ہے اس کا وجود ختم ہو چکا ہے جو بچا ہے وہ ارچنا نہیں ارچنا ورما ہے، شہر کے معروف ڈاکٹر پرشانت ورما کی بیوی۔ اپنا وجود اپنی ایک مخصوص شخصیت ہوتے ہوئے بھی جب میں نے تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تو اب کیا چھپاؤں گی۔

تم خط پڑھو ـــــ یہ حکم تھا۔

پرشانت بلند آواز سے پڑھنے لگا۔

"پیاری ارچنا۔

یہ خط تمہیں کب ملے گا میں نہیں جانتا۔ بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ خط جب تمہیں ملے گا میں اس دنیا سے اٹھ چکا ہوں گا۔

میرے دن ختم ہو رہے ہیں اور تم جانتی ہو کہ مرنے والے کبھی جھوٹ نہیں بولتے ـــــ ہاں ارچنا یہ واقعی سچ ہے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے مگر آج تک نہیں جان پایا کہ اس محبت کو کیا نام دوں۔ میں کینسر کا مریض نہ ہوتا تو تمہارے پتا اور اپنے پیر و مرشد محترم پروفیسر صاحب کا حکم بجا لاتے ہوئے تم سے بیاہ کر لیتا۔ اور میری محبت ایک شفیق شوہر کی محبت ہو جاتی۔

افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ میری محبت میں تکمیل تک پہنچنے کا دم نہ تھا ـــــ پروفیسر صاحب نے سب جان لینے کے بعد مجھے معاف کر دیا تھا۔ انھوں نے تم سے اس کا ذکر کبھی نہ کیا کیونکہ وہ تمہارا جواب جانتے تھے۔ تمہارا جواب یقیناً یہی ہوتا کہ تم لالچی نہیں ہو اور تمہیں جسم کا بھی اتنا موہ نہیں ہے۔

تمہارے لئے پرشانت کا چناؤ میں نے ہی کیا تھا. تمہاری زبان سے پرشانت کی بے پناہ تعریفیں سن سن کر میرا دل کبھی کبھی کسی قدر جلتا ضرور تھا مگر تسلی بھی ہوتی تھی کہ میں نے اپنی پیاری ارچنا کا مستقبل جس شخص سے باندھا تھا وہ واقعی اس کے یوگیہ تھا۔

میں تمہاری دنیا سے جا رہا ہوں تھک کر ـــــ ہار کر اور پوری طرح سے خانماں برباد ہو کر ـــــ میں اپنے خاندان کا آخری نقطہ تھا. میری موت کے ساتھ میرے پرکھوں کی پیڑھی ختم ہو جائے گی۔ ہر چیز جو بنتی ہے پنپتی اور پروان چڑھتی ہے بالآخر ایک دن فنا بھی ہوتی ہے ۔ آج ہم بھی ختم ہو گئے ۔

یہ فلیٹ میں نے تمہاری پسند کی بنا پر خریدا تھا۔ اس دنیا سے جانے سے پہلے اسے تمہاری ہی پسند کی چیزوں سے سجا دیا ہے. پرشانت کو تو شاید معلوم بھی نہ ہو کہ تمہیں کیا کیا اور کون کون سے رنگ پسند ہیں ۔ فلیٹ کے باہری دروازے پر جو میری محبت ہی کی طرح بے نام پلیٹ لگی ہے بلکہ شروع ہی سے پیوست ہے اسے ہٹوا دو گی تو نیچے تمہیں اپنا اور اپنے پیارے شوہر کا نام بڑے سلیقے سے کھدا ہوا ملے گا۔

تمہاری شادی کو سال بھر ہو چلا ہے اس بیچ پرشانت کبھی کبھار، اور تم اکثر یہاں آتی رہی ہو. حیرت ہے کہ پرشانت نے تم سے ہمارے غیر معمولی تعلقات کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا ـــــ کبھی کوئی شکایت نہیں کی ـــــ جس فراخدلی سے اس نے تمہیں میرے ہاں آنے جانے کی اجازت دے رکھی تھی اس سے ظاہر ہے کہ اسے تمہاری ذات پر پورا بھروسہ تھا. تم خوش نصیب ہو۔

پرشانت کے کردار کا یہ روشن پہلو مجھے اکثر پریشان کر دیتا تھا ـــــ اگر کبھی وہ بھولے سے بھی ہمارے تعلقات کے بارے میں پوچھ بیٹھتا تو میں اس کی تشفی کے لیے بلا جھجک کہہ دیتا کہ تم میری بہن ہو ـــــ خدا گواہ ہے کہ یہ بھی جھوٹ نہ ہوتا ـــــ خدا تم دونوں کا نگہبان ہو ـــــ تمہارا راجی ۔

نوٹ : میں نے اپنی بیس سالہ ادبی اور علمی زندگی میں دو ناول، دو شعری مجموعے اور درجنوں مضامین اور کہانیاں وغیرہ لکھی ہیں ۔ کل ملا کر بیس کتابیں

ہیں۔ یہ کوئی ایسا بڑا ذخیرہ نہیں ــــ مگر یہ ہماری مشترکہ اولاد ہے۔

ہر کتاب کے دس دس نسخے تمہارے لئے چھوڑے جا رہا ہوں ــــ یہ ہم دونوں کی روحوں کے سکیچز ہیں۔

خط ختم ہوگیا ــــ پرشانت نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ارچنا کمرے میں نہیں تھی اور راجی کے فلیٹ کی چابیاں بھی غائب تھیں۔

پتھرایا آدمی

چندر پرکاش خوبصورت نام ہے ہے نا
یہ کہانی جس چندر پرکاش سے متعلق ہے۔ وہ
بھی خاصا خوبصورت آدمی ہے۔ کم از کم کبھی
رہا ضرور ہوگا۔ آج اس کی عمر پچاس کے
لگ بھگ ہے اور اس کے لمبے چوڑے
اور کسرتی بدن کے وہ سارے خم گوشت
پوست نے بھر دیئے ہیں جن کے ہونے
سے آدمی چست وچابک اور نہ ہونے سے
ڈھیلا اور فربہ لگتا ہے۔ پچاس سال بڑی
ظالم عمر ہے مگر۔

چندر پرکاش ایک مقامی کالج میں
انگریزی ادبیات کے معلّم ہیں۔ لٹریچر پڑھنا
پڑھانا تو خیر ان کا پیشہ ہی ہے مگر لٹریچر میں
یا لٹریچر کے بارے میں گفتگو ان کا محبوب مشغلہ
ہے۔ وہ لکھتے بھی خوب ہیں۔ تنقیدی مضامین
کے علاوہ وہ انگریزی بلینک ورس میں بھی
دخل رکھتے ہیں۔ اردو ہندی کے اکثر ادبا
اور شعرا ان کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں
تاکہ وہ ان پر انگریزی میں مضامین لکھیں۔
ہر مقامی انگریزی اخبار اور رسالہ ان کے
مضامین چھاپتا ہے۔ اپنے جاننے والے اکثر
ادبا اور ان کے فن کے بارے میں چندر پرکاش
نے مضامین لکھے ہیں۔ ایسے مضامین سے
انھیں کیا ملتا ہے یہ تو وہی جانیں مگر ان ادیبوں
سے انھیں بے پناہ عزت اور احترام ملتا ہے

ہندی اور اردو کی اکثر کتابوں کی رسم اجرا کے موقعوں پر وہ صف اول میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔

پروفیسر چندر پرکاش کو پروفیسر کہلانے کا بہت شوق ہے۔ آپ انھیں پروفیسر کہتے رہیں وہ آپ پر اپنی نظر کرم بنائے رکھیں گے اور اگر آپ ادیب وغیرہ ایسی کوئی شے ہیں تو آج نہیں تو کل ایک نہ ایک دن وہ آپ کے فن اور شخصیت پر ایک آدھ اچھا یا ذرا کم اچھا (وہ برا، قطعی برا کبھی نہیں لکھتے) مضمون ضرور لکھیں گے جو چھپے گا اور جس کی چرچا بھی بھلے ہی کسی اور جگہ نہ ہو کافی ہاؤس میں ضرور ہو گی۔ ہمارے بہت سے بیچارے ادیب کافی ہاؤس میں بطور ادیب پہچانے جانے کو ہی ریکگنیشن سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پروفیسر پرکاش کی اہمیت ان کے نزدیک کسی انجانی ادبی اکادمی کی سی ہے۔

پروفیسر چندر پرکاش دلی کے کافی ہاؤس کی جان ہیں کہنے کو تو ہم بھی ایک چھوٹے سے ادیب ہیں۔ اور کبھی کبھار ایک آدھ خاصی اچھی کہانی بھی لکھ لیتے ہیں مگر ہم نے چندر پرکاش کو کبھی اس مسکین نظر سے نہیں دیکھا جس سے ہمارے دوسرے ہم عصر دیکھا کرتے ہیں کیونکہ ان کی معرفت جاودانی ہونے کا اپنا کوئی ارادہ نہیں، کہانی لکھنا ہمارا مشغلہ ضرور ہے مگر پیشہ نہیں۔

یہ تو رہی تمہید یا پروفیسر چندر پرکاش کی گوناگوں ذات سے مختصر تعارف اب ذرا اس قصہ کو بھی سن لیجیے جس کو لے کر ہمیں مجبوراً لکھنا پڑ رہا ہے۔

مکان کی تلاش میں ہم نے نئی دلی کے جنوب کی تقریباً ہر کالونی چھان ماری تھی۔ مکان تھے، بہت تھے مگر ہماری ضرورت کے مطابق کہیں بھی کوئی مکان ہمیں نہ ملا تھا۔ میاں بیوی اور چھوٹے بڑے ملا کر چار بچے بچیاں۔ تین کمرے تو ہر صورت میں ہونے ہی چاہئیں، ایک بچوں کے لیے، ایک ہمارے یعنی میاں بیوی کے لیے اور ایک مہمانوں کے لیے جسے مغربی اسٹائل میں ڈرائنگ روم کہا جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی اس قسم کا سیٹ تھا بھی تو وہ ہماری دسترس (جس کی حد پانچ سو روپیہ ماہانہ تھی) سے باہر تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس نئی کالونی میں کوئی نہ کوئی گھر ہماری ضرورت اور حیثیت کے مطابق ضرور مل جائے گا اور واقعی مل بھی گیا، یہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے مکان مالک رہتا تھا اور اوپر کا حصہ کرایہ کے لیے تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ اس طرح مالک مکان کرایہ دار پر نگرانی کے

علاوہ اسے پوری طرح قابو میں بھی رکھ سکتا ہے۔ بوقت ضرورت اوپر والوں کا پانی بند کر سکتا ہے اور پانی آپ جانتے ہیں فی زمانہ بہت بڑا ہتھیار ہے۔ پانی کی ضرورت بڑے بڑے ہنگامے کھڑی کر سکتی ہے۔ نہ معلوم کتنی لڑائیاں پانی کے لیے لڑی گئی ہیں۔

نوکر (یا نوکر نما ایک صاحب)، ہمیں صاحب خانہ کے ڈرائنگ روم سے ملے بغیر باہر والے برآمدے میں بٹھا کر نہ جانے کہاں چلا گیا اور ہم میاں بیوی نہ جانے کب تک چپ چاپ بیٹھے مکان مالک کا انتظار کرتے رہے۔ سامنے سینٹرل ٹیبل پر پڑے رنگا رنگ میگزین ورسائل وغیرہ نہ ہوتے تو وقت گزارنا مشکل ہو جاتا، کوئی بیس منٹ بعد وہ حضرت دوبارہ تشریف لائے تو ساتھ میں چائے کی ایک پر تکلف ٹرے بھی تھی جس میں دو پیالی چائے اور دو گلاس ٹھنڈے پانی کے علاوہ ایک پلیٹ تازہ تلے ہوئے آلو کے قتلوں کی بھی تھی۔ "آپ چائے لیجئے پھر آپ کو آپ کا سیٹ بھی دکھا دیں گے۔ آپ کا سیٹ تو مکان مالک تھا گویا ان حضرت نے ہمیں اپنا کرایہ دار چن لیا تھا۔

"اس تکلّف کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو چائے پی کر ہی آئے ہیں" ہم نے تکلفاً مسکرا کر اس صبح کا پہلا جھوٹ بولا۔

"چائے تو حضرت ایک رسم ہے کوئی غذا تو ہے نہیں، جس کی کمی یا زیادتی سے کوئی ایسا فرق پڑ جائے گا۔"

ظاہر تھا کہ اس قسم کا برجستہ جملہ کوئی ایسا شخص جو محض نوکر ہو، ادا نہیں کر سکتا تھا ابھی ہم کچھ اس قسم کا سوچ ہی رہے تھے کہ دوسرا جملہ آیا۔

"علاوہ ازیں باہر بارش بھی تو ہو رہی ہے ظاہر ہے کہ آپ کو ادھر کچھ دیر تو رکنا ہی رکنا ہے پھر کیوں نہ ہر کام اطمینان سے کیا جائے۔"

"آپ؟"

جی میرا نام چندر ہے۔ چندر موہن۔ مجھے یار لوگ چندو بھی کہتے ہیں۔ میں فوٹوگرافی کے ایک مقامی اسٹوڈیو میں سیلزمین ہوں اور پروفیسر صاحب یعنی صاحب خانہ کا ناتی اور دوست ہوں چونکہ ہم دونوں اس دنیا میں اکیلے ہیں اس لیے میں بھی ان کے ساتھ رہتا ہوں۔

"اب ہمیں" آپ کا سیٹ اور چائے اور تلے ہوئے آلوؤں کی بات سمجھ میں آ گئی۔

ہماری بیگم کو ایک نظر دیکھ کر ہی چندر، چندو یعنی چندر موہن صاحب نے کم از کم اپنی طرف سے ہمیں کرایہ دار چن لیا تھا۔

"جی گھر ہی میں ہیں مگر اس وقت ذرا سو رہے ہیں رات کو بہت دیر سے سوتے ہیں اس لیے صبح اٹھتے بھی بڑی دیر سے ہیں۔ چھٹی والے دن تو دس سے پہلے کبھی نہیں اٹھتے۔ تو کیا؟" ہم کہتے کہتے رک گئے کیونکہ اب دس تو بجا ہی چاہتے تھے۔

چائے سے نپٹ کر ہم تینوں اوپر گئے مکان ہر لحاظ سے معقول تھا دو بیڈ روم تھے دو باتھ رسوئی گھر اور ڈرائنگ روم، ان کے علاوہ صاف ستھری کھلی چھت اور سارے کا سارا آسمان اور ستارے اور چاند اور سورج اور ہوا جو شہروں میں اتنی نایاب ہوتی ہے۔

ہم نے کرایہ پوچھا تو چندر موہن صاحب نے ہمیں براہ راست مکان مالک سے بات کرنے کا مشورہ دیا، پیشتر اس کے کہ ہم کوئی اور بات کرتے نیچے سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"چندو شرما جی نے مکان دیکھ لیا ہو تو انھیں نیچے لے آؤ۔"

شرما جی؟ ظاہر تھا کہ مکان مالک یا جن صاحب نے بھی ہمیں پکارا تھا ہمیں جانتے تھے، ہم نے سوالیہ نگاہوں سے چندر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔

ہم نیچے اتر آئے تو دیکھا کہ پروفیسر چندر پرکاش صاحب حیدر آبادی تہمد باندھے ننگ دھڑنگ کھڑے ہیں۔ ہمیں بیگم کے ساتھ دیکھ کر قدرے جھجکتے ہوئے بولے۔

"ارے چندو تو نے بتایا کیوں نہیں کہ بھابی بھی ساتھ ہیں۔" وہ بیگم کے لیے بھابی کا لقب کچھ اس ڈھنگ سے استعمال کر رہے تھے گویا مدتوں سے انھیں اسی طرح مخاطب کرنے کے عادی ہوں۔ ان کے جھجکنے کے ڈھنگ سے البتہ صاف ظاہر تھا کہ انھیں ہماری بیگم کی موجودگی کا علم تھا اور وہ جان بوجھ کر اس طرح آدھے آدم بنے کھڑے تھے۔ غالباً بیگم کو اپنے جسم کی خوب صورتی اور تناسب وغیرہ سے مرعوب کرنے کی غرض سے۔

چندر پرکاش صاحب ویسے تو ایک حسین شخصیت ہیں ہی ان کا جسم بھی خوب تھا پچاس برسوں کے باوجود تنا ہوا چست کسرتی۔ کپڑوں میں تو وہ ایک دم فربہ دکھائی دیتے تھے۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اور خود ڈھنگ کے کپڑے پہن کر لوٹنے کو کہہ

وہ گھر کے اندر چلے گئے اور کوئی دس منٹ بعد لوٹے۔ اس بیچ ہم دونوں نے کمرہ کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا چندر صاحب باہر تشریف لے گئے تھے۔ اب ہم اور بیگم کمرہ میں اکیلے تھے۔

کمرہ کے ایک کونہ میں بڑے بُک شلیف کے اُوپر کسی بڑی ہی خوبصورت عورت کی تصویر خاصے بڑے اور قیمتی فریم میں جڑی سارے کمرہ کی فضا میں ایک خاص قسم کا تہذیبی اضافہ کر رہی تھی۔ تصویر میں جانے کیا تھا، بار بار ہماری نظریں اُسی طرف اُٹھ اُٹھ جاتی تھیں، بالآخر ہم دونوں اُٹھ کر اُس تصویر کے قریب چلے گئے۔ "ارے" ایک دم ہم دونوں کی زبانوں سے نکلا "یہ کیا!"

یہ تصویر ہماری چہیتی سالی یعنی بیگم کی چھوٹی بہن منجو کی تھی۔ منجو جو آج کل لندن میں تھی اور ایک خوبصورت بچے کی ماں تھی۔ منجو کو خط لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اور ہر مہینہ اپنی خیر و عافیت سے مطلع کرتی رہتی تھی دونوں بہنیں ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ مگر وہ تصویر یہاں کیسے چلی آئی۔ بالکل ایسی ہی گرچہ قدرے چھوٹی ایک تصویر کی کاپی ہماری فیملی البم میں بھی تھی اور ابھی چند روز پہلے ہی ہم نے اس تصویر کی دو درجن کاپیوں کا رنگون اسٹوڈیو کو آرڈر دیا تھا۔ یہ تصویریں منجو کی سسرال والوں نے طلب کی تھیں۔

بیگم جو ابھی تک نئے مکان کو دیکھ کر بے حد مسرور تھیں یکایک سیریس ہو گئیں۔

پروفیسر صاحب قبلہ لوٹے تو خوب بنے ٹھنے تھے۔ ہمیں بُک شلیف کے قریب کھڑا دیکھ کر ایک دم کھل اُٹھے کیسی لگی میری سلیکشن؟

"بہت اچھی" ہم نے جواب دیا تھا ظاہر ہے کہ آپ جیسے علم و ادب کے ایک کامیاب مُعلّم کے گھر میں اسی قسم کی کتابیں ہونا چاہئیں۔ آپ کا شوق قابل ستائش ہے۔ "ہم نے جان بوجھ کر عورت کے پورٹریٹ کا ذکر نہ کیا۔

"شکریہ شکریہ" پروفیسر صاحب واقعی بے حد خوش تھے۔

مگر یہ محترمہ؟ بیگم نے پوچھ ہی لیا۔

"ارے یہ ایک لمبی کہانی ہے بھابی صاحبہ" پروفیسر نے ایک دم جیسے بوکھلا کر کہا۔ ان کے چہرے کے رنگ یکایک بدلنے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسی عجیب و غریب

کیفیت طاری ہو گئی ان کے وجود پر۔ گویا وہ ماضی کے کسی بہت ہی اہم مرحلہ میں یکایک لوٹ گئے ہوں۔ اور ماضی کی کوئی بڑی ہی دکھ بھری یاد انھیں بے پناہ ذہنی کوفت بلکہ اذیت پہنچا رہی ہو۔ بیگم اب ایک دم چپ ہو گئیں تھیں ان کی بہن کا پروفیسر یا کسی بھی غیر مرد سے کبھی اس قسم کا گہرا تعلق رہا تھا۔ یہ انھیں قطعی معلوم نہ تھا اور سب کچھ ایک دم جان لینے کے اشتیاق میں وہ یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ ہمارے ساتھ مکان دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔

پروفیسر نے جو ایک ٹک اس تصویر کو دیکھے جا رہا تھا اور ظاہر تھا کہ وہ اسی میں قطعی طور پر کھو گیا ہے۔ خاصے لمبے وقفہ کے بعد جب ہماری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے آنسوؤں کی دو مہین مہین ندیاں بھی بہہ نکلیں۔ کافی دیر اسی طرح حیران و ششدر سنجیدہ اور چپ رہنے کے بعد وہ جب گویا ہوئے تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زبان سے نہیں دل کے کسی کونہ سے کوئی پرانی بھولی بسری آواز نکالنے کی ناکام سعی کر رہے ہوں مگر کوشش کے باوجود بات زبان پر نہ آ رہی ہو۔

"مرد کی آنکھوں میں آنسو، ہے نا شرم کی بات؟"

ہم دونوں میں سے جب کوئی کچھ نہ بولا تو وہ پھر چپ ہو گیا۔

اب ہم لوگ صوفہ پر آ بیٹھے تھے۔ بڑی سیٹ پر ہم دونوں اور پروفیسر چندر پرکاش ہمارے بالمقابل رکھی صوفہ چیئر پر۔

ہمت اور حوصلہ جمع کر کے آخر ہم نے کہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے ان جانے میں آپ کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یقین جانیے ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"یہ سکیشنی کی تصویر ہے سکیشنی جو میری ہم جماعت تھی" پروفیسر نے میری رسمی معذرت کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"مگر یہ تو" بیگم نہ جانے کیا کہتے کہتے سنبھل گئیں۔

"ایک نوجوان عورت کی تصویر ہے" پروفیسر نے جیسے بیگم کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ اس بیچ ہم نے بیگم کو چپ رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ خود بھی چپ رہنے ہی میں مصلحت سمجھتے ہوئے ہم نے پروفیسر کی طرف کچھ ایسے انداز سے دیکھا جس کا مطلب تھا۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بلا خوف ضرور کہیے۔ اس سے آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

"یہ بیس سال پرانی تصویر ہے بھابی مگر سکیشنی زندہ رہی ہوتی تو بھی میرا ایمان ہے کہ وہ آج بھی ایسی ہی لگتی کم از کم اسے اسی طرح ایسے ہی بنائے رکھنے کے لیے میں اپنی جان تک دے سکتا تھا۔"

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ ایک عجیب حزین سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر لمحہ بھر کو نمودار ہوئی اور وہ پھر اداس ہو گئے۔ اس اداسی میں بے بسی بھی تھی اور شرمندگی بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"کون مرتا ہے کسی کے لیے۔ کسی کے لیے جان دینے کا حوصلہ آج کس میں ہے مرنا بہت مشکل ہے شرما جی!" اب وہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ "آج کل تو ماں بھی اپنے جوان بیٹے کے لیے نہیں مر سکتی۔ میں تو ایک۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ پھر رک گئے۔

"لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ پرانے قصے ہیں محبت کے کلاسکی عہد کی روایات۔ جانے وہ کیسے لوگ تھے، ہم تو شرما جی! بے حیا لوگ ہیں، بے حیا اور طوطا چشم، ہم میں سے کون کسی کے لیے مرتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے جان تک دے سکتے ہیں وہ مر گئی۔ میرے سامنے میرے ہاتھوں میں۔ بوند بوند اس کی زندگی بہتی رہی اور میں محض ایک تماشائی کی طرح دیکھتا گیا۔ اس کے درد کی کیا شدت رہی ہو گی۔ موم کی طرح پل پل پگھلتی ہوئی بہتی ہوئی زندگی کے درد کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ مگر اپنے آخری لمحات میں بھی وہ اپنے آنچل سے میرے ہی آنسو پونچھتی رہی۔ جیسے میرے آنسو اس کے لیے اپنی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس کے بجائے اگر کہیں میں مر گیا ہوتا تو وہ کیا کرتی۔ وہی جو میں نے کیا۔ نہ جانے مجھے کیوں کر یقین ہے کہ وہ میری طرح بے حیا نہ تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی جان دے دیتی۔ ایک بار اس نے کہا تھا۔ "تم پر کاش ہو میں تمہاری چھایا ہوں۔ تم ہو اسی سے میں ہوں، تمہارے بغیر میرا کوئی وجود نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔" گویا میری ذات ہی اس کی ہستی کا واحد سہارا تھی میں نہ رہتا تو وہ بھی نہ رہتی۔ عورت بہت مہان ہوتی ہے شرما جی۔ آدمی عورت کی دنیا ہوتا ہے مگر آدمی کی دنیا بہت لمبی چوڑی پھیلی ہوئی دھوپ چھاؤں ہے جس میں عورت ہے تو مگر سب کچھ نہیں۔ کچھ ہے تو بادلوں کے سایوں میں پنپنے والے رنگین شیریں خوابوں کی سی ایک مستی ہے، نہ جانے ایسا کیوں ہے نہ جانے یہ سب جانتے بوجھتے

ہوئے بھی لوگ کیوں محبت کرتے ہیں کیوں ایک ساتھ جینے مرنے کے جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ کیچڑ میں پڑے پڑے بھی ستاروں کی طرف جھانکتے رہنا آدمی کی پرانی عادت ہے۔ یہ عادت کبھی نہیں جائے گی۔ یہ چلی جائے تو زندگی کیسے چلے۔ یہ میٹھا سرسبز جھوٹ ہی تو زندگی کا سہارا ہے اسی پر تو یہ دنیا اور اس کے رشتے ناطے قائم ہیں۔۔۔

"جھوٹ فریب کی یہ خوب صورت دنیا۔۔۔"

دیکھئے نا وہ نہیں ہے اور میں نے یہ گھر بنوایا ہے اسے خوبصورت اور آرام دہ بنانے کی ہر طرح پوری کوشش کی ہے۔ یہ کمرہ سجایا ہے یہ نیا فرنیچر، یہ قیمتی قالین، یہ کتابیں، یہ الماری، اس بات کی تو ضامن ہیں کہ میں زندہ ہوں اور اسی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں یہ آنسو جو میں اپنے محبوب کی یاد میں کبھی کبھی بہا دیتا ہوں میں سمجھتا ہوں یہ بھی جینے کا ایک حربہ ایک ڈھنگ ایک بہانہ ہے۔

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے، آنکھیں موند کر اُنھوں نے اپنا سارا جسم صوفہ چیئر کی بیک پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔۔۔ جب دیر تک وہ یوں ہی پڑے رہے تو ہمیں لگا کہ مصلحتاً ہی سہی کچھ نہ کچھ کہنا ہمارے لیے بھی ضروری ہے۔ مگر ہم نے جو کیا وہ بناوٹ نہ تھی ہمارے دل کی آواز تھی۔ "آپ نے اچھی صورت، صحت، جائداد اور آمدنی وغیرہ کے باوجود آج تک شادی نہ کی، یہی کیا کم ہے۔ مرجانا میرے نزدیک اتنی بڑی قربانی نہیں جتنی درد کو اس طرح دل میں سموئے اور سمیٹے جیئے جانے میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اچھا ہی ہوا جو آپ نے کبھی شادی نہ کی۔ سکیشنی سے آپ کی شادی ہو گئی ہوتی تو آپ کے جذبۂ عشق میں یہ شدت نہ رہتی۔"

پروفیسر نے آنکھیں کھول کر حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں سکیشنی تو میری بیوی تھی۔"

"تو آپ نے شادی بھی کی تھی۔" اب تو بیگم کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ بوکھلا سی گئیں۔ "سکیشنی میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر کی چھوٹی بیٹی تھی۔"

ہم نے دیکھا کہ بیگم کے تنے ہوئے خدوخال قدرے ڈھیلے پڑے ہیں اور انھیں قدرے تسلی بھی ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ تصویر والی لڑکی کی بڑی بہن تو ہو سکتی تھیں۔ مگر ان کے والد کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر وغیرہ نہ تھے۔ محکمہ جنگلات کے ایک بڑے افسر تھے

یہ تو اب ظاہر ہی تھا کہ پوری مشابہت کے باوجود تصویر والی لڑکی منجو نہ تھی، سکیشنی تھی۔ کون جانے کہتے ہیں دنیا میں کوئی دو چہرے ایک جیسے نہیں ہوتے، سوا جڑواں بہنوں یا بھائیوں کے۔ مگر دنیا کو بنانے والے کے لیے کیا مشکل ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری منجو سکیشنی ہی کا دوسرا جنم ہو۔ ہو کیا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پروفیسر کو بتا دیا جائے کہ سکیشنی مری نہیں، زندہ ہے اور واقعی آج بھی اسی طرح لگتی ہے جیسے بیس سال پہلے لگتی تھی تو کیا ہو۔ وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے منجو کا بنا بنایا سورگ جہنم بن جائے۔ مصلحت اسی میں ہے کہ چپ رہا جائے۔ یہ غم پروفیسر کا نجی اثاثہ ہے۔ گذری ہوئی وہ ساعتیں اب مٹی بن چکی ہیں اب اس مردہ مٹی میں دوسری قسم کی الجھنوں کے جھاڑ بو دیئے گئے تو انھیں لہو کی کھاد سے سینچنا ہوگا۔

"اچھا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں ہیڈ ماسٹر کا چہیتا شاگرد تھا اور ان کے گھر میں میرا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا کبھی ان کی کوئی فائل پہچانے تو کبھی سکول کے مختلف امتحانات کے ریزلٹ ٹیبولیٹ کرنے میں ان کی مدد کے لیے۔ سکیشنی جس کا کوئی بھائی نہ تھا۔ تب مجھے دادا کہہ کر بلاتی تھی اور خدا گواہ ہے کہ تب میرے من میں بھی اس کے تئیں کوئی ایسا ویسا وچار نہ تھا۔ وہ میرے گورو کی بیٹی تھی اور تقریباً میری ہی ہم عمر۔ اس کا احترام کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی پڑھائی میں بھی اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ خاص کر حساب وغیرہ میں جس میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی پھر ایک روز اس نے کہا تھا" حساب خالص مردانہ سبجیکٹ ہے مجھے تو کسی طرح بس پاس کرنا ہے۔"

"آگے نہیں پڑھوگی؟" میں نے پوچھا تھا۔

"تم کہو گے تو پڑھ لوں گی، ورنہ نہیں۔ مجھے نوکری ووکری تو کرنی نہیں پھر کیوں ان کتابوں سے ماتھا پچی کی جائے۔"

"میرے کہنے پر ہی کیوں پڑھوگی۔"

"لوگ کیوں پڑھتے ہیں؟"

اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے۔

نہیں سورج میں کھڑا ہونے کے لیے اس نے انگریزی کے مشہور محاورے

کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ TO BE ABLE TO STAND IN THE SUN

"تمھیں سورج میں کھڑا ہونا پسند نہیں؟" میں نے پوچھا۔

سورج کی چھایا میرے لیے زیادہ سکھ دایک ہے۔ اپنے بل بوتے پر کھڑی ہونے کا نہ میرا کوئی ارادہ ہے نہ اس کی سکت ہی مجھ میں ہے۔ میں تو تمہاری چھایا میں جینا چاہتی ہوں یہی دیدی اور پاپا چاہتے ہیں۔"

کسی عام لڑکی کے لیے اس طرح کی بات کہہ سکنا کتنا مشکل ہے۔ سکیشنی کے لیے یہ بات اس طرح بغیر اُلجھے الجھائے کہہ دینا فطری تھا۔

پیار کا یہ پہلا انکُر تھا جو بعد میں ایک وشال پیڑ بن گیا۔

کالج میں ہم لوگ اکٹھے داخل ہوئے تھے اور بی۔ اے بھی ہم نے اکٹھے پاس کیا۔ میرے اصرار پر ایم۔ اے میں بھی اس نے داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں انگریزی زبان وادب کے طالب علم تھے اور گھنٹوں اپنے سبجیکٹ کے کسی ایک مضمون کو لے کر ہم بحث ومباحثہ کیا کرتے تھے۔ سکیشنی بڑی ذہین لڑکی تھی اور مجھے اکثر لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ جانتی ہے۔ اس کے والد انگریزی زبان کے ماہرین میں سے مانے جاتے تھے۔ اور یہ ظاہر تھا کہ ان کی قربت میں رہ کر سکیشنی کی علم اور لٹریچر سے کی واقفیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی پھر بھی اس نے میرے برابر نمبر کبھی نہیں لیے تھے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ جان بوجھ کر وہ میرا مقابلہ نہ کرتی تھی۔ مبادا اس سے میری دل شکنی ہو۔

ایم۔ اے کا آخری سال تھا۔ ایک دن وہ کالج نہ آئی۔ دوسرے دن آئی تو مجھ سے ملے بغیر چپ چاپ چلی گئی۔ پھر اس کا آنا جانا اسی طرح رہنے لگا۔ کبھی آتی کبھی نہ آتی ایک دن میں نے اسے ڈانٹا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑی میں نے پیار سے اس کا ماتھا سہلایا تو معلوم ہوا کہ اسے بخار ہے۔ ماتھا سلگتے ہوئے اپلے کے مانند گرم تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ بہت بیمار تھی۔ بے ماں کی بچی کس کو بتاتی اپنے دُکھ کی بات۔ اسپرین کھانے سے بخار اتر جاتا تو کالج چلی آتی ورنہ گھر پڑی رہتی۔

چند ہی دنوں میں اس کی بیماری جیسے مشتہر ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے بیماری کو ٹی بی کی فرسٹ سٹیج قرار دے دیا۔ آج کل تو ٹی بی کوئی ایسی خطرناک بیماری نہیں

رہی مگر تب یعنی آج سے بیس سال پہلے یہ موذی بیماری تقریباً مہلک مانی جاتی تھی. اور اس سے بچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ سننے میں آیا کہ اس کی ماں بھی اسی بیماری سے مری تھی۔

"تو کیا میں بھی مر جاؤں گی"۔ ایک بار اس نے ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے پوچھا تھا۔

"نہیں تم کیوں مروگی۔ ابھی تو ہمیں شادی کرنا ہے۔ تمہیں میرے بچوں کی ماں بننا ہے"

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم مجھ سے شادی کرلوگے"

"اصلی شادی تو ہماری کب کی ہو چکی ہے اب تو صرف گونا ہونا باقی ہے"

نہ جانے میرے اِن بظاہر معمولی الفاظ میں کیا جادو تھا کونسی دوا یا مرہم تھی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے تندرست ہونا شروع ہوگئی۔ اور چند ہی دنوں میں گھر بھی لوٹ آئی . . . . بیماری کی وجہ سے اس کا فائنل نہ ہو سکا تھا۔ اور میں ایم۔ اے پاس کرکے اپنے ہی کالج میں لکچرار بن گیا تھا۔ نوکری کے پہلے ہی سال گرمیوں کی چھٹیوں سے کوئی ہفتہ بھر پہلے خاندان کے ہر فرد کی مرضی کے خلاف میں نے سکیشنی سے بیاہ کرلیا اور پورے دو مہینے ہم رانی کھیت میں ہنی مون مناتے رہے۔

اِتنا پیار کیا میں نے سکیشنی سے اور اِتنا پیار دیا اُس نے مجھے کہ اِس ایک جنم میں تو کیا اگلے دس جنموں تک مجھے کسی دوسری عورت کے پیار کی ضرورت نہیں رہی۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ سکیشنی ماں بننے والی ہے۔ یعنی میں باپ بننے والا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں دنیا میں پہلا باپ بننے والا تھا۔ سکیشنی جیسی اپسرا کے بچے کا باپ ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

"ہم نے کچھ جلدی تو نہیں کی" ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

"جلدی کیسی پورا وقت ہی تو لے رہی ہوں۔ ویسے میں چاہتی ہوں کہ یہ سب جلدی ہو جائے تمہیں نہ ہو مگر مجھے جلدی ہے کون جانے"۔ شاید اسے سب کچھ معلوم تھا۔ . .

آپ مانیں گی نہیں بھابی مگر یہ واقعی سچ ہے کہ سکیشنی جیسی خوبصورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ آپ نے ابھی ابھی اس کی تصویر دیکھی ہے یقین

مانیے کہ تصویر میں بھی اگرچہ وہ بے پناہ حسین دکھائی دیتی ہے اور یہ تصویر بھی ایک بڑے اچھے فوٹوگرافر کا کارنامہ ہے مگر یہ بھی پورے طور سے میری سکیشنی کی تصویر نہیں، اس کا محض ایک عکس ہے ایک سایہ ہے۔ خدا کی اپنی ہاتھوں سے بنائی ہوئی اُس اپسرا اور کیمرہ کے محدود آرٹ کی اس تصویر میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اے کاش! اس کی تصویر بنانے والا کوئی روی ورما ہوتا، کوئی ڈاونچی، کوئی ریمبرانٹ، کوئی مائکل اینجلو ہوتا۔

سچ تو یہ ہے بھابی کہ اب مرجانے کو جی چاہتا ہے۔ چندرموہن جسے آپ لوگوں نے ابھی ابھی دیکھا ہے میرا دور کا رشتہ دار ہے۔ اس نے بھی سکیشنی کو دیکھ رکھا ہے سکیشنی کے بارے میں میرے دل کی دھڑکنیں سننے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ محض اسی وجہ سے مجھے اسی کی قربت گوارا ہے ورنہ ؎

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

ظاہر تھا کہ بیگم کے ذہن میں ایک ساتھ سو سو سوالات اُبھر رہے تھے اور اُن کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا تھا۔ ہم نے اُنھیں اِشارے سے منع کر دیا تھا ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ کیا کیا کہہ یا پوچھ بیٹھتیں۔ اچانک پروفیسر کے منہ سے نکل گیا بھابی آپ حیران ہوں گی مگر یہ واقعی سچ ہے کہ آپ کے اور میری مرحوم بیوی کے کُچھ انگ، جیسے ماتھا، سر کے بال، بھویں، آنکھیں، ناک اور ہونٹ، اِتنے مِلتے جُلتے ہیں ایک دوسرے سے کہ گمان ہوتا ہے کہ آپ دونوں سگی بہنیں ہیں۔

بیگم نے جواب نہیں دیا۔ پروفیسر اپنی سکیشنی کا راگ اسی رَو میں اور بھی نہ جانے کب تک الاپتا رہتا اگر اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز اُسے نہ روک لیتی۔

اُس نے ٹیلی فون اُٹھالیا۔ تار کے دوسرے سرے پر نہ جانے کون تھا مگر جو تھا اور جو بھی بات وہ کہہ رہا تھا پروفیسر کو غیرمعمولی طور پر پریشان کیے جا رہی تھی وہ بہت گھبرا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اپنی حقیقت چھپا رہا تھا۔ دوسری طرف کے سوالوں کی بوچھاڑ کے جواب میں جو الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے اس بات کی نظیر تھے کہ ہم لوگوں سے وہ کچھ چھپانا چاہتا ہے۔ ان کی ہاں ہوں، سوری، ویری سوری

کے علاوہ بالآخر جو الفاظ ہماری سمجھ میں آئے وہ یہ تھے کہ چندر موہن گھر میں نہیں ہیں اور وہ ان کے آتے ہی وہ چیز لوٹا دیں گے جس کو لے کر اتنی جھک جھک ہو رہی تھی۔ آخر میں انھوں نے جھلا کر کہا: "آپ نے آدمی بھیج ہی دیا ہے تو پھر اس قدر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

ریسور ٹیلی فون کے آلے میں رکھ کر پروفیسر صاحب لوٹے تو بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔ اپنا ذہنی توازن درست کرنے کی غرض سے انھوں نے سگریٹ سلگا لیا۔ کوئی دو تین منٹ تک وہ کچھ نہ بولے۔ نہ ہم دونوں میں سے ہی کچھ کہتے بن پڑا۔

ہم سوچ رہے تھے کہ پروفیسر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ آدمی کا غم اس کا ذاتی سرمایہ ہوتا ہے۔ جسے وہ بانٹے بھی تو کیسے اور کن لوگوں میں۔ کون کسی دوسرے کا بوجھ اٹھاتا ہے۔

ادھر بیگم سوچ رہی تھیں۔ یہ عورت میری بہن نہیں ہو سکتی مگر دو صورتیں ایک دم ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہیں۔ سکیشنی بیس سال پہلے مری تھی۔ منجو جو لگ بھگ اسی عمر کی ہے ہو سکتا ہے سکیشنی ہی کی آتما ہو۔ مجھے پروفیسر کو بتا دینا چاہیے کہ ہو بہو اسی شکل کی ایک دوسری عورت بھی ہے۔ جو میری ہے پر بیاہتا ہے اور ایک عدد خوب صورت بچے کی ماں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر یہ سن کر پروفیسر کے سر پر کوئی نیا جنون سوار ہو گیا تو کیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بہت پیار کرتا ہے۔ اسی صورت کی ایک دوسری زندہ عورت دیکھ کر کون جانے اُسے کیا ہو جائے وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے اور منجو کو سکیشنی سمجھ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ جس سے منجو کی بنی بنائی گرہستی برباد ہو جائے۔ نہ بابا نا۔ چپ رہنے ہی میں مصلحت ہے اور یہ بھی طے ہے کہ یہ مکان چاہے کیسا بھی اچھا اور سستا ملتا ہو ہمیں یہاں آکر نہیں رہنا۔ وہ ابھی ابھی کہہ رہا تھا کہ اسے میری صورت میں بھی اپنی مرحوم بیوی کے خدوخال دکھائی دیتے ہیں۔ نہ بابا نا۔ یہ ویسے ہی اتنے شکی مزاج ہیں۔ مجھے جان بوجھ کر اپنے گھر میں طوفان کھڑا نہیں کر لینا۔ کون سا ہم مکان خرید رہے ہیں۔ ہمیں کرایہ پر ہی تو لینا ہے۔ یہ نہیں اور سہی۔

بہ مشکل دس منٹ گذرے ہوں گے کہ باہر ایک سکوٹر آکر رکا جس میں چندر موہن

صاحب کے علاوہ ایک دوسرے حضرت بھی تھے۔ ان لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر پروفیسر گھر کے اندر چلا گیا۔

وہ لوگ جیسے ہی کمرے میں گھسے چندر موہن نے آگے بڑھ کر سکیشنی کی تصویر کو اُٹھا لیا۔ "یہ رہی آپ کی امانت، داس صاحب بلاوجہ خفا ہو رہے تھے میں تو محض بھائی صاحب کو فریم دکھانے کے لیے لے آیا تھا۔"

نو وارد نے کہا "ابھی پرسوں ہی میں نے اِس تصویر کی درجن بھر کاپیاں نکالی ہیں۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر وہ قدرے جھجکا۔

ارے شرما جی آپ! یہ آپ کی سالی ہی کی تصویر ہے۔ داس صاحب پریشان تھے کہ آج شام جب آپ تصویریں لینے آئیں گے تو وہ کیا جواب دیں گے۔ بدقسمتی سے نگیٹیو خراب ہو گیا ہے اور کاپیاں اب نکالی نہیں جا سکتیں۔

"ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔" میں نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ کا غصہ بھی کافور ہو گیا ہے۔ اور وہ بڑے لطیف انداز سے مسکرا رہی ہیں۔

"چندر موہن نے پوچھا مکان آپ کو کیسا لگا؟"

جواب بیگم نے دیا "مکان تو ٹھیک ہے بھائی صاحب مگر اب صاحب خانہ کو اسے ہمیں اٹھاتے نہ بنے گا۔" اتنا کہہ کر ہم باہر نکل آئے۔ راستے میں کافی دور تک چلتے رہنے کے بعد بیگم نے کہا چلو چھٹی ہوئی آپ کو اچھا خاصا پلاٹ مل گیا۔ پھر کچھ دیر رک کر بولیں وہ پرکاش اور چھایا والا مکالمہ آپ کو کیسا لگا؟"

"مکالمے پر ہی کیا موقوف ساری کہانی بڑھیا تھی۔"

وہ مکالمہ شرت چندر چٹرجی کی مشہور کہانی "پرکاش اور چھایا" کا ہے۔

"ظاہر ہے کہ پروفیسر بہت پڑھتا ہے۔"

بیچارہ اکیلا آدمی۔

مراق

تنہائی کا تصور اور شیکسپیر:

بڑا دلچسپ لیکچر تھا۔

ڈاکٹر سراج الفاظ کا جادوگر ہے۔

مجھے تو لگتا ہے شیکسپیر کو حفظ کر رکھا ہے پروفیسر صاحب نے۔

کیا شاندار تقریر تھی۔

مگر کس قدر ڈراؤنی۔

اور پُر اسرار۔

پُر اثر بھی۔

الفاظ ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ انداز اور آواز کا بھی ایک جادو ہوتا ہے۔

بات تمہاری تنہا پسندی سے چلی تھی جو آج کل سارے کالج میں چرچا کا موضوع بنی ہوئی ہے اور جا پہونچی بے چارے شیکسپیر تک ——————

شیکسپیر کو بے چارہ کہنا کفر ہے رادھا۔ اُس جیسا دانا آج تک پیدا نہیں ہوا۔

تم جیسا بھی ادھر کوئی نہیں۔ تم نے شاید غور نہیں کیا کہ طلباء خاص طور پر لڑکیاں تمہیں کس طرح دیکھتی ہیں۔ کوئی تمہیں ہیملٹ کہتی ہے، تو کوئی اوتھیلو اور کوئی کنگ لیئر۔ سبھی حیران ہیں کہ تم ادھر اس ویران گنبد میں پورے چھ مہینوں سے رہ رہے ہو اور تم نے ابھی تک جگہ بدلنے کی درخواست نہیں دی، جب کہ تم سے پہلے کوئی ہفتہ بھر بھی یہاں ٹک نہیں سکا۔

اور وہ وارڈن کا بچہ مجھے یہ کمرہ دیتے ہوئے بڑا احسان جتا رہا تھا۔ کہتا تھا تم ٹاور کے حق دار نہیں ہو۔ یہ ہوسٹل کے سینئر اور ذہین ترین اسٹوڈنٹ کے لیے ریزرو ہے۔ کیسی دلچسپ کہانی کہہ سنائی تھی اُس نے ——————

مسز اگنی ہوتری والی کہانی؟

تم جانتی ہو وہ کہانی؟

ادھر سبھی جانتے ہیں کہ یہ گول گنبد کبھی ٹھاکر جی کے مندر کے طور پر استعمال

ہوتا تھا اور محترمہ کو خاص طور پر عزیز تھا۔ وہ دن کا اکثر حصہ اسی میں گزارتی تھیں، پھر ایک دن انھیں یہیں اپنے ٹھاکر جی کے برتنوں میں مُردہ پایا گیا۔ سُننے میں آیا ہے کہ اُن کی روح اس ٹاور کے قرب و جوار میں اکثر منڈلاتی دیکھی گئی ہے۔

بھگوان میں شردھا رکھنے والی کسی بزرگ عورت کی روح آوارہ نہیں ہو سکتی —— کوئی بھی روح آوارہ نہیں ہوتی —— روحیں جیسے ہی ایک قالب چھوڑتی ہیں پہلے ہی تیار شدہ دوسرے میں پرویش کر جاتی ہیں۔ ایسا ہم ہندوؤں کا وشواس ہے ——

تم روح اور بھوت کے فرق کو تو مانتے ہو نا۔؟

فرق کو تو مانتا ہوں مگر بھوت نام کی کوئی چیز ہوتی ہے یہ نہیں مانتا۔

اسے ادھر شریمتی اگنی ہوتری کی سمادھی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

یہ عمارت رام کرشن اگنی ہوتری نے اپنی ماں کی یادگار کے طور پر کالج کو بھینٹ کی تھی۔ اس کی قبرستان جیسی تنہائی سے ڈر کر یا پھر واقعی کسی نیک جذبے کے زیرِ اثر ——

تمہاری جانکاری کی داد دینی پڑتی ہے۔

میں کالج کے پرنسپل کی بیٹی ہوں اور پچھلے تین سال سے یہاں کی اسٹوڈنٹ ہوں۔

•

"پورے پندرہ منٹ سے باہر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں۔ میں نے سمجھا تم دوسرے دروازے سے کہیں باہر چلے گئے ہو" ——

"میں سو گیا تھا . . . ایک بار آنکھ لگ جائے تو پھر کوئی پائل کی جھنکار ہی مجھے جگا سکتی ہے۔ تو بوں کی گونج نہیں ——"

"میرا پورے پندرہ منٹ ایک تال سے اُس باہر والے دروازے کو تھپتھپائے جانا توپ کی گونج تھی یا پائل کی جھنکار ——"

"سوئے سوئے بھی میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا، لہٰذا تم اسے پائل کی جھنکار ہی سمجھ لو ——"

"ارے چھت کا دوسرا دروازہ تو مقفل ہے ——"

"یہ شروع ہی سے مقفل ہے —— آنے جانے کے لیے بس یہی ایک راستہ ہے، اور میں اس کو بھی اکثر بند رکھتا ہوں۔ اسے ایک بار بند کر لو پھر یہ ساری خدائی تمہاری ہے ——"

• یہ لمبی چوڑی چھت —— یہ ویران سا گول گنبد، تمہیں ڈر نہیں لگتا؟

ڈر مجھے نہیں تمہیں لگنا چاہیے۔ ایک کنواری لڑکی کا اس طرح ایک کنوارے نوجوان سے یوں ملنے آنا ظاہر ہے کہ اعتراض والی بات تو ہے ——"

"میں آج پہلی بار تو نہیں آئی ——"

"آج تم ایسے آئی ہو جیسے اکثر میرے خوابوں میں آیا جایا کرتی ہو ــــــ"

"تم دن میں بھی خواب دیکھتے ہو ــــــ"

"خواب دیکھنے کا سلیقہ آنا چاہیئے، پھر دن کیا رات کیا ــــ جب سے تمہیں دیکھا ہے میرے خوابوں نے دن اور رات میں تمیز کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

"خواب دیکھنے سے تو اچھا ہے کہ تم مجھے مستقل طور پر اپنے پاس رکھ لو۔"

"آج جو تم اِس طرح نہا دھو کے اور اِتنی سج دھج کر آئی ہو تو ظاہر ہے کہ یہ کہنے کے لیے نہیں آئی ہو کہ میں تمہیں مستقل طور پر اپنے پاس رکھ لوں، جب کہ تم ہی نہیں تمہارے پپا بھی جانتے ہیں کہ تم اُن کے ہمدم دیرینہ مرحوم پنڈت بہاراجی نند کے اکلوتے بیٹے مدھو سودن دت کی منگیتر ہو، اور اُس بیچارے نے تمہارے اِس پھٹیچر کالج میں صرف تمہاری ہی وجہ سے ایڈمیشن لے رکھا ہے ــــــ"

"آج ایک خاص بات بتانے آئی ہوں ــــــ"

"تم، میرا مطلب ہے تمہاری اپنی ذات سے زیادہ خاص بات بھی کوئی ہو سکتی ہے ــــــ؟"

"خاص بات یہ ہے مسٹر دت کہ شریمتی اگنی ہوتری اِس گنبد میں مری نہ تھیں ماری گئی تھیں اور قاتل تھا اُن کا اپنا اکلوتا بیٹا رام کرشن اگنی ہوتری یعنی اِس کالج کی انتظامیہ کا صدر ــــــ"

"یعنی اُن کا خون کر دیا گیا تھا ــــــ"

"نہیں زہر دے کر مار ڈالا گیا تھا ــــــ شوہر کی موت کے بعد وہ ستی ساد ھوی بڑھیا چند ایک ایسی نامراد اور ناقابل علاج بیماریوں کا شکار ہو گئی تھی کہ اُس کا مر جانا ایک طرح سے نجات تھی اُن موذی بیماریوں سے ــــ زہر تو اُن کے بیٹے ہی نے لا کر دیا ہو گا، مگر کھایا انھوں نے خود اپنی مرضی سے ٹھاکر جی کے پرساد میں ملا کر ــــــ سیمتی بتا رہی تھی کہ اُس کی دادی ماں کے مرجانے کے بعد اُس کے پتا جی کبھی پلنگ پر نہیں سوئے ــــــ اور ٹھاکر جی کی مورتی جو اب ان لوگوں نے اپنے شہر والے گھر میں استھاپت کر رکھی ہے ایک دم سیاہ پڑ گئی ہے۔ پیتل کی مورتی جسے ہر روز نہلایا دُھلایا جائے کبھی کالی نہیں پڑتی مگر وہ مورتی ایک دم سیاہ ہے ــــ جیسے پیتل کی نہ ہو کسی کالے دھاتو کی ہو۔"

"مورتیاں کالی بھی تو ہوتی ہیں بلکہ اکثر مورتیاں کالی ہی ہوتی ہیں مدھو سودن خود بھی تو بڑے کالے تھے ــــــ"

"کالے نہیں سانولے سلونے، میرے مدھو دن جیسے ــــــ"

"جتنے وہ کالے تھے رادھا اتنی ہی گوری تھی۔ میری رادھا جیسی ــــــ"

"اپنی سہیلی کا راز تم نے اِتنی جلدی افشا کر دیا ــــــ"

"کسی غیر کو تھوڑے ہی بتایا ہے اور تمہیں بھی اس لیے بتایا ہے کہ تم یہ گول گنبد چھوڑ دو کیوں کہ یمتی کی دادی کی بھٹکتی آتما کے بارے میں سنی سنائی باتیں اب میری سمجھ میں آنے لگی ہیں ——"

"تم سے ملنے اور ملتے رہنے کے لیے اس سے بہتر جگہ اس ہاسٹل میں دوسری کوئی ہو تو بتا دو ——"

"تو تم یہ گول گنبد نہیں چھوڑو گے ——؟"

"بالکل نہیں ——!"

●

اس روز بڑی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ مشہور ہے کہ دو روز کی جھڑی پورے طور پر برس کر ہی دم لیتی ہے۔ گھنے بلیوں والی وہ برکھا اور اماوس کی اندھی اندھیری رات —— گنبد کے آس پاس والی ساری چھت تالاب سی لگ رہی تھی —— اپنے گول کمرے کی دہلیز کے قریب آرام کرسی پر جما بیٹھا مدھوسودن سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ سامنے تپائی پر رکھی ایش ٹرے اس کی ادھ جلی سگریٹوں سے بھری جا رہی تھی۔ یادوں کا ایک کارواں تھا جو اس کے ذہن کی گلیوں سے کچھ اس طرح سٹ کر گزر رہا تھا کہ ہزار کوششوں کے باوجود نیند نہ آ رہی تھی ——

بیٹے نے ماں کو مار ڈالا —— میں نے بھی تو —— مگر میری سچویشن —— سچویشن کوئی بھی ہو، کیسی بھی ہو تم انکار نہیں کر سکتے کہ تمہارا مقصد بھی —— وہ بیمار تھیں۔ کینسر کی مریضہ ویسے بھی مر جاتیں —— تم نے ہی کیوں ——۔ ان کی تکلیف ان کے لیے ناقابل برداشت تھی —— تیرے لیے بھی تو —— تم رہائی چاہتے تھے ماں کی دن رات کی تیمار داری سے انھیں بھی تو رہائی کی ضرورت تھی —— مجھ سے کہیں زیادہ —— تم رہائی دلانے والے کون ہوتے ہو —— موت اور جنم اوپر والے کا ذمہ ہے —— یہ اسی کا مشورہ تھا —— ہر قاتل یہی دلیل اپنائے تو جرم و سزا کے مفہوم ہی بدل جائیں —— کتنی شانت تھی ان کی موت —— میرے آنسوؤں کو اپنی ساری کے پلو سے پونچھتے ہوئے انھوں نے کس طرح میرا شکریہ ادا کیا تھا —— ان کا نجات دہندہ —— ان کا اپنا بیٹا —— دو شیشیاں ایک جیسی —— ایک میں زہر دوسری میں دوا —— دونوں کا رنگ ایک جیسا تھا —— زہر والی شیشی کو انھوں نے خود چنا تھا —— تم دونوں شیشیاں وہاں ان کے سرہانے چھوڑ گئے تھے تاکہ ایک اثر نہ کرے تو دوسری —— یہ الزام ہے —— یہ غلط ہے کیپیشینٹ کلنگ قتل کے زمرے میں نہیں آتی —— تو پھر کیوں بھاگ آیا تھا اپنے پُرکھوں کی اس حویلی سے —— اس کی ایک ایک اینٹ مجھے کھانے کو دوڑتی تھی —— کیوں کہ تم قاتل تھے۔ مجرم تھے —— اپنی

منی کے قاتل ______

چھپ چھپ ۔ چھپ چھپ ۔

کوئی پانی میں چل رہا ہے ۔

کون ؟ ______ شریمتی اگنی ہوتری کا بھوت ____ یہ تیری اپنی ماں کا بھوت بھی تو ہو سکتا ہے ____ میری ماں مہا آتما تھی ______ مجھے یقین ہے کہ دور سورگ میں اپنے آبا کی حویلی میں بیٹھی بھی وہ میرا منگل ہی چاہتی ہوگی ______ ہر ماں اپنی اولاد کا بھلا چاہتی ہے ______ جیتے جی بھی اور مر کر بھی ____ مگر اولاد ____ دیوی ماں کے ناخلف بیٹے ____ لعنت ہے تیری ذات پر ____ تو قاتل ہے ____ اپنی ماں کا قاتل ____

پھپ ۔ چھپ ۔ چھپ ۔ چھپ ۔

یہ کون ہے بے وقت چل رہا ہے پانی میں ۔

اُس نے اٹھ کر دیکھنا چاہا مگر ۔ کسی انجانے خوف نے اُسے کرسی سے باندھے رکھا ۔ عین اُسی وقت سامنے کھڑکی میں ایک بھیگا ہوا کوا آ بیٹھا ۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے اڑا دینا چاہا ۔ مگر کوا اڑا نہیں ۔ وہیں جما رہا ۔ اُسے لگا کوئی غیر معمولی غیبی طاقت اُسے جکڑے جا رہی ہے ۔ ایش ٹرے میں پڑی جلی ادھ جلی سگریٹ کو ہاتھ میں لے کر اس نے کوے کی جانب اچھال دیا ، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا ۔ پھر اُس نے خالی ماچس کوے کو دے ماری ۔ نشانہ چوکا نہیں ماچس کوے کی چونچ پر جا لگی مگر وہ برابر اُسی طرح جما رہا ______

بھوت کا کوئی وجود نہیں ۔ بھوت کمزور دماغوں کا وہم ہے ____ وہم

تم اِس طرح کانپ کیوں رہے ہو ____ بڑے بہادر بنتے تھے ۔

مجھے تنہائی چاہیے ____ اونہہ

اِدھر یہ کمبخت کوا اور اُدھر دور چھت پر پانی میں کوئی چل رہا ہے ۔

پھپ چھپ ۔ چھپ چھپ ____ کیا یہ سب ۔ یہ منظر ۔ یہ پُراسرار آواز میرا وہم ہے ____ مگر یہ کیسا وہم ہے ۔ میں جاگ رہا ہوں کہ یہ محض کوئی ڈراونا سپنا ہے ____ اُس نے قریب ریک کے اوپر رکھی طلسمی کہانیوں کی موٹی سی کتاب اٹھا کر کوے کی طرف پھینکی ۔ کوا جھلّایا ۔ اُس نے اپنے پر پھڑپھڑائے ۔ پانی کی بوندیں اُس کے پروں سے اڑ کر مدھوسودن کے منھ پر آ گریں ____ کوا اپنی جگہ سے ہلا تو ضرور مگر پھر وہیں قریب ہی جم کر بیٹھ گیا ۔ ____

یہ خواب نہیں حقیقت ہے ۔ یہ سامنے کا منظر بھی اور باہر سے آتی چھپ چھپ کی آواز بھی ۔ اب وہ واقعی ڈر گیا ۔ زندگی میں شاید پہلی بار اُسے اِس

قدر خوف محسوس ہوا ـــــ پہلی بار نہیں، دوسری بار۔ پہلی بار تو وہ اِس طرح تب ڈرا تھا جب اُس کی ماں مری تھی ـــــ جب تک اس کا داہ سنسکار نہ ہوگیا۔ اس کی دیہہ جل کر راکھ نہ ہوگئی وہ کسی انجانے ڈر سے اِسی طرح خوف زدہ رہا تھا۔ مرجانے کے بعد بھی ماں اُسے حویلی میں گھومتی پھرتی دکھائی دیتی رہی تھی۔

اُس نے سوچا وہ مدد کے لیے چیخے۔ مگر آواز تو جیسے ـــــ بے سُدھ سا پڑا اب وہ سامنے بیٹھے کوے کے اپنی طرف جھپٹنے کا اِنتظار کرنے لگا۔ اُسے اب یقین تھا کہ کوا کوئی معمولی پرندہ نہ تھا۔ یم راج خود تھے۔

چھپ پھپ ـ چھپ پھپ ـ پھپ پھپ

پھر وہی آواز۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی ہو اب اُسے سامنے آجانا چاہیے ـــــ کم از کم اِس کوے سے تو ـــــ

اب پو پھٹ رہی تھی۔ نور کا تڑکا۔ ایسی ہی صبح تھی وہ جب اُس کی ماں نے اُس کی گود میں اپنے پران تیاگ دیے تھے ـــــ دُور ہاسٹل میں کوئی منچلا لڑکا کے۔سی۔ڈے کا ریکارڈ بجا رہا تھا ـــــ

تیری موت کھڑی ہو سرہانے بستر
تیری بالیں پہ ہو جائے وہ جلوہ گر
تجھے دیکھ لے جی بھر کے ایک نظر

میں جا رہا ہوں رادھے۔ اے کاش مرنے سے پہلے تجھے ایک نظر دیکھ سکتا ـــــ میں تجھے سب کچھ بتا دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ کم از کم تو مجھے مجرم نہ ٹھہراتی ـــــ

پھپ پھپ ـــ پھپ پھپ

اِدھر سامنے یم راج خود براجمان ہیں۔ میرے مقدر میں لکھی سانسوں کو گن رہے ہیں۔ شاید کچھ پہلے ہی آگئے ہیں ـــ اور اُدھر کوئی بھی ہو۔ تم آ بھی چکو ـــــ وہ ایک بار پھر چلانے کی غرض سے چیخا، مگر آواز تو جیسے ـــ ـــ بالآخر اس نے دیکھا کہ گیلے سفید لباس میں ملبوس کوئی اندر داخل ہوا اور دوڑ کر کھڑکی پر جھپٹا۔ آن کی آن میں نووارد نے کوے کو گردن سے پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے مروڑ کر اُس کے قدموں میں پھینک دیا۔

نووارد رادھا تھی ـــــ وہ بے ہوش ہو کر کرسی پر لڑھک گیا۔

اِس مابین سارا ہاسٹل جاگ اُٹھا تھا۔ وارڈن کے علاوہ چند ایک لڑکے اور ایسے لیکچرار بھی جو ہاسٹل میں ہی رہتے تھے وہاں جمع ہوگئے۔ وارڈن کہہ رہا تھا ـــــ "مجھے چوکیدار نے بتایا کہ تو بوکھلائی ہوئی بھاگتی بھاگتی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر ـــ ـــ ارے یہ کمبخت اندھا کوا اِدھر بھی آمرا ـــ ـــ اور یہ

حضرت ـــــــــ"

مدھوسودن بے ہوش ہو گئے ہیں ـــــ ابھی ہوش میں آجائیں گے۔

"مگر بیٹا رانی تو اتنے صبح سویرے ؟ ـــــ ایسی موسلا دھار بارش میں ؟ ـ تو ؟ ـ اکیلی ـــــ ؟ ـــــ"

مجھے ابھی ابھی خواب آیا تھا کہ یہ خطرے میں ہیں ـــــ مگر آپ کی یہ چھت پروفیسر صاحب، کتنے گڑھے ہیں اس میں۔ مجھے کوئی آدھا گھنٹہ لگ گیا ہوگا۔ بڑے دروازے سے یہاں تک پہونچنے میں ـــــ اس کی مرمت ضروری ہو گئی ہے ـــــ

ریاضی کے لکچرار نے بے جان کوے کو مدھوسودن کے قدموں میں پڑا دیکھ کر کہا۔ "اس کوے نے یہاں کس کس کو نہیں ڈرایا۔ کمبخت غالباً اندھا تھا "یا کوئی بھٹکی ہوئی آتما ـــــ جسے ہماری بہادر بیٹی نے نجات دلادی۔

کیپٹینٹ کلنگ ـــــ

آخری لفظ پر مدھوسودن چونک کر اٹھ بیٹھا۔ پھر جیسے نیند میں بول رہا ہو ـــــ "کیپیٹینٹ کلنگ قتل نہیں ہوتا نارد ھاجی ـــــ

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بارش تھم گئی تھی۔

بڑا سمجھدار تھا تمہارے اس گھر کو
بنانے والا۔ صُغرا جیسے ہی دونوں گھروں
کی چھتوں کے درمیان والی منڈیر پر آکر
بیٹھی۔ رام نے اُسے اپنے مضبوط بازوؤں
میں بھر کر اپنی چھت پر اتار لیا۔ صُغرا کے
گھر والی چھت رام کے گھر والی چھت کی
نسبت اونچی تھی لہٰذا اس کی طرف اِس منڈیر
پر چڑھنا نسبتاً آسان تھا۔ پورے دو اور
پانچ کی نسبت تھی۔ یعنی صُغرا کو چڑھنا ہوتا
تو معاملہ دو ہی فٹ کا تھا مگر رام کو چڑھنا
ہوتا تو بات پانچ فٹ بلکہ اس سے بھی کچھ
زیادہ ہی کی تھی۔ صُغرا جس کا قد بمشکل پانچ
فٹ ایک انچ تھا منڈیر سے سٹ کر رام والی
چھت پر کھڑے ہونے کی صورت میں دوسری
طرف سے بالکل اوجھل ہوتی۔ یعنی اُسے
بغیر کوشش کے دوسری طرف سے دیکھا
نہ جا سکتا تھا۔

"میں مرد ہوں اس لیے میرا ہی تمہاری
چھت پر اُترنا بنتا ہے۔"

"اُترنا اونچائی سے نیچے کی طرف
لڑھکنے کو کہتے ہیں۔"

وہ مُسکرا دیتا اگرچہ بات اس عاشقانہ
پس منظر میں قہقہہ لگانے والی ہوتی۔ مگر
قہقہہ میں آواز ہوتی ہے اور آواز آدھی
رات کے اس برفیلے سناٹے میں ۔ ۔ ۔ ۔

بھرا بھرا گداز کنوارہ صغرا کا مہکتا بدن رام سنگھ کے بازوؤں میں آتے ہی بے وزن ہو جاتا اور وہ کئی کئی منٹ اُسے ایسے ہی اپنی چھت پر لیے لیے پھرتا گویا وہ کوئی بھرپور جوان چھوکری نہ ہو ہوا بھری ربڑ کی گُڑیا ہو۔ سردیوں کی راتوں کے گونگے سناٹے اور دو ارمانوں بھرے نابالغ بچے۔

"نیچے اپنے بند کمرے میں لحاف میں پڑے پڑے میں سردی سے جیسے ٹھٹھری جا رہی تھی، مگر اِدھر اُوپر کُھلے میں تمہارے ساتھ ــــ تم تو جیسے ــــ نجانے تمہارے بدن میں ــــ مجھے ایک دم گرما دینے والا ایسا کون سا آلہ لگا ہے"

"ہمارا پیار کوئی معمولی چنگاری نہیں جانی بلکہ ایک الاؤ ہے جس کی تپش میں" وہ اُسے چوم لیتا۔

پیارے پیارے معصوم بچے دو دو تین تین گھنٹے ایک دوسرے سے چمٹے یُونہی بے سر پیر کی ہانکا کرتے۔ محبت کی باتیں کیسی ہوتی ہیں دونوں نہیں جانتے تھے۔ مگر انہیں کوئی بتانے والا ہوتا تو بتاتا کہ محبت کی باتیں دراصل ایسی ہی ہوتی ہیں اور محبت کسی منظم ساخت، ترتیب، آداب، ضابطہ یا شائستگی کی پابند نہیں ہوتی۔ جب دو دِل ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوں کہ انہیں ایک دوسرے کی دھڑکنیں تک سنائی دینے لگیں تو کچھ کہنا یا سنانا بے معنی ہو جاتا ہے۔ کسی بھی گہرے جذبے میں الفاظ اچھے بھلے آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں بھلے ہی وہ الفاظ کا سوداگر ہو۔ یہ بیچارے تو معصوم بچے تھے۔

"بھابی بتا رہی تھی کہ آج کل کے چھوکرے بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی لڑکی ان کے ہاتھ لگ جائے تو اس کے کپڑے تک پھاڑ دیتے ہیں۔ ننگی کر دیتے ہیں"

"تم نے بھابی جان کو بتایا نہیں کہ میں اس قسم کا چھوکرا نہیں ہوں"

"وہ تو تُم کو تم سے بھی زیادہ جانتی ہیں۔ وہ نہ ہوں تو میں تمہارے پاس اس طرح آ جا سکوں"

"تمہاری بھابی جان واقعی بہت اچھی ہیں"

"میری ہی کیوں۔ وہ تمہاری بھی تو ہیں"

"میری تو پہلے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں ۔ تم اُن کی بڑی عزت کرتے ہو ۔ وہ جنم کی ہندو ہیں۔ شاید اس لیے ـــــ خیر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ وہ دوسرے لڑکے ایسے کیوں ہوتے ہیں اور تم ویسے کیوں نہیں ہو؟"

"میں کوئی آج کل کا چھوکرا تھوڑے ہی ہوں، میں تو ماضی کے اُس دور کا سردار ہوں جانی جب بہادر لوگ جن کا سر مغرور اور سفاک حاکموں کے بالمقابل بھی کبھی نہ جھکتا تھا۔ حُسن کے سامنے سرنگوں ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے ۔ شادی سے پہلے میں صرف تمہارے بدن کی اس کنواری خوشبو ہی کا حق دار ہوں۔"

"شادی کے بعد!"

"بعد کی بات اور ہے ۔ تب تمہارے ہی نہیں، میں اپنے کپڑے بھی اُتار پھینکوں گا"

"یعنی ہماری شادی کے بعد تم بھی ـــــ بڑے بدمعاش ہو جی۔"

"بھابی سے پوچھ لینا ۔ شادی کے بعد یہ سب ضروری ہوتا ہے۔"

"بھابی تم سے خفا ہیں!" دوسری رات بھی جب وہ اسی طرح ملے تو صُغرا نے کہا:

"میں نے ایسا کیا کیا ہے ۔؟"

"تم نے اُن سے کیوں کہا کہ اُن کے بال بہت سُندر ہیں ارے بُدھو جانتے نہیں ـــ بنگلہ میں بال، کسے کہتے ہیں۔"

بات قہقہہ لگانے والی تھی مگر قہقہہ بلند آواز نہ ہو تو بات نہیں بنتی اور آواز آدھی رات کے اِس بر فیلے سناٹے میں . . . . .

نیلوفر بھابی یعنی سابقہ مِس مالتی بھٹاچاریہ دل و جان سے چاہتی تھی کہ اُس کی چہیتی نند صغرا کی شادی رام سنگھ سے ہو ۔ اس لڑکے کو اُس نے جتنی بار دیکھا تھا ۔ اُتنی ہی بار اُس میں غیر معمولی خوبیاں پائی تھیں اور طے کر لیا تھا کہ وہ ان کی بھولی بھالی نند کے لیے ہر لحاظ سے یوگیہ ور ہے ۔ چونکہ وہ خود بھی ہندو نژاد تھیں لہٰذا اپنے سنسکاروں کے زیرِ اثر قطعی نظر انداز کیے بیٹھی تھیں کہ صغرا مسلمان بچی ہے اور رام سنگھ ایک ہندو گھرانے کا چشم و چراغ ہے ۔ دونوں میں پیار کا بیج بھی بھابی ہی نے بویا تھا ۔ اسی کے مشورے پر رام نے صغرا کو پڑھانا شروع کیا ۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ دونوں

ایک دوسرے کو دل وجان سے چاہنے لگے ہیں اور یہ تعلق اب محض استاد شاگرد ہی نہیں رہا تو وہ کھلے ہندوں ان کے پیار کی حمایت میں جُٹ گئیں۔ جب کبھی مناسب موقعہ ملتا رام کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتیں "اے کاش یہ لڑکا مسلمان ہوتا۔ اپنا ہم مذہب ہوتا۔"

اس قسم کے جملے بڑی اماں راشدہ بیگم اور چھوٹی ماں آمنہ بیگم کے سامنے وہ درجنوں بار دُہرا چکی تھیں۔ دلاور خاں کے علاوہ جس کے سامنے اس قسم کی کوئی بات گھر کا کوئی فرد نہ کر سکتا تھا۔ خاندان کے باقی سارے افراد نیلوفر سے متفق تھے۔

صغرا اور رام، ایک آدرش جوڑے کے طور پر اکثر گھر میں گفتگو کا موضوع بن جاتے۔ محبت کا یہ کھیل جو بچپن میں شروع ہوا تھا۔ اب ایک تناور پیڑ بن چکا تھا۔ اور دو کچی کونپلیں اب اپنی بھر پور جوانی کی خوشبوؤں اور رنگینیوں سے شرابور ہو چلی تھیں۔ دھیرے دھیرے ایسا ماحول بن گیا کہ دلاور خان کے علاوہ گھر کے دوسرے افراد بھی نیلوفر بھابی کے ہم خیال ہو گئے۔

ایک دن نیلوفر نے رام کو بتایا "اباکے بیے میں آج بھی مالتی بھٹاچاریہ ہوں تین غازی بچن کر میں نے اسلام سے اپنی وفاداری کا ثبوت نہ دے دیا ہوتا تو شاید آج کل اِس فضا میں یہ لوگ مجھے کافرہ یعنی ہندوزادی کہہ کر گھر سے بے دخل کر دیتے۔ عالم مجھ سے پیار کرتا ہے۔ مگر وہ میرا شوہر بعد میں ہے اپنے باپ کا بیٹا پہلے اس کی کیا مجال جو باپ کے سامنے سر اٹھا کر بات بھی کر سکے۔ سرجی لفظ کے اصلی معنوں میں راجپوت سردار ہیں۔ مسلمان راجپوت دوسرے مسلمانوں سے کہیں زیادہ کٹر ہوتے ہیں۔ ان کی جڑیں راجپوتانہ کی اُس دھرتی میں گڑی ہیں جو کبھی ہندو راجپوتوں کی ملکیت تھی اور ان کے پرکھے بھی کبھی ہندو راجپوت سردار ہی تھے۔

رام نے جب جاننا چاہا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہندو لڑکی ہے دلاور خان نے انھیں بہو کے طور پر قبول کیسے کر لیا تو وہ تقریباً رو دی۔

"مصلحت بڑی چیز ہوتی ہے رام۔ بڑے سے بڑا آدمی مصلحت کا شکار ہو جاتا ہے۔ تمہارے عالم بھائی میرے والد کے ماتحت تھے۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اور ہماری شادی کی وجہ بھی ہمارا ایک دوسرے کے لیے پیار ہی تھا مگر میرے اس

گھر میں قبول لے جانے کی وجہ ہمارا پیار نہ تھا میرے بابا کا رتبہ اور اُن کا وہ رسوخ تھا جس کی وجہ سے عالم آہ اِس سارے علاقے میں اُمسی چائے کمپنی کے واحد ڈسٹری بیوٹر ہیں۔ جس میں کبھی ایک معمولی سی ملازمت کرتے تھے۔ اِس گھر کی بے پناہ خوشحالی کی وجہ سے اباجان کی بڑی نوکری نہیں تمہارے عالم بھیا کا کاروبار ہے۔

"پھر بھی بھابی کبھی کبھی تو یہ لوگ!"

"یہ سوال پہلے بھی ابا کے کسی لنگوٹیے نے اٹھایا تھا۔ جانتے ہو اُنھوں نے کیا جواب دیا تھا؟"

"یقیناً کوئی شرمناک بات"

"ہندو کی لڑکی گھر میں ڈال لی ہے۔ ہندو کو لڑکی دی تو نہیں"

"واقعی بڑے شرم کی بات ہے"

"ہے نہ رام۔ میں بھی لجا سے پانی پانی ہوگئی تھی۔ مگر کیا کرتی۔ دِل سے مجبور تھی اور پتنی کے علاوہ ایک ماں بھی تھی"

"نفرت کی یہ آگ جو کہیں شعلوں کی طرح نمایاں ہے تو کہیں اپلوں میں چھپی چنگاریوں کی طرح سُلگ رہی ہے نجانے ہمیں کہاں لے جائے گی؟"

"میں تمہارا کرب سمجھتی ہوں بھیا۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارا پیار سچا اور پوتر ہے اور سچے پریمی بھگوان کو بڑے پیارے ہوتے ہیں"

اس دن رام کی دکان پر خاصی اچھی بکری ہوئی تھی۔ دیر تک گاہک میٹھے سامان بندھواتے رہے تھے۔ رام نے دکان بند کی تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ دن بھر کے کام سے فارغ ہوکر وہ خراماں خراماں گھر لوٹ رہا تھا کہ اُسے اچانک یاد آگیا کہ اس شام تو اظہار بھائی کے ہاں دعوت تھی۔ جس میں اُسے خاص طور پر بلایا گیا تھا وہاں رشید بھی ہوگا اور ..... صُغرا بھی۔

عید کے متبرک دن ساجدہ بھابی جیسی سویّاں کوئی نہیں بناتا۔ سویّوں والی اس عید کے تہوار پر وہ تب سے اظہار اور ساجدہ کا مہمان تھا جب سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے گھر جانے والا راستہ چھوڑ دیا اور نو بجتے بجتے قاضی محلہ پہنچ گیا۔

جیسے ہی اس نے دروازے پر دستک دی کواڑ کھل گئے۔ کھولنے والا خود اظہار

تھا۔ مگر گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اُسے لگا کہ ماحول کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ لوگ جو پہلے ہی سے وہاں بیٹھے تھے اسے دیکھ کر اب ہکا بکا سے رہ گئے تھے۔ کسی نے آگے بڑھ کر نہ اس کو خوش آمدید کہا نہ سلام دُعا رہی بلائی۔ باہر کھڑے کھڑے اس نے ان لوگوں کو بلند آواز میں چہکتے اور خوشیاں مناتے سُنا تھا۔ پھر یہ ایکا ایک کیا ہو گیا۔ یہ بھلے لوگ اچانک پتھرا سے کیوں گئے ہیں۔ اس کے سامنے صغرا کھڑی تھی صغرا اس کی اپنی صغرا۔ باقی کے بھی سب اس کے اپنے ہی لوگ تھے۔ کوئی بھی نیا یا غیر مانوس چہرہ نہ تھا۔ سب کے سب جانے پہچانے لوگ تھے۔

دلاور خاں صاحب، عالم خاں اور رشید، بڑی اماں راشدہ بیگم، چھوٹی اماں آمنہ بیگم، نیلوفر اور ساجدہ، اُس نے تصویر کو پہچاننے کی دوبارہ کوشش کی۔ وہی پرانی جانی پہچانی تصویر۔ آنکھوں کا اجنبی پن جو پہلی نظر میں اُسے بھی کسی قدر بوکھلا گیا تھا۔ دھیرے دھیرے دوستانہ مسکراہٹوں میں بدلنے لگا۔ اب اُسے ہر آنکھ میں وہی پہلے والی دوستی نظر آنے لگی۔ اس نے یہ تصویر کئی بار دیکھی تھی۔ اور اس کے خدوخال سے وہ پورے طور پر مانوس تھا۔

اب ہر کوئی سنبھل گیا تھا وہ خود بھی۔ ہر آنکھ کی سختی پگھل کر نرم و تر ہو گئی تھی اور پتھر کے بے جان مجسمے پھر سے جاندار ہو گئے تھے۔

اس غیر مواقف منظر کو مواقف بننے میں کتنی دیر لگی وہ ابھی اندازہ بھی نہ کر پایا تھا کہ رشید نے آگے بڑھ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ چھوٹی اماں آمنہ بیگم نے بھی آگے بڑھ کر اس کی بلائیں اُتاریں۔

ساجدہ نے بڑے فخر سے اُٹھ کر اپنے شوہر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "لاؤ میری شرط کے روپے"

اظہار نے دس دس کے پانچ نوٹ بیوی کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا "اللہ قسم سجدے آج یہ شرط ہارنے میں جو خوشی اور اطمینان مجھے محسوس ہو رہا ہے وہ شرط جیتنے میں کبھی نہ ملتا۔ جب تمہارا اپنا بھائی اور گور چرن بھی نہ پہنچ سکے تو میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ رام بھی نہ آ سکے گا۔ شہر میں اتنی ہے کہ دِن کے وقت بھی ہندو مسلمانوں اور مسلمان ہندوؤں کے محلوں میں جانے سے کتراتے ہیں۔ تمہاری

ضد کہ اگر اس نے وعدہ کیا ہے تو ضرور آئے گا۔ ہر صورت میں آئے گا۔ سچ مچ بڑی خوبصورت تھی۔"

"مجھے یقین تھا اور تم جانتے ہو یقین بڑی چیز ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر ساجدہ نے روپے جوں کے توں آدھے آدھے صغرا اور نیلوفر کی جھولیوں میں ڈال دیئے۔ "میں دس رکھ لیتی ہوں۔ بیس بیس تم رکھ لو" پھر سب کی طرف مڑ کر بولی۔ "مجھ سے بھی زیادہ صغرا اور نیلوفر بھابی کو یقین تھا کہ رام بھائی ضرور تشریف لائیں گے۔"

اب دلاور خاں نے بھی خفت مٹانے کے لیے آگے بڑھ کر رام کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "راجپوت ہو کر میں راجپوتی وچن کی اہمیت بھول گیا تھا بیٹے۔ اللہ تمہیں لمبی عمر دے۔"

چند ہی لمحوں میں اچھے لوگوں کی وہ محفل پھر مہکنے چہکنے لگی۔ ساجدہ ایک بڑی سی طشتری میں سویاں پروس لائی۔ جنھیں سب سے پہلے اظہار نے خود چکھا۔ پھر رشید نے اور پھر رام نے اور بعد میں تینوں نے مل کر۔

جانتی ہو دادی ماں" رام نے راشدہ بیگم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔" ان لوگوں نے مجھے جوٹھی سویاں کیوں کھلائیں۔ اس لیے کہ میں شک نہ کروں۔" پھر رشید سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تیرے ہاتھ سے زہر بھی پی لوں گا۔ پیار سے تو اثر نہیں ہوگا۔ تو میرا دوست ہے اور دوست۔ بھگوان قسم۔"

"اس کا گلا رُندھ گیا۔ جذبہ گہرا ہو تو الفاظ کہاں ساتھ دیتے ہیں۔

سب کی آنکھوں میں موتی تیرنے لگے۔ راشدہ بیگم اور دلاور خاں صاحب کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

جب سب لوگ کھا پی چکے اور ہنسی مذاق کا دور شروع ہو گیا تو گھر کے بزرگ یعنی رشید کے ابو امی اور دادی ماں جوانوں کی محفل چھوڑ کر اندر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد وہ باتھ روم میں گیا تو اس نے سُنا کہ بڑی اماں اپنے بیٹے اور بہو سے محوِ گفتگو ہیں۔ اپنا نام سُن کر وہ ٹھٹھک گیا۔

اماں کہہ رہی تھیں۔" ہائے اللہ کتنا پیارا بچہ ہے۔ مجھے تو دُکھ ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ کمبخت کافر ہے اور دوزخ کو جائے گا۔ میرا بس ہوتا تو کلمہ پڑھا کر اسے سچا

مومن بنا دیتی اور عاقبت سدھر جاتی غریب کی۔"

آمنہ بیگم فرما رہی تھیں "انہیں سمجھاؤ نہ اماں۔ ہم بیٹی والے ہیں۔ رسول کی خدمت کا اس سے بڑھیا موقعہ پھر کب ملے گا۔ میں ہوں تو عمر کی تم دونوں سے چھوٹی مگر دنیا کا کچھ میں نے بھی دیکھا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ہماری صغرا رام پر جان چھڑکتی ہے۔ اور یہ محض اُستاد شاگرد کا رشتہ نہیں۔ بہت ہی گہرے قسم کا لگاؤ ہے۔ حیادار مسلمان بچی ہے اسی لیے چپ ہے۔"

دلاور خاں بولے "آپ ٹھیک فرماتی ہیں بیگم اور اماں جی آپ سے بھی میں سو فیصد متفق ہوں۔ مگر ابھی آج کے موجودہ حالات میں یہ قطعی ممکن نہیں ہے۔ اب چند ہی دنوں کی تو بات ہے۔ بٹوارہ ہوا نہیں کہ —— پھر کون جائے گا یہاں سے۔ تم دونوں دیکھ لینا۔ اِدھر کے سب ہندو مسلمان اُدھر کے سب مسلمان ہندو ہو جائیں گے۔"

بڑی اماں نے آہ بھر کر کہا۔ کیسے برے دن آ گئے ہیں۔ انسان کی جان کی تو کوئی قیمت ہی نہ رہی۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے بیٹے کہ کہیں اور خون خرابہ نہ ہو۔ اس سے تو یہی بہتر ہو گا۔ جانے مجھے ابھی اور کیا کچھ دیکھنا ہے۔ وعدہ کرو دلاور بیٹے کہ اگر واقعی ایسا ہوا تو رام کے اسلام قبول کرتے ہی تم اِسے اپنی فرزندگی میں لے لوگے۔"

دلاور خاں کا جواب سننے بغیر وہ وہاں سے ہٹ گیا اور چپ چاپ بیٹھک میں لوٹ آیا۔ بزرگوں کی باتیں سن لینے کے بعد اب وہ مسلمانوں کے کنبہ کی نوجوان پیڑھی کی باتیں سن رہا تھا۔ کتنا فرق تھا دونوں کے لہجوں اور سوچنے کے انداز میں تین نوجوان مرد اور تین جوان عورتیں۔ تین نہیں دو۔ "میری صغرا کوئی عورت تھوڑے ہی ہے۔"

خوشی کا موقعہ ہو تو ہم عمر لوگوں کی باتوں کا سلسلہ بغیر کسی مخصوص موضوع کے بھی جلدی نہیں ٹوٹتا۔ وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ قصے کہانیاں سنا رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا۔

"صغرا کو پانا کتنا آسان ہے۔ میں آج مسلمان ہو جاؤں تو وہ مجھے آج ہی مل سکتی ہے۔ ابو کو بھی صرف میرے مذہب پر اعتراض ہے۔ مجھے وہ بھی پسند کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ، بڑے چھوٹے میرے دوست ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ جوان پیڑھی مجھے

ایسے ہی قبول کرنے کو تیار ہے اور بزرگ لوگ تھوڑی قربانی چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔
آج جو قربانی ہے۔ کل یہی مجبوری بھی بن سکتی ہے۔"

"تم چپ چاپ کیوں ہو۔ اندر سے ضرور کچھ سُن کر آئے ہو؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں" پھر اس نے ساجدہ نیلوفر اور صغرا سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا "تم لوگوں کی شادی ہوتے ہی تم لوگوں کا نام بدل جاتا ہے۔ ذات بدل جاتی ہے۔ دھرم بدل جاتا ہے۔ یہ تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

رام کے اس سوال نے بات چیت کا رخ بدل دیا۔ سارا ماحول بدل گیا۔

"یہ یُگوں پرانی ریت ہے بھیّا" نیلوفر بھابی نے فرمایا۔ "مگر کسی یُگ میں بھی یہ عورت کی پرابلم نہیں رہی۔ مگر میں پوچھتی ہوں ایسا کیوں ہے، ہندو کیوں نہیں۔ جب میں نے عالم سے شادی کی تھی تو میرا ایمان تھا کہ میری انفرادیت، میری ذات، میری شخصیت کا بھی کچھ مطلب ہے۔ میں حیران ہوں کہ اِس قسم کے سوالات اب میرے ذہن میں کبھی نہیں اُٹھتے۔"

ساجدہ بولی "میرے ذہن میں یہ سوال روز اٹھتا ہے۔ نام اور دھرم تو میرا بھی بدلا ہے مگر مجھے بھی یقین ہے کہ تمہارے یہ ڈاکٹر بھائی، سید اظہار الحسن رضوی صاحب حق خود ارادیت کے بڑے اُپاسک ہیں۔ ڈاکٹر ہیں لہٰذا جانتے ہیں کہ ہندو مسلمان اور عیسائی کے خون کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ میں ان کی پرستار اور یہ بھی مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ اور میرے صلیب پہنے رہنے میں کوئی برائی نہیں دیکھتے۔"
اور انہوں نے اپنی چھاتی کی اتھانوں کے درمیان سے سونے کی زنجیر کھینچ کر دکھائی جو وہ ہر وقت پہنے رہتی تھیں۔ مگر گھر میں اظہار بھائی کے سوا غالبا کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ وہ کراس پہنے رہتی ہیں۔ "میں جب کبھی اپنے بچے کو پیٹر محمود کہہ کر بلاتی ہوں تو لوگ جو جانتے ہیں کہ میں ایک عیسائی لڑکی ہوں جس نے ایک مسلمان سے بیاہ کیا ہے مُسکرا دیتے ہیں۔ وہ اسے مذاق سمجھتے ہیں مگر خدا گواہ ہے کہ میرے تئیں میرے بیٹے کا یہی نام ہے۔ شاید سبھی بیٹے بیٹیوں کے بھی اسی قسم کے نام ہونے چاہیے تھے مگر نہ جانے ایسے کیوں نہیں ہوا۔"

اس رات وہ کافی دیر سے گھر پہنچا۔ وہ لوگ ... نے کی نکڑ تک چھوڑنے

آئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی وہ بستر میں گھس گیا۔ گھر والوں نے سمجھا کہ وہ تھک کر سو گیا ہے مگر نیند آج رات نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا۔ اس نے عشق بھی کیا تو کہاں۔ مگر کون نئی بات کی تھی اُس نے۔ عشق تو ہوتا ہی غلط جگہ پر ہے۔ یہی تو اُس کی روایت ہے۔

میں کوئی ایسا کٹر قسم کا مذہب پرست نہیں ہوں۔ کبھی مندر نہیں جاتا کبھی کسی پوجا پاٹھ یا یگیہ وغیرہ میں شامل نہیں ہوتا ہندو دھرم کا ایک بھی منتر مجھے نہیں آتا۔ سب ٹھیک ہے مگر اس میں کیا تُک ہے کہ میں محض اِس لیے مسلمان بنا دیا جاؤں کیوں کہ مجھے صغرا سے عشق ہے اور صغرا مسلمان ہے۔ آدمی عورت کی طرح اپنا نام نہیں بدلتا اور عورت بھی صرف نام ہی بدلتی ہے دوسرا کچھ نہیں۔

ابو، ماں، بڑی اماں، نیلوفر بھابی، ساجدہ بھابی۔ عالم، اظہار اور رشید سب میرے خیر خواہ ہیں۔ میرا بھلا چاہتے ہیں۔ اور صغرا میری صغرا۔ میری اپنی۔ میری۔ میری۔ سوچتے سوچتے جب اُس کا دماغ شل ہو گیا تو وہ صغرا کو اپنے ساتھ چپٹا کر سو گیا۔

پرکاش اور چھایا

پرودھن کو ایجوکیشنل انسٹیچیوٹ کے ہندی ڈیپارٹمینٹ کی لیکچرار مس چھایا ماتھر کو انگریزی ڈیپارٹمینٹ کے نوجوان ریڈر اور ہیڈ، ڈاکٹر پرکاش پنڈت سے عجیب قسم کی چڑ تھی۔ آکسفورڈ کا یہ بانکا ڈی لٹ اس کی نظر میں ہلکی پھلکی طبیعت والا ایک شیخی خور ڈینڈی تھا اور اِس قماش کا ہر فرد اُسے ایک نظر نہ بھاتا تھا۔ اِس ناپسندیدگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر پرکاش ہی کالج کی ایک واحد ہستی تھا جسے سب احتراماً یا غالباً آکسفورڈ سے اسکی وابستگی کی وجہ سے پروفیسر کے القاب سے مخاطب کرتے تھے، جب کہ کالج کا ہر دوسرا معلم سر ہوتا یا مس۔ کالج کے لڑکے لڑکیوں اور دیگر نوجوان معلمین میں بھی پرکاش حد سے زیادہ پاپولر تھا۔

کسرتی بدن والے بلند قامت پرکاش کو قدرت نے اچھی صحت اور دلکش شخصیت سے نوازا تھا۔ وہ خوش شکل اور خوش لباس تو تھا ہی، طبیعت کے معاملہ میں بھی بڑا شگفتہ دل واقع ہوا تھا۔ وہ ہر وقت مسرور اور شادماں رہتا۔ اس کی کھلی ہنسی اور دلفریب مسکراہٹ جو چھایا کی نگاہ میں ایک کھوکھلی

اور کلمی ویٹیڈ اشتہاری شے تھی۔ ہر کسی کو پسند تھی۔ وہ جس محفل میں ہوتا وہ کھل اٹھتی۔ خوش رہنا اور خوشیاں بانٹنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

چھایا بھی شکل وصورت اور جسمانی بناوٹ کے اعتبار سے اپسرا ہی لگتی تھی، مگر سب حیران تھے کہ وہ گھمبیرتا کو ہر وقت کچھ ایسے اوڑھے رہتی گویا ماتم میں ہو۔ وہ جب کبھی بھولے بھٹکے سٹاف روم میں داخل ہوتی پرکاش کے قہقہے تھم کر رہ جاتے اور زبان گنگ ہو جاتی۔ یہ ایک عجیب کیفیت تھی جسے سٹاف کے تقریباً سبھی ممبروں نے نوٹ کیا تھا۔ مگر بات کسی نے بھی نہ اٹھائی تھی۔ اخلاق کے معاملے میں اس انٹی چیوٹ کے فرد بے حد محتاط رہتے تھے۔ جب پرکاش کے علاوہ دوسرے سٹاف ممبر بھی چپ ہو جاتے تو چھایا کو لگتا کہ اس کا سٹاف روم میں آنا سب کو ناگوار گذرا ہے۔ یہ اکثر ہوا تھا اکثر ہوتا تھا۔ چھایا دیوی کی ساتھی لیکچرار خواتین لیلا امرت، کلدیپ اور سطوت سبھی پرکاش پر جان چھڑکتی تھیں اور حیران تھیں کہ چھایا اور پرکاش کے مابین ایسی کون سی بات، کس قسم کا جذبہ تھا جو دونوں ایک دوسرے سے بلا وجہ کھنچے رہتے تھے۔

پرکاش کالج اپنی کار میں آتا تھا۔ بغیر چھت والی یہ بانکی ریڈ سنگر اس کے مرحوم نانا رائے بہادر کرشن رائے جی کا تحفہ تھی۔ لمبی ڈگی کے علاوہ اس اسپورٹ ماڈل کار میں صرف دو سیٹیں تھیں۔ ایک ڈرائیور کے لیے اور دوسری ــــــ کرشن رائے جی نے کہا تھا "یہ دوسری سیٹ تیری دلہن کے لیے ہے۔ کبھی کبھی تم اس میں میری بیٹی یعنی اپنی ماں کو بھی بٹھا سکتے ہو اور اپنے کسی مرد دوست کو بھی۔ مگر دوسری بیٹھنے والی تیری دلہن ہی ہونی چاہیے۔

پرکاش نانا کا دیا ہوا وعدہ دہراتا اور .... یہ گاڑی واقعی ایک مرد اور ایک عورت کے لیے بنی ہے۔ ایسے مرد عورت جو اگر میاں بیوی نہ ہوں تو کم از کم ایک دوسرے سے پیار ضرور کرتے ہوں۔ میں کسی لڑکی کو اس گاڑی میں اپنے ساتھ نہیں بٹھاتا کیونکہ گاڑی کی دوسری سیٹ کی حقدار ابھی نہیں ملی۔"

چھایا قریب ہوتی یا کہیں دور ہی سے دکھائی دے جاتی تو سرد آہ بھر کر کہتا۔ ملی بھی ہے کمبخت تو نہ ملنے کے برابر۔

وہ کالج میں اکیلا ہی آتا تھا مگر لوٹتی بار کم از کم چار پانچ سواریاں جو اکثر لیڈیز

ہوتیں ضرور لادے جاتا۔ کسی لیڈی لیکچرار کو اس کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہ ہوتی۔ ان کی کتابیں، کاپیاں، تھیلے یا پرس وغیرہ البتہ اپنے ساتھ والی سیٹ پر وہ بخوشی رکھوا لیتا۔ ایک بار کلونت نے اس سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کی تھی تو پرکاش نے متفکر ہو کر کہا تھا۔

"تم نئی ہو کلونت۔ سوچ سمجھ لو۔ پھر نہ کہنا تمہارے دارجی نہیں مانتے۔ یہاں سب کو علم ہے کہ یہ سیٹ میری ہونے والی یعنی میری اردھانگنی کے لیے ہے اور یہ طے ہے کہ جب بھی کوئی لڑکی اس سیٹ پر بیٹھے گی تو میں اُسے سیدھا اپنے گھر لے جاؤں گا اور "ایک دم شادی کر لوں گا۔" باقی کا فقرہ گلدیپ نے پورا کیا۔ "تیری ایسی کی تیسی" کہتے ہوئے کلونت چپ چاپ پیچھے دوسری سواریوں کے ساتھ جا بیٹھی تھی۔ پرکاش نے مسکین سی صورت بنا کر کہا تھا۔ "دیکھو لیڈیز اینڈ جنٹلمین پرکاش صاحب اِسی ایک ہفتہ میں دوسری بار ٹھکرائے گئے ہیں۔"

سطوت نے فقرہ چست کیا "تو بال رکھ لے۔ داڑھی بڑھا کر پگڑی پہن لے۔ کچھ ڈاکر پان سے لیس ہو کر امرت چکھ لے پھر کلونت نہ بیٹھے تیرے ساتھ تو کہنا سطوت مومن نہیں کافر ہے۔"

کلونت نے چڑ کر کہا تھا "تو کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔"

"یہ کلمہ پڑھ لے ابھی اس کے حرم کی ملکہ بننے کو تیار ہوں۔"

ملکہ!

چلو خادمہ سہی۔

دوسرے دن یہ بات دلیپ سنگھ راجپوت نے سُنی تو چہکا۔ مجھ سے کہتی تو ابھی دھریندر خان بن جاتا۔ اور اس نے واقعی پگڑی اتار دی۔ اس کے بال نہیں تھے اور داڑھی پہلے ہی کافی حد تک بڑی تھی۔

"تو بے پیندے کا لوٹا ہے۔ کبھی سکھ بنتا ہے تو کبھی مسلمان۔"

کالج میں کوئی راجپوت کیا نہیں ہے پیارے!

ایک دن کالج میں ایک کلچرل فنکشن تھا۔ جس میں کالج کے ٹیچنگ سٹاف کے قریب قریب ہر فرد (مرد و زن) نے حصہ لیا تھا۔ چھایا کے کلاسیکی نغموں سے سامعین

جھوم جھوم گئے تھے مگر میدان پھر بھی پرکاش ہی کے ہاتھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مونو ایکٹنگ سے ہنسا ہنسا کر لوگوں کو دُہرا کر دیا تھا۔ فنکشن کافی دیر تک چلتا رہا۔ فنکشن کے بعد لوگ اِدھر اُدھر لفٹ کے لیے بھاگ رہے تھے جو باقی بچے تھے انہیں گوپال اپنی ریڈ سنگر میں لاد لاد کر باری باری قریبی بس سٹینڈ پر پہنچا رہا تھا۔ آخری پور لینے آیا تو اس نے دیکھا کہ میری لیدا اور امرت کے علاوہ چھایا بھی اس کی منتظر ہے۔

پرکاش نے بڑے لطف سے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور چھایا کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھالیا۔ باقی کی تینوں لیکچرار پُر بہار قہقہے لگاتی ہوئیں پیچھے ڈگی میں بیٹھ گئیں۔ چھایا کے لیے پرکاش کی گاڑی میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ وہ اس سیٹ میں بیٹھنے والی سے وابستہ کرتی سے ناواقف تھی۔ پیچھے بیٹھی تینوں سہیلیاں اس نئی ڈویلپمنٹ کے مزے لے رہی تھیں۔ ان کے بس سٹینڈ پر جیسے ہی کار رُکی تو وہ تینوں اُتر گئیں۔ چھایا نے اترنا چاہا تو پرکاش نے یہ کہہ کر گاڑی چلا دی کہ چونکہ اس کی اور چھایا جی کی منزل ایک ہی ہے لہٰذا وہ ابھی بیٹھی رہیں۔

دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔

"آپ اتنا اچھا گاتی ہیں یہ کسی کو پتا نہ تھا"

"آپ چیپلن کی اتنی کامیاب کاپی کر سکتے ہیں، یہ میں بھی تو نہ جانتی تھی"

تھوڑی دیر بعد چھایا نے پوچھا۔ آپ کو میرے گھر کا پتہ معلوم ہے؟

پرکاش اُدھر دیکھے بغیر گاڑی چلا رہا تھا۔ نہیں، مگر مجھے اپنے گھر کا پتہ ضرور معلوم ہے۔

چھایا نے حیرت سے پوچھا۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

پرکاش نے نظریں گھمائے بغیر جواب دیا۔ میں آپ کو اپنے گھر بھی نہیں لے جا رہا۔ ہم مقامی آریہ سماج مندر جا رہے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ یہ گاڑی ایک مرد اور ایک عورت کے لیے بنی ہیں۔ میں نے سارے کالج میں کہہ رکھا ہے کہ میرے ساتھ والی سیٹ پر وہی لڑکی بیٹھے گی جو اس گاڑی اور اس کے شوفر کو اپنانے کے لیے تیار ہوگی۔ آج خوش قسمتی سے آپ خود ہی ـــــ لہٰذا ہم شادی کرنے جا رہے ہیں۔

چھایا مسکرائی۔ آپ مذاق خوب کر لیتے ہیں۔

پرکاش مسکرایا۔ میں مذاق نہیں کر رہا چھایا دیوی۔ میں آپ سے پیار تو آج تک کرتا ہی رہا ہوں۔ آج شادی بھی کر لوں گا۔

چھایا نے جیسے مذاق میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ میں انکار کر دوں تو؟

پرکاش نے کہا۔ یہ سراسر ظلم ہو گا۔ میں جانتا ہوں آپ باہر سے بھلے ہی کیسی ہوں، بھیتر سے اتنی ظالم نہیں ہیں۔

چھایا جو ابھی تک مسکرا رہی تھی۔ ایکا ایک سیریس ہو گئی۔

"آپ گاڑی روکیے مسٹر پرکاش شرما"

"مسٹر پرکاش شرما؟"

پروفیسر پرکاش شرما۔ آپ پروفیسر کہلایا جانا زیادہ پسند کرتے ہیں نہ۔ چھایا کے لہجہ میں طنز تھا۔

پرکاش نے گاڑی روک دی......میں آپ کے پتاجی؟

پتاجی اس دنیا میں نہیں رہیں۔

"ماتاجی؟"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

مجھے افسوس ہے۔ مگر کوئی تو ہو گا آپ کا مقامی محافظ......میرا مطلب ہے گارڈین"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں کمد ورکنگ گرلز ہاسٹل میں اکیلی رہتی ہوں۔"

گوپال کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ آنکھیں رومال سے خشک کرتے ہوئے بھرائی آواز میں بولا۔ آپ کو میری نہ سہی ایک عدد ماں کی ضرورت ضرور ہے۔ خود میرا بھی ماں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ باپ کی موت کے بعد نانا نے پالا تھا۔ آج وہ بھی نہیں ہیں۔ بس ایک ماں جسے آپ کے ساتھ بانٹ لینے میں مجھے کوئی قباحت نہ ہو گی۔"

چھایا چپ ہو گئی۔

گاڑی پھر چلنے لگی۔

گھر کے دروازے پر گاڑی رکی تو پرکاش نے کہا۔ آج پہلی اور غالباً آخری بار

میں کسی لڑکی کو ماں کے پاس لے جا رہا ہوں۔ میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔ اس کے لہجہ میں عجیب قسم کی انکساری تھی۔ چھایا نے سوالیہ نگاہ ڈالی تو اس نے کہا' آپ ماں کے پاؤں ضرور چھوُ دیجیئے۔ وہ جس قسم کی بزرگ ہیں اس قسم کے بڑے بوڑھوں کے پاؤں چھوُنے سے ثواب ہی ملتا ہے، وقار میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔'

چھایا نے کوئی جواب نہیں دیا، مگر دروازہ کھُلنے پر جیسے ہی چھایا نے شانتی دیوی کے پاؤں کو چھُوا بڑھیا نے اُٹھا کر اُسے سینے سے لگا لیا۔

تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں نکٹائی اور کوٹ اتار کر وہ لوٹا تو اس نے دیکھا کہ چھایا بڑے صوفے پر شانتی دیوی سے چمٹی ان کی گود میں سُکڑی بیٹھی ہے۔

' تو نے مجھے اس کا نام نہیں بتایا :

" چھایا ماتھر۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھاتی ہیں "

تو اپنا وعدہ بھول گیا۔ تو نے پتاجی سے وعدہ کیا تھا کہ میرے علاوہ جو لڑکی اس کار میں بیٹھے گی تو اُسے میری بہو بنائے گا۔

چھایا کو بُرا نہیں لگا۔ شرما کر اُس نے ماں کی گود میں منہ چھُپا لیا۔

'تو میری بہو بنے گی نہ بیٹی !'

چھایا ایک دم سُکڑ گئی۔

" چھایا کی ماں نہیں ہے اماں "

"کیا بکتا ہے رے۔ میری گود میں بیٹھی یہ لڑکی تجھے میری بیٹی نہیں لگتی ؟

پرکاش کچھ نہیں بولا۔ مگر یہ انوکھا پیار پاکر چھایا ماں۔ میری ماں، چلائی شانتی دیوی سے ایسے چمٹ گئی۔ جیسے برسوں سے بچھڑی بیٹی ماں سے ملتی ہے "

اس واقعہ کے بعد ہفتہ بھر گوپال کالج نہ گیا۔ چھایا بھی نہ جا سکی۔ سٹاف روم میں طرح طرح کی افواہیں مذاقاً، تفریح کا موزوں بنی ہوئی تھیں۔

'پرکاش بڑا چالو ہے آخر لے ہی اُڑا نہ ہماری سونا لیسا کو "

'یہ بھی تو ممکن ہے کہ مونا ہی ہمارے کنہیا کو لے اُڑی ہو "

'بات ایک ہی ہے۔ چھُری تربوز کے اوپر ہو یا تربوز چھُری کے ـــــ چھُری کاٹے گی اور تربوز کٹے گا۔ لو کھاؤ میرے پٹیالے کا تربوز۔ مزہ نہ آجائے تو کہنا۔

دوسرے دن سب نے دیکھا کہ دونوں لوٹ آئے ہیں۔

تم نے دیکھا کلونت بیچارہ ایک دم فلیٹ ہوگیا ہے۔ شکل وصورت سے تو آج بھی کنہیا ہی لگتا ہے مگر دِکھتا ہے وہ رادھا اس کی بنسری پر نہیں ناچی

تم نے چھایا کو نہیں دیکھا۔ بیچاری بستر مرگ سے اٹھ کر آئی لگتی ہے۔

اس کے بعد پرکاش کو کسی نے چہکتے نہیں دیکھا۔ چھایا کو تو پہلے ہی سے لڑکے لڑکیوں کو پڑھانے اور خالی اوقات میں بھی انہیں ادب کے نازک اور باریک نقطے سمجھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا تھا اب پرکاش کا دوسرا کوئی شغل نہ رہا تھا۔ سٹاف روم میں بھی وہ اب بہت کم آتا تھا۔

چھایا نے بیچارے کا دل توڑ دیا ہے۔

خود چھایا بیچاری ہی کون ایسی سالم بچی ہے۔ باہر سے بھلے ہی وہ پہلے والی مس ماتھر ہے مگر اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی لگتی ہے۔ جانے کیا ہوگیا ہے بیچاری کو۔

وجہ کسی کو معلوم نہ تھی۔ کچھ تخمینے تھے تو کچھ اندازے۔ حقیقت کسی کو معلوم نہ تھی۔

پھر ایک نئی افواہ پھیلنا شروع ہوگئی کالج میں۔ مس ماتھر بیاہ منڈپ سے بھاگی ہوئی ایک ایسی ابھاگن ہے جس کا نا باپ ہے نہ ماں۔ نہ کوئی بہن بھائی ہی۔ وہ دنیا میں اکیلی ہے۔

کالج کے پرنسپل صاحب نے چھایا کے چچا کو جو اس سلسلہ میں ان سے ایک روز ملے تھے بے عزت کرکے اپنے کمرے سے نکال دیا تھا۔ اور وہ اپنی بوکھلاہٹ میں۔

"میں دیکھ لوں گا۔ لوگ کیسے اپنی کنواری بیٹیوں کو اس کالج میں بھیجتے ہیں، جہاں گھر کی مان مریادہ کو پامال کرکے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو ادھیاپک جیسے پوتر پدوں سے نوازا جاتا ہے۔ چلاتے چلاتے چلا گیا تھا۔

وہ کس لڑکی کی بات کر رہا تھا یہ سمجھتے لوگوں کو دیر نہ لگی۔ اس حادثہ کے بعد پرنسپل صاحب نے چھایا کو کالج ہاسٹل کے فی میل وارڈ کی انچارج یعنی وارڈن بناکر اسے وہیں رہنے کے لیے ایک کمرہ بھی دے دیا۔ پرنسپل جو ایک خدا ترس بزرگ تھا۔ جانتا تھا کہ چھایا جیسی اکیلی اور بے سہارا لڑکی کا کسی دوسری جگہ رہنا اب محفوظ نہ تھا۔ وہ خود چار بیٹیوں کا باپ تھا۔

پھر گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں اور سب طلبا اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ چھایا اب اور بھی اکیلی ہو گئی۔

'تجھے ڈر نہیں لگتا بیٹی۔ اتنے بڑے ہاسٹل میں تو اتنے دن اکیلی کیسے رہے گی۔

اکیلی کہاں ہوں اماں۔ بابو جی روز آکر سب دیکھ جاتے ہیں۔ پھر ادھر مائی ہے، مہاراج ہے، چوکیدار ہے، سب مجھے بیٹی کی طرح مانتے ہیں۔ یہ ہاسٹل تو ایک فورٹ ہے اماں پولس کے دو مسلح سپاہی دن رات گشت کیا کرتے ہیں اس عمارت کے آس پاس۔

پھر بھی بیٹی پچاس کمروں کی اس چار منزلہ عمارت میں تجھے اکیلی نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ سوچ کر کہ تمہیں یہاں ایک دو روز نہیں پورے دو مہینے اسی طرح رہنا ہے اکیلی اس سونے سونے میں مجھے تو خوف آتا ہے بیٹی۔ باہر کا خدشہ نہ سہی آدمی ان حالات میں خود اپنے آپ سے ڈرنے لگتا ہے۔

دوسرے روز صبح صبح ہی شانتی دیوی اپنے چار کپڑے لے کر چھایا کے ساتھ رہنے آگئیں۔

پرکاش پہاڑ پر چلا گیا ہے۔ اس کا دل بہل جائے گا۔ اور تو بھی اب اکیلی نہ رہے گی۔

آپ کتنی اچھی ہیں اماں۔ میرے بارے میں سب کچھ جان کر بھی آپ!'

تیرے ساتھ جو ہوا ہے وہ ہولی تھی جس پر کسی کا بس نہیں ہوتا۔ تو سزا کی نہیں پیار کی حقدار ہے بیٹی۔

'ان کو معلوم ہے!'

میں اپنی بیٹی کی بات اس سے کیوں کہوں گی۔ مگر تیرے بچے کے بارے میں وہ سب جانتا ہے۔

بڑی نفرت ہو گئی ہو گی انھیں!

میں نے اس سے ایک روز پوچھا تھا جانتی ہو کیا بولا۔ کہنے لگا پیار پہلے ہوتا ہے۔ رشتے ناطے بعد میں طے ہوتے ہیں۔ چھایا میری بیوی رہے یا بہن، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ کیوں کرتا ہوں میں یہ بھی نہیں جانتا۔

وہ دیوتا ہیں۔ اسے کاش میں ان کے یوگیہ ہوتی۔ جانے کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہوں گے!

وہ آدمی ہے بیٹی۔ اس کے بھٹکنے میں کوئی قباحت نہیں۔ مجھے ڈر ہے تو بس اتنا ہی کہ وہ بڑا لاپرواہ ہے۔ وقت بے ڈھنگ کا کھایا پیا کرے۔ کہیں اپنی سونے جیسی کایا بگاڑ نہ لے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے وہ نیچے ہال میں گئیں تو دیکھا کہ پرنسپل صاحب بیٹھے کسی کو ٹیلی فون کر رہے تھے۔ ریسیور رکھ کر بولے۔ ماتھر صاحب کا ٹیلی فون تھا۔ بہت شرمندہ تھے، معافی مانگ رہے تھے۔ میں نے بھی اس روز طیش میں آکر بہت برا بھلا کہہ دیا تھا۔ بتا رہے تھے کہ ان کا بیٹا امریکہ سے تعلیم ختم کر کے لوٹ آیا ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے

میں ان کی قصوروار ہوں۔ میرا بیٹا حرامی نہ کہلائے اسی لیے انھوں نے میری شادی کا اہتمام کیا تھا۔ میں ان کو دوش نہیں دیتی۔ بیاہ کی پوری تیاریوں کے باوجود میرا ایک دم روپوش ہو جانا ظاہر ہے کہ غلط فعل تھا۔ مگر میں مجبور تھی۔

کوئی بچہ حرامی نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے بھی اپنے بیٹے کو کبھی حرامی نہیں سمجھا۔ سریش ہی ہے نہ تمہارے چچا زاد بھائی کا نام۔ وہ کل ادھر پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہارے سورج کا دوست ہے اور اس کے بچے کو خود گود لینا چاہتا ہے۔

سریش بہت اچھا ہے۔ مجھے اپنی سگی ماں جائی بہن کی طرح پیار کرتا ہے۔ میرے اور سورج کے تعلقات کے بارے میں بھی وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اسی نے مجھے سورج سے ملوایا تھا۔ دونوں گہرے دوست تھے۔

"ایک تپ دق کے مریض کے ساتھ تمہارے لگاؤ میں مددگار ہونا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کون بھائی اپنی بہن کو سب جانتے بوجھتے بھی۔۔۔۔"

میری والدہ دق سے مری تھی اور اگرچہ ڈاکٹر لوگ ایسا نہیں سمجھتے ہیں جانتی ہوں کہ پتا جی بھی اسی موذی مرض کا شکار ہوئے تھے۔ مجھے دق نہیں ہوا۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سورج تیسرا مریض تھا جو میری زندگی میں آیا۔ اس کے پیار میں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت تھی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

"سورج کو آپ نہیں جانتے مگر اوپر والے سورج کو تو آپ روز ہی دیکھتے ہیں دنیا کے لیے اوپر والے سورج کا جو مہتو ہی مہتو میرے اپنے سورج کا تھا۔ اُس جیسا تجسوی پرش میں نے نہیں دیکھا۔

"مگر اس نے!"

"نہیں بابوجی۔ جب آپ نے اُسے دیکھا نہیں تو پھر محض اندازوں پر اُسے قصوروار نہ ٹھہرائیے۔"

"خیر۔ میں تمہارے ایتہت کی سرد پڑتی راکھ کو کرید کر اس میں چھپی چنگاریوں کو بلا وجہ ہوا دینا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم سریش سے ملنا چاہو گی کہ نہیں۔"

"سریش میرا سچا غمگسار میرا ہمدرد میرا بھائی ہے۔ اس سے ملنے میں مجھے بھلا کیا جھجھک ہو سکتی ہے۔ مجھے تو چاچاجی سے ملنے میں بھی کوئی آپتی نہیں وہ میری حقیقت سے بھلے ہی واقف نہ ہوں مگر وہ میرے دشمن ہیں یہ میں کبھی نہ کہوں گی۔"

چھایا پرنسپل کے آبائی مکان کی چھت پر بیٹھی اپنے بیٹے کے لیے سویٹر بن رہی تھی۔ شریش پاس ہی کین کی کرسی میں دھنسا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ کافی دیر چپ رہنے کے بعد بولا، اور سب باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔ مگر ایک بات مجھے برابر کھائے جا رہی ہے۔

"کون سی بات بھیا؟"

"یہی تمہارا ماں بننا۔"

چھایا مسکرائی۔ یہ کون سی نئی بات ہے بھیا۔ ایک نوجوان لڑکی۔ ایک نوجوان لڑکا۔

وہ سب ٹھیک ہے چھایا مگر...... ایسا کبھی نہ تھا۔ وہ میرا دوست تھا اور بھلی بھانتی جانتا تھا کہ وہ تپ دق کا مریض ہے۔ اس مرض کے بیماروں سے تمہاری فطری ہمدردی کی وجہ سے ہی میں نے اسے تم سے ملوایا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح اکیلا تھا۔ تمہارے تو پھر بھی تھے۔ ہم سب تھے مگر اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا تمہیں اس سے ملانا تمہارا اتنا بڑا نقصان کر دے گا اس کا مجھے ذرا بھی خدشہ ہوتا تو میں اسے تم سے کبھی نہ ملواتا۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔

"میری تقدیر تم نے نہیں ودھاتا نے لکھی تھی۔"

"مگر یہ وشواس گھات۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مریض ہے اور تم میری بہن ہو۔"

"مریض کو بھی پیار کا حق ہوتا ہے سریش بھیا۔"

"پیار جسم ہی تو نہیں ہوتا۔"

"پیار کا بھی ایک جسم ہوتا ہے بھیا۔"

"پیار اور آتما کی باتیں کرنے والا وہ افلاطون کا بچہ!"

"تم مجھے، اپنی بہن، اپنی پیاری بہن کو بے حیا کہو گے۔ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ میں خود ایک رات!"

سریش چلایا، "نہیں" پھر کچھ دیر رک کر اور سنبھل کر بولا: "تم نے میرے سر سے ایک بھاری بوجھ اتار دیا ہے چھایا۔ اپنے آڈیل کو مجروح پا کر میں بے حد پریشان ہو گیا تھا تم نہیں جانتی ہو بہن کہ آدرشوں کی موت کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے۔

"وہ جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جا رہا ہے۔ میں بھی جانتی تھی کہ وہ جا رہا ہے وہ کہاں جا رہا ہے میں یہ بھی جانتی تھی۔ میرے لیے دو ہی راستے تھے اس کے ساتھ خود بھی مر جاتی یا وہ کرتی جو میں نے کیا۔"

سریش نے مسکرا کر اپنی بہن کو دیکھا۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو، بالکل اپنے ماں باپ کی طرح۔ مگر تم ایک ہندوستانی لڑکی ہو۔ یہی تمہیں یاد نہ رہا۔

ہم دونوں اناڑی تھے۔ نہ اس نے پہلے کبھی کسی لڑکی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا نہ میں نے ہی کسی مرد کو کبھی اپنے اتنے قریب پایا تھا۔ نرسنگ ہوم کی وہ ختم ہوتی ہوئی رات جب کائنات کا ذرہ ذرہ نیند میں مدہوش تھا۔ ہم دونوں ——"

"تمہیں یہ سب بتاتے ہوئے

ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہو رہی۔ تم میرے بھائی ہی نہیں میرے اور سورج کے سچے دوست ہو۔ جانتے ہو دوسری صبح جب میں لوٹ رہی تھی تو اس نے کیا کہا تھا؟"

سریش سوالیہ جملہ بنا بیٹھا رہا کچھ نہ بولا۔ جذبہ شدید ہو تو الفاظ اکثر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

چھایا جیسے ایک رو میں بہہ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا اگر دنیا میں یہ میرا آخری

دن ہے چھایا تمہاری طرح وہ بھی مجھے اسی طرح بلایا کرتا تھا۔ میں جا رہا ہوں۔ اپنا یہ تھکا ہارا جسم اور اپنا یہ موذی مرض بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں مگر مجھ میں جو کچھ بھی اچھا اور مناسب ہے میری آتما۔ میرے پیار کی خوشبو، میرے ادھ کھلے کنوارے ارمانوں کی مہک وہ سب میں نے تمہارے بدن کے مندر میں اپنی آخری پوجا کے طور پر چڑھا دئے ہیں۔ میں تمہارا شوہر بن کر نہ جی سکا۔ مگر میں تمہارا بیٹا بن کر ضرور جیوں گا۔

"اے کاش میرے پیارے دوست نے تمہاری مشکلات کا اندازہ بھی لگایا ہوتا وہ جانتا تھا کہ اس کی چھایا ایک بیوہ کی طرح جی سکنے کا دم خم رکھتی ہے۔ جانتے ہو یہ کہانی جو آج تمہیں سنا رہی ہوں کسی کو پہلے بھی سنا چکی ہوں،

پرکاش کو :

نہیں، بابوجی کو

پوری تفصیل سے :

'بالکل آپ کی طرح۔ میرے بابوجی بڑے شاندار آدمی ہیں :'

'مجھے تم پر ناز ہے۔ مگر سورج کہاں ہے :'

چھایا نے حیران سی ہو کر دیکھا :

میں سورج کھنہ کی نہیں تمہارے مرحوم شوہر کی نہیں۔ ہاں میں اب اُسے تمہارا شوہر ہی کہوں گا۔ میں تمہارے بیٹے اپنے بھتیجے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ میرے دوست کی نشانی ہے میں اُسے گود لوں گا اور تمہیں تمہارے غنی سے رہائی دلا دوں گا۔

'سورج اپنے مشرق میں محفوظ ہے۔ ایک غریب مگر مہربان بزرگ کی چھتر چھایا میں پل رہا ہے :

میں اس کا ماموں بھی ہوں اور چاچا بھی۔ میں بھیشم نہیں مگر پرتگیا کرتا ہوں۔ اس کی خاطر، اسے سوتیلی ماں کے سایہ سے بچانے کی خاطر کبھی شادی نہ کروں گا۔

تم میرے لیے سب کچھ ہو میرے پیارے بھیا۔ مگر [illegible] اپنی حقیقت کو زندگی میں [illegible] سمجھنے کا موقعہ دو۔ [illegible] سب سے [illegible]

میرا بیٹا ایک بہادر باپ اور ایک [illegible] کی اولاد ہے۔ مجھے یقین ہے [illegible]

ماں کو کبھی دوشی نہ ٹھہرائے گا۔ دوسرے میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کیا کیا کہتے ہیں اس کی مجھے قطعاً کوئی چنتا نہیں۔،

تم بمشکل ۲۴ سال کی ایک نوجوان عورت ہو چھایا۔ زندگی ایک پہاڑ کی طرح تمہارے سامنے تنی کھڑی ہے میری بہن۔ بیساکھیوں کے بغیر اس مغرور ہمالہ کو پار کر جانا تمہارے لیے ممکن نہ ہوگا۔

"میرا بیٹا میرا سہارا بنے گا سریش۔ وہ سورج ہے۔"

'مگر بیٹے کو بھی باپ چاہیے میری بہن۔ ہر بیٹے کے لیے باپ ماں ہی کی طرح ضروری ہوتا ہے۔ اپنی شناخت کے لیے۔ سماج میں اپنے مقام کے لیے۔'

"جن کے باپ مر جاتے ہیں وہ کیا زندہ نہیں رہتے۔"

'میں جس باپ کا ذکر کر رہا ہوں بہن وہ اس ملک کا سماج ہے۔ تم سورج کو مجھے دیدو اور شادی کر لو۔ یہ خلا جس میں تم ٹنگی ہو اسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔'

'دوسری شادی؟'

'لوگ دوسری شادی بھی کرتے ہیں۔'

'کون کرے گا میری ایسی ابھاگن سے شادی؟'

'ایک لڑکے کو تو میں بھی جانتی ہوں جو تم سے بلکہ اگر میں کہوں کہ صرف تم ہی سے شادی کرے گا تو بھی بھگوان گواہ ہیں غلط نہ ہوگا۔ یہ شانتی دیوی تھیں جو ان کے جانے بوجھے بغیر چھت پر آ کھڑی ہوئی تھیں

"آج مجھے تمہارے بابو جی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک بات اور بھی بتائی ہے۔ جو مجھے قطعی معلوم نہ تھی اور جو تم بھی نہیں جانتی ہو بیٹی وہ یہ کہ میرا پرکاش پچھلے مہینہ بھر سے اپنے بیٹے کے ساتھ نینی تال میں رہ رہا ہے۔"

چھایا ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہوگئی مگر اپنے بابو جی کو چھت پر آتے دیکھ کر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

پرکاش کو تمہارے بیٹے کے بارے میں سب بتا دینا میرے لیے ضروری ہوگیا تھا بیٹی۔ میں نے تمہارے سورج کو نہیں دیکھا یقیناً وہ بہت بڑا انسان رہا ہوگا مگر میں اپنے شاگرد کو جانتا ہوں۔ سورج تمہارا ایک خواب ہے بیٹی جب کہ میرا

پرکاش ایک زندہ حقیقت ہے۔ تم نے اپنے سورج کی خالی اور ختم ہوتی ہوئی ہستی، بل بل مٹتی ہوئی زندگی کی تکمیل کے لیے۔ اُسے اُس کے بنانے والے کے گھر خالی ہاتھ لوٹنے سے بچانے کے لیے۔ اس کے سوکھے مرجھائے دل میں ایک آخری کنول کھلانے کے لیے اپنے سوکھشم پیار کا جو پرساد جواپہار دیا تھا۔ اپنی پوتر کنواری آتما کی جو مہک بخشی تھی وہ یقیناً ایک بڑی بات تھی۔ ہم سب جو جانتے اور سمجھتے ہیں تمہارا احترام کرتے ہیں۔"

"مگر بابوجی کا پتہ؟"

"تمہیں ورکنگ گرلز ہاسٹل سے اٹھا کر اپنے ہاسٹل کی وارڈن بنانے کا میرا ایک مقصد تمہارے بیٹے کا سراغ لگانا بھی تھا۔ جو میں نے بڑی آسانی سے لگا لیا۔

نہیں نہیں بیٹی تم مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ میں نے تمہارے اور پنڈت رادھے شیام جی کے مابین ہورہی خط و کتابت کو کسی ذاتی غرض سے نہیں ایک باپ کی ضرورت کے طور پر پڑھا تھا۔ یہ دیکھو ——"

انھوں نے ایک لفافہ جیب سے نکال کر چھایا کو تھما دیا۔ جسے سریش نے بلند آواز پڑھا۔

"سورج میرے ساتھ ایسے گھُل مل گیا ہے۔ جیسے ہم ایک دوسرے کو جنم جنمانتر سے جانتے پہچانتے ہوں۔ پنڈت جی بڑے نیک بزرگ ہیں۔ چھایا کا بھیجا ہوا ایک ایک پیسہ انھوں نے الگ سے سورج کے لیے رکھا ہوا ہے اور آج تک اپنی سکول کی قلیل تنخواہ میں سے ہی سورج کی پرورش کرتے آئے ہیں۔ یہ ان ہی کی مہربانی ہے کہ سورج مجھے پاپا کہہ کر بلاتا ہے۔ رات کو میرے ساتھ سوتا ہے۔ دن کو بھی منٹ بھر سے زیادہ مجھ سے الگ نہیں ہوتا۔ آپ چھایا دیوی کو کہیں کہ وہ پنڈت جی کو لکھ دیں کہ وہ مجھے سورج کو اپنے ساتھ ادھر لے آنے کی اجازت دے دیں۔ میں ان سے اور کچھ کبھی نہ مانگوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ پنڈت جی بھی جو پچھلے سال بھر سے علیل چل رہے ہیں یہی چاہتے ہیں مگر وچن سے بندھے ہیں۔ وہ سورج کو جانتے تھے۔ اس سے ذہین شاگرد انھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں تم دیکھ لینا پرکاش یہ چھوٹا سورج اپنے باپ کی طرح ہی تیجسوی ہوگا۔ چھایا نے انہیں نہیں لکھا تو میں سورج کو اغوا کر کے کسی ایسی

جگہ لے جاؤں گا جہاں سے چھایا کو نہ اپنے سورج کی اور نہ آپ سب کو اپنے پرکاش کی کوئی خبر ملے گی۔ چھایا جی سے کہیں کہ وہ میری بوڑھی ماں پر ترس کھائے میرے نہ ہونے سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ مگر میری غریب ماں بے موت مرجائے گی۔

"سورج بڑا بدمعاش ہے۔ ہر رات میرے پیٹ پر پیشاب کرتا ہے۔ بچوں کے پیشاب میں کیسی عجیب مہک ہوتی ہے بابوجی۔ سچ بڑا لطف آتا ہے۔"

"پرکاش کی ہر بات۔ اماں نے مسکرا کر کہا ان کی آنکھوں سے جھڑتے ماتا کے موتیوں کا جوہر سب نے دیکھا۔ سبھی آنکھیں بھر آئیں۔

چھایا جو پتھر بنی سب دیکھ سن رہی تھی ایکا ایک بلک بلک کر رونے لگی۔ عین اسی وقت آسمان نے بھی چند بے موسمی بوندیں برسا کر دور نینی تال میں اپنے ننھے سورج کے ساتھ کھیل رہے پرکاش کو اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا۔ موسم اچانک بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ کالج کے سٹاف روم میں لیکچرار لوگ گذرے چھ ہفتوں کی چرچا کر کے چہک رہے تھے کہ سطوت نے بھانڈا پھوڑا۔ کمبخت رنڈوا ہے۔ کس کو معلوم تھا اور اِدھر ہم لوگ کیسی کیسی خوش فہمیوں میں مبتلا تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے قیاس لگایا کرتی تھیں کہ وہ ہم میں کس خوش نصیب کو دلہن بنائے گا۔"

کلونت نے کہا۔ میں نے بھی دیکھا ہے اس کا بیٹا۔ ایک دم فرشتوں ایسی صورت پائی ہے۔

میری بولی۔ نقصان نہ تمہیں ہوا ہے نہ مجھے۔ میں عیسائی ہوں تم سکھ ہو اور سطوت مسلمان۔ نقصان تو بیچاری شیلا اور امرت کا ہوا ہے۔ وہی اس دوڑ میں سب سے آگے تھیں۔

امرت نے کہا۔ اور وہ چھایا کی بچی۔

شیلا۔ اس کی اصلی منظور نظر؟

کلدیپ سنگھ چہکا۔ وہ سالی تو ہمالہ کی برف ہے جو کبھی نہیں پگھلتی۔

سطوت۔ بک جوالے۔

کلونت نے فقرہ چست کیا۔ بغیر نمک مرچ اور مسالہ والی مونگ کی دُھلی دال

مگر تم جیسی چٹ پٹی۔ گوشت روٹی چھوڑ کر بھی وہ ایک بار اُسی کے پیچھے بھاگا تھا۔
ستوت ہنسی۔ غالباً اسی لیے کہ بھانڈا پھوٹ جانے کی صورت میں بیاہ منڈپ سے بھاگی ہوئی وہ بدنام لڑکی ہی اسے گوارہ کر سکے گی۔
بھئی ایسا مت کہو ستوت، کلونت بولی۔ کمبخت نے معمولی سا اشارہ بھی کبھی کیا ہوتا تو میں بھاگ کھڑی ہوتی اس کے ساتھ۔
دلیپ مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ سردارنی ہو کر کم بخت مونے پر جان چھڑکتی ہو۔
تم نے اس کا بیٹا نہیں دیکھا دلیپ۔ جو آدمی اتنی خوبصورت اولاد پیدا کر سکتا ہے اسے کوئی بھی خواب دیکھنے والی لڑکی ''
کون جانے بچے کی مرحوم ماں کی کنٹری بیوشن اس سے بھی زیادہ رہی ہو۔
اس میں کیا شک ہے وہ بلا کی سین رہی ہوگی۔
"تو پھر؟"
"مجھے تو اب بھی کوئی اعتراض نہیں۔"
"مجھے بھی" پیلا چہکی ''
"میری، ستوت اور کلونت ایک ساتھ چلائیں، تم دونوں کمینی ہو محض مذہب کی بنا پر ہیرا ہتھیانا چاہتی ہو۔
دلیپ سنگھ بولا۔ لڑو نہیں بیبو۔ ہم ابھی لاٹری ڈال کر فیصلہ کیے دیتے ہیں کہ کنہیا کی رادھا کون بنے گی۔
ابھی یہ ہیچ چل ہی رہی تھی کہ پر کاش اپنے بیٹے کا ہاتھ تھامے کمرہ میں داخل ہوا اور لڑکے سے مخاطب ہو کر بولا۔ دیکھو بیٹے یہ تمہارے چاچا جی ہیں اور یہ سب تمہاری بوا جی۔ انہیں پرنام کرو۔
"تو نے ساری محفل کی گرمی ایک ہی ہلے میں چوس لی۔ بڑے خشک ہو گئے ہو میاں۔"
انہیں بھلے ہی اعتراض ہو مگر مجھے قطعی نہیں۔ ستوت بولی۔
مجھے بھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں یہ پنڈت کی اولاد عیسائی بھیڑ نہیں بنے گی۔

کلونت نے ہنس کر کہا. میرے لیے ایک گورو کے سچے سکھ سے بڑا کوئی نہیں.

'یہ سب کیا ہو رہا ہے پرکاش حیران تھا.

ایک تمہیں سخرے نہیں ہو اس کالج میں. دلیپ نے جملہ کسا.

لیلا نے سورج کو اٹھالیا میرا بیٹا.

. مجھے دے. یہ تو میرا بیٹا ہے.

میرا راجہ بیٹا.

میں پاپا کا بیٹا ہوں. سورج نے پروٹسٹ کیا.

دلیپ نے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا. ہم کب کہتے ہیں کہ تم پاپا کے بیٹے نہیں ہو. ہم تو تمہارے لیے ایک عدد ماں کا بندوبست کر رہے تھے

سطوت نے للکارا - ہمت ہے پرکاش تو وعدہ کرو کہ بچہ جسے ماں کہے گا تم اُسے...

اس سے پہلے کہ پرکاش مذاق کا جواب دیتا چھایا اچانک کمرے میں چلی آئی. سورج بھاگ کر اس کے پاس چلا گیا اور باپ سے مخاطب ہو کر بولا یہ آنٹی سب سے سندر ہے.

سب ایک دم چپ ہو گئے. چھایا کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ اس کے سامنے کوئی بھی ہلکی بات نہ کر سکتا تھا ورنہ شوخ سطوت ضرور کہہ دیتی.

"لڑکے نے اپنی ماں چن لی"

چند ہی دنوں میں سورج سارے انکلوں اور آنٹیوں سے ہل مل گیا پرکاش اپنے پیریڈ میں اسے کبھی ایک تو کبھی دوسرے کی حفاظت میں چھوڑ دیتا. چھایا چونکہ سٹاف روم میں کبھی کبھار ہی آتی تھی. لہٰذا بچے کی نگرانی کا سوبھاگیہ اسے کبھی پراپت نہ ہوا.

صورت حال ایک دم بدل گئی تھی. مگر چھایا کے اپنے رویے میں کوئی فرق نہ آیا تھا. وہ اپنے لاڈلے کو دور سے ایک نظر دیکھ کر ہی اپنی ممتا کی ساری ضروریات پوری کر لیتی تھی. اُسے اطمینان تھا کہ اُس کے سورج کو باپ اور گھر مل گیا تھا ڈاکٹر پرکاش شرما کا گھر ایک ایسا خوشحال گھرانہ تھا جہاں ہر وہ چیز موجود تھی جو بچوں کے لیے ضروری ہوتی ہے.

،سوائے ماں کے۔ ایک دن بابوجی نے اسے جھنجھوڑا۔ تم بڑی نشٹھر ہو چھایا۔ ایک آدمی نے اپنے آپ کو رنڈوا اور ایک بے ماں کے بچے کا باپ مشتہر کر کے اپنے جوان مستقبل کے سارے دروازے بند کر لیے ہیں اور ایک تم ہو کہ —— اب تم ہی بتاؤ کس بھلے گھر کی لڑکی اُسے اپنائے گی،'

مگر میں کیا کروں بابوجی۔

یہ کیا مجھے بتانا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ مرد کے پہلے ہی لمس سے تمہاری نسوانی شخصیت کی تکمیل ہو گئی تھی۔ مگر یہ سنیاس اب واجب نہیں ہے۔ ایک شادی کے بعد وہ شخص بھلے ہی دوسری شادی نہ کرے جس کی پہلی ازدواجی زندگی ناکام رہی ہو۔ تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تم نے سورج سے پیار کیا تھا۔ اب پرکاش بھی کوئی ایسا معمولی آدمی نہیں۔ اپنی چھوٹی سی عمر میں ہی علم و ادب کی دنیا میں اس نے جو مقام بنا لیا ہے ...... وہ تم سے چھپا نہیں۔ تم اس کی پریرنا بنو۔ اس کی بے پناہ کیرتی میں شریک ہو کر اُسے اور آگے بڑھنے میں مدد دو۔ میں حیران ہوں کہ تمہیں اِس غریب کی بوڑھی ماں کا بھی کبھی خیال نہیں آتا۔ زندگی میں صرف اپنے لیے ہی نہیں جیا جاتا بیٹی۔ آدمی کو دوسروں کے لیے جینا بھی سیکھنا چاہیے۔

آپ میرے تپاسمان ہیں بابوجی۔ آپ مجھے دوسری شادی کا درس دے رہے ہیں۔

میں تمہیں شادی کا مشورہ دے رہا ہوں۔ تم زندگی کے ایک لمحہ کی لغزش کو بلا وجہ طول دے رہی ہو۔ تم اس طرح شہید بن سکتی ہو چھایا مگر ایک عورت نہیں۔ جسم کا بھی ایک دھرم ہوتا ہے بیٹی۔ مجھے ڈر ہے کہ تم پرکاش کو بھی اُسی طرح کھو دو گی جس طرح ...... تم نے کبھی سوچا ہے کہ پرکاش اتنے دنوں سے کالج کیوں نہیں آرہا۔ اس کا بیٹا بیمار ہے۔ انھوں نے جملہ ختم ہی کیا تھا کہ ....

،سورج بہت بیمار ہے بابوجی،' یہ پرکاش تھا پریشان حال، پرکاش چھایا کو دیکھ کر بولا۔ میں ہار گیا ہوں چھایا دیوی آپ اپنے بیٹے کو سنبھالیے۔ مجھ سے اس معصوم کا مرنا نہ دیکھا جائے گا۔ میں تقریباً پاگل ہو گیا ہوں۔ میری ماں بیچاری جو پہلے ہی سے نیم مردہ ہے رو رو کر ......

چھایا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ گویا کسی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ چلا کر بولی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ سورج مجھے دوسری بار چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔،،

دونوں کے دیکھتے دیکھتے اس نے باہر آ کر کار کا دروازہ کھولا اور جم کر بیٹھ گئی۔

پرنسپل صاحب حیران و ششدر کھڑے تھے۔

چھایا نے پرنام کرتے ہوئے کہا۔ بیٹی اپنے گھر جا رہی ہے بابوجی۔ اُسے آشیرباد نہ دیں گے۔

پرنسپل صاحب کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے چھایا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پرکاش سے گویا ہوئے۔ لے جاؤ بیٹا اپنے بیٹے کی دوا اور دعا۔ میری بیٹی پانی اور ہوا کی طرح پوتر ہے۔ کبھی بھولے سے بھی نہ سمجھنا کہ اِسے اپنا کر تم نے اس پر کوئی بڑا احسان کیا ہے۔ تم خوش نصیب ہو جو اِسے پا رہے ہو۔ اب اگر تم پرکاش ہو تو یہ تمہاری چھایا ہے۔ اب تم دو نہیں ایک ہو۔ تم ہو اِسی سے یہ ہے، یہ لڑکی میرا تحفہ نہیں میرا آشیرباد ہے۔

دوسرے روز سٹاف روم میں سب ملے تو سطوت نے کہا۔" ہم سب نے اُس مگرمچھ کو پکڑنے کے لیے جال پھینکے تھے مگر اُسے تو کوئی جل پری ہی پکڑ سکتی تھی۔،،

شادی کی پارٹی میں سبھی مسرور تھے۔

دلیپ سنگھ نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے چھایا سے کہا۔ اب تم دیکھ لینا چھایا جی اسی ایک سال میں کالج کے سب کنوارے کنواریاں بیاہی جائیں گی۔ میں نے کتنی بار اعلان کیا ہے کہ کنہیا کو ایک بار برندا بن سے جانے دو۔ سارے کنواروں کے بھاگیہ کھل جائیں گے۔ بیچاری گوپیاں۔

چھایا کا سر فخر سے اُونچا ہو گیا۔

ڈاکٹر دیو

ڈاکٹر دیو کے پانچ بیٹے تھے۔ رام دیو
نام دیو۔ کرشن دیو۔ رشی دیو اور صرف دیو۔
رام سب سے بڑا اور دیو سب سے چھوٹا تھا۔
چھوٹے دیو کے علاوہ باقی سب کے سب آوارہ
بدچلن اور بدتمیز چھوکرے تھے۔ بڑا لڑکا باقی
سب سے ہوشیار تو تھا ہی نسبتاً زیادہ پڑھا
لکھا بھی تھا۔ جب کوئی پڑوسی رشتہ دار یا
جاننے والا لڑکوں کی آوارگی کی چرچا کرتا تو
ڈاکٹر مسکرا کر کہتے۔ ارے بھئی یہ سب میرے
اپنے بیٹے ہیں۔ لہٰذا غیر معمولی ذہانت اور
تمیز ان میں کہاں سے آجائے گی۔ جیسا باپ
ویسے ہی بیٹے۔ میں خود کون ایسا پڑھا لکھا
ہوں۔ اور ان کی ماں تو ایک دم صفر ہے اچھی
نیک اور غیر معمولی اولاد تو دیوتاؤں کے
رحم و کرم سے ہوتی ہے۔ جیسے ہمارے پانچ
پانڈو تھے۔

قصبہ کے اکثر پرانے لوگ ڈاکٹر دیو
کو جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ دیو اُن
اُن کا نہیں اُن کے بڑے بھائی کا نام تھا۔ جو واقعی
کوالی فائڈ ڈاکٹر تھا۔ اُن کی اچانک موت
کے بعد دیسراج نے اپنا نام دیو رکھ لیا۔
یہی نہیں اپنے بڑے بھائی کی بیوہ اور اُن
کے سرٹیفکیٹ وغیرہ بھی ہتھیا لیے۔ وہ پورے
چھ سال بڑے بھائی کا اسسٹنٹ رہا تھا۔
دانتوں کی ڈاکٹری ویسے بھی کون ایسی

ٹیکنیکل چیز ہوتی ہے ہاتھ صاف ہونا چاہیے کوئی بھی تھوڑی تربیت کے بعد دانتوں کا ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ دلسیراج دانت اکھاڑنے اور لگانے کے سارے گُر اور ٹریڈ کے سارے چالو حربے بڑے بھائی کے رہتے ہی سیکھ گیا تھا۔ جاننے والے اکثر کہتے وہ باقاعدہ پڑھا لکھا یا تربیت یافتہ ڈاکٹر بھلے ہی نہ ہو مگر اپنے فن کا اُستاد ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ہُنر ہے۔

چند ہی سالوں میں لوگ اصلیت کو بھولنے لگے اور ڈاکٹر دیو کا نام اور کام چل نکلا۔ بڑے شہروں میں کون چھان بین کرتا ہے۔ جگہ معقول ہونی چاہیے۔ اوزار اور ڈینٹسٹری کی دیگر لوازمات ہونی چاہئیں۔ کون پرواہ کرتا ہے کہ دیوار پر ٹنگے ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ وغیرہ کس کے ہیں۔ جیسے جیسے وقت نکلتا گیا اور لوگ اُس کے نئے نام اور کام سے مانوس ہوتے گئے اُس کا ماضی ایک کہانی بن کر رہ گیا۔ اور کہانی کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں کہ اگر دس بیس کہیں کہ بات جھوٹی ہے تو اتنے ہی اور بھی نکل آئیں گے جو قسم کھا کر تصدیق کر دیں گے کہ بات سچی ہے۔ آج کل جھوٹ اور سچ کے چکر میں کون پڑتا ہے۔ وقت مہربان ہو تو جھوٹ اور سچ اپنے آپ ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر دیو جو بڑے بھائی کے رہتے بھاوج کو مائی کہہ کر پکارتے تھے اُن کے جانے کے بعد بھی اُنہیں اسی طرح پکارتے رہے۔ جب کوئی دوست یا رشتہ دار طنز کرتا تو آنکھ میچ کر کہتے۔ بھئی تب وہ ہندی میں لکھی جانے والی مائی تھی آج کل وہ انگریزی میں لکھی جانے والی مائی ہے یعنی ایم وائی والی مائی۔

مائی سے اُن کی خوب نبھتی تھی۔ اُن کی اپنی بیوی بیچاری نام کی ہی نہیں کرم کی بھی ساوتری تھی اصلی معنوں میں پتی برتا۔ بڑے صبر والی عورت تھی بیچاری۔ مجھے کیا لینا دینا ہے پتی کے بُرے کرموں سے وہ میرے بیٹوں کا باپ ہے۔ بیٹے بڑے ہوں گے تو ماں کا دکھ اپنے آپ اُن کی سمجھ میں آجائے گا۔

ایکبار اُن کے سُسر نے اعتراض اُٹھایا مگر بیٹی نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔ مائی کے پاس ڈھیروں سونا تھا۔ اور اپنے شوہر کی موت کے بعد وہ اُس کی چھوڑی ہوئی ساری جائیداد جو ایک بڑے مکان اور چار دکانوں پر مشتمل تھی کی اکیلی وارث تھی۔

آپ فکر نہ کریں پتاجی۔ یہ آدمی کسی کا نہیں یہ مائی جو آج کل اتنی بیمار رہنے لگی ہے۔ تو اس کی وجہ ہے جو ظاہر ہے کہ مجھے کھلے بندوں نہ بتانی چاہیے۔

ساوتری کی بات سچ نکلی اور دیو کی مائی دو ہی سال میں برف کی طرح پگھل پگھل کر ختم ہو گئی۔ مرنے سے پہلے اُس نے اپنی ساری جائیداد اپنے محسن دیور کے نام کر دی تھی۔ دو بھائی اور بھی تھے۔ مرحومہ کے شوہر کے مگر وہ اُس کے لیے غیر تھے۔ کیونکہ اُنہیں بیوہ بھاوجہ کا چلن ناپسند تھا۔ نقدی اور زیورات کی بات اُس نے ایسے گم کر دی جیسے ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ جیتے جی ہی اُس نے وہ سب دیو کے حوالے کر دیا تھا۔ پورے تین مہینے گھر میں ماتم بچھا رہا۔ دوست احباب اور رشتہ دار آتے اور چلے جاتے مگر گھر کے ماتمی ماحول میں کوئی فرق نہ آتا۔ دُور کے کچھ کم ٹھہرتے نزدیک کے کچھ زیادہ۔ جو جانتے تھے اُنہوں نے بھی دیکھا کہ دیو واقعی دِل و جان سے ماتم منا رہا ہے جو نہ جانتے تھے وہ تو ایک دم حیران تھے کہ اِس گھور کلجگ میں بھی ایک وفادار دیور اپنی ماں جیسی بڑی بھاوجہ کی موت سے اِس قدر پریشان ہے۔ نہ جاننے والوں میں مائی کی چھوٹی بہن شانتی بھی تھی۔ جو بیچاری بال ودھوا تھی۔ اُس کی ایک بچی تھی اور گذر بسر کے لیے اس کے مرحوم شوہر کے پُرکھوں کا گھر تھا۔ جس کا ایک حصہ کرایہ پر چڑھا کر وہ کسی طرح اپنا اور اپنی معصوم بچّی کا پالن پوسن کر رہی تھی۔

ڈاکٹر دیو کو شانتی میں اپنی مرحوم مائی کا روپ دِکھائی دیا اور شانتی کو دیو میں اپنی ڈگمگاتی ناؤ کو زِندگی کے بھنوروں سے پار لگانے والا مانجھی۔ بہن کا ماتم کرنے آئی تھی۔ جو کچھ دِنوں کے لیے رُکی تو رُکی ہی رہ گئی۔

دیس راج کے سسُر نے پھر اعتراض اُٹھایا مگر ساوتری نے پھر اپنے پتا کو سمجھا بجھا کر چپ کرا دیا۔ آپ ذرا بھی فکر نہ کریں پتا جی مائی تو کسی طرح دو سال کاٹ گئی تھی۔ یہ شانتی کی بچی ویسا دم خم نہیں رکھتی سال میں ہی پگھل کر پانی ہو جائے گی۔ اِس کی جائیداد کو نبٹانے میں اتنا عرصہ تو آپ سمجھتے ہیں کہ لگے گا ہی۔ جیسے ہی اِس کا وہ آبائی مکان ٹھکانے لگا وہ خود بھی پار ہو جائے گی۔

ساوتری کی بات سچ نکلی۔ ایک ہی سال کے اندر اندر شانتی اپنا نام و ناموس لٹا کر آخر ایک رات اپنے وفادار دیو کو روتا کُرلاتا چھوڑ کر پربھو دھام سِدھار گئی۔ مگر اِس بار شانتی کی موت نے ساوتری کو مطمئن نہیں کیا۔ ماں نے پوچھا تو نظریں جُھکائے جُھکائے بولی۔

شانتی بڑی سیدھی سادھی عورت تھی اماں۔ بیٹی کی شادی ہو جائے اِسی لیے وہ شوہر کا آبائی مکان بیچنے کو تیار ہوئی تھی۔ بیس ہزار خاصی رقم ہوتی ہے۔ نمو کو اُس روز ہم سب کے سامنے وہ اُلٹی نہ آئی ہوتی تو شاید شانتی اِس طرح اِتنی جلدی نہ چلی جاتی۔

نمو پیٹ سے ہے۔ یہ خبر سُنتے ہی ڈاکٹر دیو پہلے بڑے اور پھر دوسرے لڑکوں پر جھپٹ پڑے۔

"یہ سب اِن حرام زادوں کی کرتوت ہے۔"

لڑکے تو ڈر کے مارے گھر سے بھاگ گئے۔ مگر نمو نے سچی بات ماں اور ساوتری ماسی کو بتا دی۔ وہ ہر روز ڈاکٹر دیو کے لیے دوکان پر دوپہر کا کھانا لے کر جاتی تھی اور تقریباً ہر روز ہی —— شانتی اب کیا کرتی چپ چاپ کچھ کھا کر سو گئی۔

نمو تب چودہ برس کی معصوم بچی تھی۔ اگلے تین سالوں میں کتنی ہی بار اُس کے پاؤں بھاری ہوئے اور پیٹ خالی۔

تم بھی دیس عجیب آدمی ہو۔ ہزار طریقے ہیں۔ تم یہ حمل ہونے ہی کیوں دیتے ہو؟

اِن نئے طور طریقوں سے میری تسلی نہیں ہوتی۔

ہم تو بھئی سنبھل کر چلتے ہیں۔ کبھی بھی دیکھ لو مجال ہے جو دونوں میں سے کسی بہو کے پیٹ میں یا پیٹ کے باہر معمولی سا خم بھی آجائے۔

تم حلوائی ہی نہیں ہو پرتاپ سیٹھ حکیم بھی ہو۔ مجھے بے جا احتیاط اچھی نہیں لگتی۔ جوان جسم سامنے اپنی پوری توانائی سے للکار رہا ہو اور تم زرہ بکتر ڈھونڈنے لگو۔ اب اِس نمو ہی کو دیکھو۔ اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو مجھے اپنی مردانگی کا یقین ہو جاتا ہے۔

دونوں دوست خوب ہنسے۔

حرامیوں میں بڑی گاڑھی چھنتی ہے۔

آخر ڈاکٹر دیو نے ایک ایسا لڑکا تلاش کر ہی لیا جو ہر لحاظ سے مٹی کا مادھو تھا اور بیکار بھی۔ اُنہیں یقین تھا کہ شادی کا بھرم بھی بنا رہے گا اور نمو پہلے ہی کی طرح پابندی سے ان کا لنچ دوکان پر پہنچانے پر بھی مجبور رہے گی۔

مگر شادی کیا ہوئی اِس تین پیسے کی چھوکری کی کہ اُس کے تو جیسے پر لگ گئے۔ ڈاکٹر دیو

نے کنیا دان خود کیا تھا۔ پوتر اگنی کے سامنے مقامی آریہ سماج کے ودھوان پنڈت جی نے نئے دمپتی کو ہندو اِستری پُرش کا رِشتہ سمجھاتے ہوئے فرض اور حق کا فلسفہ کچھ اِس طرح سمجھایا تھا کہ سب کے سامنے دیئے ہوئے قول وقرار لڑکی کے ذہن میں جم کر بیٹھ گئے اور اُس نے سہاگ رات کے بننے بگڑنے کی پرواہ کئے بغیر اپنے اور ڈاکٹر دیو کے اصلی رشتہ سے شوہر کو آگاہ کر دیا۔

لڑکا معمولی پڑھا لکھا تھا۔ غریبی کی وجہ سے جسمانی طور پر بھی کمزور و لاغر تھا۔ پوری طرح برسرِ روزگار بھی نہ تھا مگر تھا تو آدمی ہی کی اولاد۔ کہانی سُن کر ایک دم بپھر گیا۔ اغلب تھا کہ کچھ کر بیٹھے مگر نمو نے سمجھا بجھا کر شانت کر دیا۔ دُشمن اپنے سے طاقت ور ہو تو اُسے للکار کر ہرایا نہیں جا سکتا۔ بدلہ لینے کے بہت مواقع آئیں گے۔ وہ میری ماں کا قاتل ہے۔ میری عزت وآبرو کا قاتل ہے۔ اِس کی سزا کوئی چھوٹی موٹی ضرب نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اُس کے جسم میں گھاؤ لگیں تو اُن میں مرہم کی بجائے نمک مرچ لگائی جائے۔ مجھے اُسے تڑپانا ہے ذلیل کرنا ہے۔ ساری برادری میں رُسوا کرنا ہے۔

نمو میکے آئی۔ شوہر بھی ساتھ آیا۔ سب سے ایسے ملا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

ساوتری کے والد نے سنا تو تلملائے۔ اب اس لڑکی کا یوں کھلے بندوں آنا جانا مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ اُس کے شوہر کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے۔

ساوتری نے باپ کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ لڑکی نے ساری بات خود ہی شوہر کو سمجھا دی لگتی ہے۔ کیونکہ وہ اِدھر آتا جاتا تو ہے مگر بیوی کو اکیلا ایک پل کے لیے بھی نہیں چھوڑتا۔

نمو تب تک آتی جاتی رہی جب تک اُس نے دیو سے اپنی مرحومہ ماں کے سارے زیور اور روپے ہتھیا نہیں لیے۔ پھر اُس کا آنا جانا ایکدم بند ہو گیا۔

پرتاپ نے سُنا تو بہت ہنسا۔ موسمِ خزاں کا عشق ایسا ہی ہوتا ہے پیارے۔ چار فٹ کی چھوکری تمہارا چھ فٹا قد چھوٹا کر گئی۔ بھئی داد دینی پڑتی ہے اِس عورت ذات کو۔ کیسے ٹیڑھی اُنگلی سے گھی نکال کر لے گئی۔

میں نے پہلے خیال نہیں کیا تھا۔ مگر اب جب اندازہ لگایا ہے تو دیکھا ہے اپنی ماں کے سارے زیورات کے علاوہ وہ اپنی ماسی کے بھی کتنے ہی زیور لے گئی ہے۔ اور نقدی! اپنی ماں کا ایک ایک روپیہ۔ شادی پر جو خرچ ہوا وہ علیحدہ۔

روپیہ ہاتھ کی میل ہے پیارے۔ پھر کون تمہارا اپنا تھا۔ جیسے آیا تھا ویسے چلا گیا۔ بات ایک جوان جسم کی ہے جس کی لذت سے تم محروم کر دیئے گئے ہو۔

چھ سات مہینے کا وقفہ بہت ہوتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے اپنی بیٹی ہوتی تو — میں نمو کو لینے جا رہا ہوں۔ ساوتری چپ رہی۔ لڑکے بھی چپ رہے۔

ڈاکٹر صاحب نمو کے سسرال گئے تو ان کی خوب خاطر ہوئی ایسی کہ دوسرا کوئی ہوتا تو ندامت سے کچھ کھا کر سو جاتا۔ اِس نئے قصبہ میں انہیں کون جانتا تھا۔ نمو کے سسرال والوں نے پہلے اُس کا سر مونڈھا۔ پھر ابروؤں اور مونچھوں کا صفایا کیا۔ پھر سارا جسم ننگا کر کے اس پر تارکول کا لیپ کیا اور ایک لنگڑے گدھے پر بٹھا کر سارے قصبہ میں گھمایا، پھرایا گیا۔ جس کے ہاتھ میں جو آیا اُس نے اُسی سے اُن کی پٹائی کی۔ پٹ پٹا کر اور خوب رسوا ہو کر وہ دوسرے دن گھر لوٹے، مگر مجال کہ ذرا بھی ملال لائے ہوں دل پر۔

اب لنگوٹیے پرتاپ سے ہنس ہنس کر اپنی رسوائی کی تفصیلات بتانے لگے۔ اُنہوں نے میرے جسم کو تارکول سے پوت دیا مگر میں برابر مسکراتا رہا۔" اتنا بھنہ نہ ملو یارو میں پہلے ہی بہت خوب صورت ہوں "

پرتاپ اور وہ دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔

بھئی تم واقعی گورو ہو۔

میں نے مٹی کا مادھو چنا تھا نمو کے لئے اور سوچا تھا کہ دنیا داری رہ جائے گی۔ اپنا کام بھی چلتا رہے گا۔ مگر لڑکا تو ایکدم آدمی کا بچہ نکلا یار۔ مجھے اب اطمینان ہے تو یہی کہ نمو کسی ایرے غیرے کے نہیں ایک بھرپور مرد کے گھر گئی ہے۔ اور خدا کے فضل سے ماں بننے والی ہے۔

پرتاپ نے بھی حامی بھری۔ ٹھیک ہے ویسے افسوس بس اتنا ہی ہے یار میرے کہ تُو نے ہمیں لاروں میں رکھا۔ نہ مائی سے ملاقات کرائی نہ شانتی سے اور اس کی بیٹی سے بھی ملایا تو ایک دو بار ہی، جبکہ ہم نے تجھے اپنی دونوں بہوؤں کا سواد درجنوں بار چکھایا ہے۔

تو گریٹ ہے یار مگر رامو کی شادی ہونے دے مجسٹریٹ کی بیٹی ہے۔ ایکدم شعلہ۔ سارے گلے شکوے دور کر دوں گا۔

رام دیو کی شادی ہوئی تو ساوتری نے ہفتہ بھر میں ہی بیٹے اور بہو کو سکھا پڑھا کر

گھر سے بھگا دیا۔

ڈاکٹر دیو نے خاصا ہنگامہ کھڑا کیا، مگر کیا کر سکتا تھا۔ بہو ملازمت کرتی تھی اور سُسر نے رام دیو کے لیے بھی خاصی اچھی ملازمت کا اِنتظام اپنے ہی شہر میں کرا دیا تھا۔

پرتاپ سنگھ ساری واردات سن کر بولا۔

"جبھی تو کہا کرتا تھا میری جان کہ موج مارنی ہے تو بیٹے کو بڑا ہونے سے پہلے ہی بیاہ دے۔ کچی کونپلیں مروڑی توڑی جا سکتی ہیں۔ پکے مضبوط تنے ہلائے ڈھلائے بھی نہیں جا سکتے۔ مگر تیرے کو کیا دوش دوں۔ تیرے ہاتھ حلوے میں اور سر کڑھاہی میں تھا اُن دنوں نام دیو کی شادی ہوئی تو وہ پہلے ہی دن باپ سے جھگڑ کر الگ ہو گیا اور امیر بیوہ ساس کا گھر جمائی بن بیٹھا۔"

یہ پنچھی بھی اُڑ گیا۔

اِس بیچ ڈاکٹر دیو کے سُسر کا دیہانت ہو چکا تھا۔ آنکھ کی تھوڑی بہت شرم جو بھی اُس اصول پرست بڈھے کے دم سے تھی جاتی رہی اور ڈاکٹر دیو ایکدم بے لگام شریر ہرن کی طرح کلانچیں بھرنے لگا۔

مقامی مندر کے پجاری کی اکلوتی بچی نے بمشکل پندرہویں سال میں قدم رکھا تھا کہ دُر بھاگیہ سے پرتاپ حلوائی کی نظر اُس پر پڑ گئی اور چوتھی جماعت میں چار بار فیل کرشن دیو دجو سولہویں سال میں تھا، کی شادی اُس بچی سے کرا دی گئی۔ شادی کی رات ہی وہ ناخلف بیوی کے زیورات اور ہزار بارہ سو کی نقدی لے کر فرار ہو گیا۔ بہو لاجونتی کو لے کر دیو بیٹے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ پہلے دو ہفتے شملہ میں رہا پھر اِدھر اُدھر بھٹکا کیا۔ ہلکی پھلکی اکہرے بدن کی لاجو جس نے زندگی میں کبھی بھر پیٹ نہ کھایا تھا۔ دو ہی مہینے میں جسم کے سارے راز سمجھ گئی۔ بہو اور سُسر گھر لوٹے تو بڑے خوش تھے۔

ہر دوسرے تیسرے مہینے ڈاکٹر دیو خبر اُڑا دیتا کہ کرشن دیو دلی میں ہے یا امرتسر میں ہے۔ بہانا بنا کر وہ بہو کے ساتھ کبھی اِس شہر تو کبھی اُس شہر کو چل دیتا۔ پرتاپ چچا کی لذیذ مٹھائیاں اور نئے نئے شہروں کی مرغن غذائیں کھا کھا کر لاجو ایک ہی سال میں بھرپور عورت دِکھنے لگی تھی۔ چھوٹے دیور رِشی دیو کو اُس نے اپنا رازدار بنا لیا تھا۔ دو ڈھائی سال بعد جب کرشن دیو گھر لوٹا تو فوجی بھگوڑا تھا۔ لاجونتی کو اُسے سونپ کر

اب ڈاکٹر نے رشی دیو کا بیاہ رچایا۔ باپ بیٹا ایک دوسرے کے راز دار تھے۔ لہٰذا دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ تیسرا بیٹا کرشن دیو بھی راہ راست پر آگیا تھا۔ تینوں مل کر شراب پیتے۔ مرغ بھون بھون کر کھاتے اور مزے لے لے کر ساوتری کو گندی گندی گالیاں دیتے۔

ایک طرف پُرانی بہو لاجونتی اور چھوٹی پرکاشنی اور دونوں کے نام نہاد کے شوہر کرشن دیو اور رشی دیو اور دوسری طرف پرتاپ ملوائی کی دونوں بہوئیں جن میں سے ایک کا شوہر گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اور دوسرے نے گلے میں رسّی ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ چار جوان عورتیں اور چار مرد۔ دو آدھے ادھورے نوجوان اور دو تندرست توانا بوڑھے۔

ایک دن ڈاکٹر دیو نے اپنے دوست سے مُسکرا کر کہا۔ حیرت کی بات ہے پرتاپ۔ ہم سب نے مل کر اتنے بیج ڈالے مگر گھاس کا تنکا تک اِن بنجر زمینوں سے نہ پھوٹا۔ چاروں کے پاؤں آج بھی نوٹنکی کی نچارنوں کی طرح ہلکے پھلکے ہیں۔

اچھا ہی تو ہے دیو ورنہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا کون بوٹا کس کا ہے۔ آج کل تیرا چھوٹا کبھی نہیں دیکھا۔

دیوان سب سے الگ تھلگ ہے۔ میری سب سے خوب صورت اور ہونہار اولاد۔ میرا ہر لڑکا کبھی نہ کبھی ضرور مجھ سے اُلجھا ہے۔ نامو کمبخت نے تو ایک بار مجھے پیٹ بھی دیا تھا ماں کی حمایت میں۔ یہی ایک بچہ ہے جو بچوں کی طرح رہتا ہے۔ اور ماں باپ کے جھگڑے میں کبھی دخل انداز نہیں ہوتا۔ لاجو اور پرکاشو نے سارے داؤ پیچ آزما کے دیکھ لیے۔ مگر یہ لڑکا تو جیسے کوئی جنم کا سنیاسی ہے۔

ساوتری کو جتنا ناز اپنے رامو اور نامو پر تھا اُس سے سوگنا اپنے اِس بیٹے پر ہے۔ مُجھے تو لگتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہی نہیں ہے۔

ساوتری بھابھی کے لیے ایسے الفاظ زبان سے نکالتے ہوئے تُجھے لاج نہیں آتی سالے۔ تیری بیوی تو ستی سادھوی ہے ایک دم ہماری دیومالا والی ساوتری۔

نہ جانے کیوں میرا ایمان رہا ہے کہ حرام کی اولاد بڑی انوکھی چیز ہوتی ہے۔ اب دیکھو نہ اِس لڑکے کو کھیلوں میں اے ون۔ پڑھائی میں اے ون۔ ہمیشہ اول آتا ہے۔ دیکھنے میں تو نظر بد دور، فرشتوں جیسا لگتا ہی ہے۔

تجھے نمو تو یاد ہوگی یہ کمبخت رامو، نامو اور کرشن اُس سے راکھی بندھواتے تھے۔

مگر جب کبھی موقعہ ملتا ـــــ مگر مجال ہے جو دیو نے اِس قسم کی ہلکی حرکت کبھی کی ہو میرے کہنے بلکہ اصرار کرنے پر بھی اُس نے نمو سے راکھی بندھوانے سے اِنکار کر دیا تھا۔ مجھے بڑی لاج آئی تھی جب اُس نے کہا تھا۔

"جس بندھن کی اہمیت آپ سمجھتے نہیں بابوجی اُس کی چرچا کیوں کرتے ہیں"

کیا واقعی۔۔

نہیں تو کیا۔ مجھے اپنے آپ پر کبھی گلانی ہوئی ہے تو اُسی ایک دن اُس کے بعد میں نے وہ بات کبھی نہیں چھیڑی ـــــ مگر میرے اندر میری بے غیرت آتما کے کسی کونے میں جو ایک باپ اب بھی کہیں چھپا بیٹھا ہے تو وہ محض اِسی لیے کہ اُس کا ایک ایسا با اصول اور باکمال بیٹا بھی ہے۔ جہاں اپنی دوسری اولاد کو دیکھ کر میرا دل نفرت سے بھر جاتا ہے۔ اس بچے کو دیکھ کر میری چھاتی فخر سے پھول جاتی ہے۔ کیچڑ میں کمل والی بات کا سچ کہیں ہے تو وہ اِسی بچے کی ذات میں ہے ورنہ اِس بدبودار ماحول میں تو ہر چیز گندی ہے۔

پرتاپ جو اپنے بیٹوں سے دیو ہی کی طرح نالاں تھا کہنے لگا۔ تو سچ کہتا ہے دیوے اپنا دیو واقعی کوئی رِشی مُنی ہے۔ رامو اور نامو بھی نسبتاً اچھے تھے مگر اِس کی بات ہی الگ ہے۔

وہ دونوں سمجھدار تھے دُنیا دار تھے۔ شادیاں کرتے ہی مجھ سے الگ ہو گئے۔ مگر یہ لڑکا ہماری کبھی نہ سوکھنے والی بدبُودار دلدل میں بھی کنول کے پھول کی طرح جما رہا ہے۔ اپنے ماحول سے ماوراو بے نیاز۔

آج جانے پرتاپ چچا کو کیا ہو گیا تھا۔ دیو کی بات کرتے کرتے اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ تو اِس کا بیاہ خوب ٹھوک بجا کر کرنا۔ ایسی بہو لانا۔ جسے تو من وچن سے اپنی بیٹی مان سکے۔

نہ جانے میں کس گندی مٹی کا بنا ہوں یار۔ میں کسی چھوٹی سی بچی کو بھی دیکھتا ہوں تو میرے من میں میل آجاتی ہے۔ میں بڑا بد بخت ہوں یار۔

اپنا بھی ایسا ہی حال ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تیرے میرے ہاں کوئی بیٹی نہ ہوئی تو ٹھیک کہتا ہے۔ بیٹے کی بہو بھی تو بیٹی ہی ہوتی ہے۔ جب ہم نے۔

چھوڑ یار آج ہم ایک دوسرے کو کہاں گھسیٹے لئے جا رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں ایسی کیفیت ہر گناہ گار پر کبھی نہ کبھی ضرور طاری ہوتی ہے۔ ایک بریک کی طرح تاکہ وہ دم بھر کے لیے رک کر اپنی سچوایشن کا تجزیہ کر سکے۔

آج میں بے حد اداس ہوں۔

رات پرکاشو سے سر میں تیل ڈلوانا۔ تیرا سر بھاری ہو گیا ہے۔

زندگی کی اپنی ایک چلن ہے نہ جانے ایکا ایک کیا ہو گیا کہ پرتاپ حلوائی نے ایک رات اپنی بیوی اور دونوں بہوؤں کو قتل کر ڈالا۔ چھوکریاں بدچلن تھیں۔ مگر ذمہ دار کون تھا۔ بیوی بیچاری تو گائے تھی۔ کہاں تک سنبھالتی ایسی چھناروں کو جن کو سسر نے ہی سر پر چڑھا رکھا ہو۔

بڑا عبرتناک منظر تھا۔ فرش پر تین لاشوں کے ٹکڑے جا بجا بکھرے پڑے تھے۔ اور چھت سے پرتاپ کی مردہ لاش لٹک رہی تھی۔

ڈاکٹر دیو پر اِس حادثہ کا بڑا عجیب اثر ہوا۔ اس نے کئی دن تک دوکان نہ کھولی کئی دِن تک ساوتری کے کمرے سے باہر نہ نِکلا۔

آخر ایک روز اس نے اپنے پانچوں لڑکوں اور برادری کے چند بزرگوں کو اکٹھا کیا۔ اور سب کے سامنے اپنی جائیداد کا بٹوارہ کر دیا۔ بڑے لڑکوں نے نقدی کو مکان اور دوسری لوازمات پر ترجیح دی۔ سب سے چھوٹے دیو نے کہہ دیا کہ اُسے اپنی ماں کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔ لہٰذا ڈاکٹر دیو نے بڑا گھر بیوی کے نام لکھ دیا۔ اور ماں اور بیٹے کو وہاں چھوڑ کر خود لاجو اور پرکاشو کو لے کر شہر کے باہر والے اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گیا۔ کرشن اور رشی بھی دو وفادار کتوں کی طرح ساتھ چلے گئے۔ تھوڑی ادل بدل کے بعد زندگی پھر اپنے پرانے ڈھنگ سے چلنے لگی۔ روز روز کی چیخ چیخ البتہ اب کافی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ اور سب نئے حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنی اپنی جگہ صبر و اطمینان سے گذر بسر کرنے لگے تھے۔ کبھی کوئی بیمار ٹھمار ہوتا تو دوسرے آکر اُسے ایک نظر دیکھ جاتے۔ بس ایک نام کا رشتہ تھا۔ جو کسی طرح لڑھک رہا تھا۔

لندن سے ساوتری کی چھوٹی بہن ہندوستان آ رہی تھی۔ ساتھ میں اُس کا شوہر ہوگا اور تین بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ لڑکی سب سے بڑی تھی، دیو کی عمر کی سارے پریوار میں اُس کے بے پناہ حسن کی دھوم تھی۔ یہ لڑکی ایک بار پہلے بھی ہندوستان

آئی تھی۔ مگر ڈاکٹر کے اصرار کے باوجود ساوتری نے اُسے اپنے گھر نہ بلایا تھا۔ اپنے باپ کے ساتھ اپنے چھوٹے چچا کی شادی میں شمولیت کے لیے آئی تھی، باپ ہی کے ساتھ شادی نبٹا کر لوٹ گئی۔ باپ بیٹی بس ایک ہی بار رسمی طور پر ان کے گھر جائے پر آئے تھے۔ ڈاکٹر دیو لڑکی کو ایک نظر دیکھ کر ہی اُس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور باپ بیٹی کے چلے جانے کے بعد اُس نے کافی بڑا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ مگر ساوتری کسی طرح اپنے چھوٹے چچاجی اور بہن کی لڑکی کو اپنے گھر رہنے کے لیے بلانے پر راضی نہ ہوئی تھی۔

اِس گھر کا ماحول اِس معصوم بچی کے لیے مناسب نہیں۔ تمہارے بیٹے لوفر ہیں۔ اور تم خود ـــــ جس شخص نے اپنے سگے بھائی کی لاج نہ پالی، چھوٹی بیٹیوں ایسی معصوم بہوؤں تک کو خراب کیا، اُس کے گھر میں کسی بھی کنواری لڑکی کا آکر رہنا مناسب نہیں۔ میں نے اُنہیں جائے پر بلا کر رسم پوری کر دی۔ حالات کو دیکھتے ہوئے یہی کافی تھا۔

چھوٹا دیو بھی ملک کے دیور کی شادی میں گیا تھا۔ اور ایک دم گرویدہ ہو کر لوٹا تھا۔ اپنی ولیتی دیدی کا۔ دمن دیدی ایسی ہیں۔ دمن دیدی ویسی ہیں۔ بالکل میم لگتی ہے۔ انگریزوں کی طرح انگریزی بولتی ہے۔

سالے یہ دیدی۔ دیدی کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ ڈاکٹر دیو نے خفا ہو کر بیٹے کو ڈانٹا تھا۔

بہن کو دیدی نہیں کہے گا تو کیا کہے گا۔ چمک کر ساوتری نے جواب دیا تھا۔

ہم صرف ماں جائی بہن کو بہن مانتے ہیں۔

کون جانے ـــــ ساوتری نے طنز کیا تھا۔

کیا کہا حرام زادی۔ ڈاکٹر دیو بیوی کو مارنے کے لیے لپکا تھا، مگر بڑے لڑکے رام نے راستہ روک لیا تھا۔

میں تیرا سر قلم کر دوں گا بے غیرت بڈھے جو تو نے کبھی بھولے سے بھی میری ماں پر ہاتھ اُٹھایا۔ اُس نے باپ کو پرے دھکیل دیا تھا۔

غصہ سے کانپتا ہوا دیو جھاگ کی طرح سکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

آج اِس واقعہ کے تین سال بعد وہ پھر آ رہی تھی۔ اپنی ماں اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ۔

دیکھ لوں گا اِس تین ٹکے کی چھوکری کو جس نے مجھے اپنی اولاد کے ہاتھوں ذلیل کرایا تھا۔

دینتی آئی تو جیسے ہوا کا تازہ جھونکا آگیا سب کی زندگیوں میں۔ اب وہ کوئی تین ٹکے کی چھوکری نہ تھی۔ بیس بائیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ جس کے خدوخال خدا کے اپنے ہاتھوں کے گھڑے لگتے تھے۔ زندگی اور جوانی کی مستیاں اُس کے بدن کی بوٹی بوٹی سے پھوٹی پڑتی تھیں۔ ڈاکٹر دیو اُسے دیکھتے ہی سرشار ہوگیا۔ ظاہرہ طور پر وہ اُسے بیٹی۔ میری اپنی بیٹی کہہ کر بلا رہا تھا۔ مگر اُس کے اندر ایک پرانا ٹوٹا ریکارڈ وہی ایک دھن بجائے جا رہا تھا "دیکھ لوں گا اِس تین ٹکے کی چھوکری کو جس نے مجھے اپنی اولاد کے ہاتھوں ذلیل کرایا تھا۔ دیکھ لوں گا۔ دیکھ لوں گا۔"

وہ لوگ لندن سے بچوں کی شادیاں کرنے آئے تھے۔ پروگرام تھا کہ دنتی کا بیاہ کر کے اسے ادھر ہی چھوڑ جائیں گے اور لڑکوں کی بہوئیں لے کر واپس لندن لوٹ جائیں گے۔ کوئی ایک دو دن کا پروگرام تو تھا نہیں پورے تین مہینے کی چھٹی لے کر آئے تھے وہ لوگ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ ڈاکٹر دیو کے ہم زلف۔ اب چونکہ سب الگ الگ رہتے تھے۔ لہٰذا ساوتری نے بہن اور بہنوئی کو اپنے ہی پاس رکھ لیا۔

چھوٹا دیو بہن اور نئے بھائیوں پر لٹو تھا۔ بہن اُسی کی ہم عمر تھی اور بھائی نسبتاً چھوٹے تھے۔ ہر کسی سے اِن تینوں کے بے شمار گنوں کا بکھان کرتا رہتا۔ باپ اور بھائیوں سے بھی اِن کا ذکر خوب بڑھا چڑھا کر کرتا۔

ایک دن ڈاکٹر دیو نے دیو کو سو سو کے پانچ نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔ دیکھو دیو بیٹے یہ لوگ ولایت سے آئے ہیں۔ ان کی خاطر مدارت میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ رہنی چاہیے۔ جتنے روپے جب درکار ہوں بے کھٹکے مانگ لینا۔ یہ ہماری عزت کا سوال ہے

اُس روز چھوٹے دیو کو اپنا باپ بہت اچھا لگا۔ باپو ایکا ایک اتنا مہربان کیوں ہوگیا ہے یہ اُس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ ڈاکٹر دیو واقعی بہت بدل گئے تھے۔ ہر صبح و شام مندر جانے لگے تھے۔ اور دارو پینا بھی ایک دم چھوڑ دیا تھا۔ ساوتری اس تبدیلی سے بڑی مطمئن اور مسرور تھی۔ بھگوان سب کی سنتے ہیں۔ سو سال بعد تو روڑی کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔

ایک دن دیوساوتری کے کمرے میں بیٹھے اُس کے ہاتھوں کی بنی کھیر کھا رہے تھے کہ ایکا ایک اُن کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ تمہارے ہاتھ کا کھانا میں کتنی دیر بعد کھا رہا ہوں۔ تمہارے ہاتھ میں تو جیسے کوئی جادو ہے ساوتری۔ اِتنی اچھی کھیر چھوڑ کر میں شکاری کتوں کی طرح گوشت اور ہڈیاں چباتا رہا ہوں آج تک۔

ساوتری جو پاس بیٹھی ہوئے ہوئے پنکھا جھل رہی تھی مُسکرا کر بولی۔ میں جانتی تھی کہ تم دل کے بُرے نہیں ہو۔ تم بری صحبت کا شکار تھے۔ بھگوان کی کرپا سے تمہارے راہو کیتو خود ہی مر کھپ گئے ہیں۔

بھگوان جانے ساوتری کیا بات ہے دمینتی کو دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے وہ تمہاری بہن کی نہیں تمہاری اپنی بیٹی ہو۔ اِس میں میرا اور تمہارا بہت کچھ ہے۔ اپنے بھائیوں سے کتنی الگ الگ سی لگتی ہے۔ اے کاش ہماری کوئی اپنی بیٹی بھی ہوتی۔ کم از کم میں اس طرح بھٹک تو نہ جاتا۔

شوہر کی باتوں میں خلوص کی جو مہک تھی، ساوتری کو بہت بھائی۔ وہ اپنے ماضی پر شرمسار تھا۔ ایک قطعی انوکھی قسم کی ندامت اور پشیمانی کا پانی تھا اُن کی آنکھوں میں۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی برس پڑیں اور اُس نے وفورِ محبت سے شوہر کے پاؤں اپنے سینے پر رکھ لیئے۔

کبھی کبھی خود میں نے بھی تمہارا امنگل چاہا ہے۔ جو اِستری کا دھرم نہیں میں بھی تمہاری گناہ گار ہوں۔

میرے جیسے ابھاگے کی سزا اِس سے بھی بڑی ہے۔

ایک روز اِسی قسم کی موڈ میں میاں بیوی بیٹھے گھریلو چرچا میں مصروف تھے کہ ساوتری نے تجویز پیش کی۔ میں نے بہن سے بات کی ہے اُسے اور اُس کے شوہر کو تمہارے بارے میں کچھ بھی علم نہیں۔ اگر تم رضامند ہو تو ہم دمینتی کو گود لے لیتے ہیں۔

اِتنی بڑی لڑکی کو گود لینا۔ کیا کہتی ہو۔

میرا مطلب ہے ہم دمینتی کو اپنی بیٹی بنا لیتے ہیں اور اِس کی شادی بھی ہم ہی کریں گے اپنے خرچ پر۔

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں ایک چھوڑ دس لڑکیوں کی شادیاں کرنے

کا دم خم رکھتا ہوں۔ میرے پاس کتنا سونا اور کتنا روپیہ ہے اِس کا تو خواب میں بھی اندازہ نہیں لگا سکتی۔

بات چلائی گئی ڈاکٹر دیو کی حیرانی کی حد نہ رہی جب دمینتی کے ماں باپ نے تجویز منظور کر لی۔ مگر بھائی ایک شرط ہماری بھی ہے۔

فرمایئے۔

چھوٹا دیبو ہمارے لڑکوں سے ہل مل گیا ہے وہ اُسے اپنا بڑا بھائی سمجھنے لگے ہیں دمینتی آپ کی رہی اور دیبو ہمارا۔

ہنسی ہنسی میں چلی بات ایک دم پکّی ہو گئی۔ بھری برادری میں ڈاکٹر دیو نے دمینتی کو اپنی بیٹی تسلیم کرتے ہوئے حلف لیا کہ وہ نہ صرف اُس کی شادی اپنے خرچ سے کریں گے بلکہ جائیداد کا معقول حصہ بھی اُس کے نام کر دیں گے۔

اپنے دونوں بیٹوں اور دیبو کی شادیاں کر کے اور بہوؤں کو ساتھ لے کر وہ لوگ واپس لندن لوٹ گئے اور دمینتی ساوتری کے پاس رہ گئی۔ ڈاکٹر دیو بھی اِدھر ہی آ بسے۔ بیٹی ماں اور باپ ــــ زندگی مزے سے کٹنے لگی۔

کوئی فرمائش ایسی نہ ہوتی بیٹی کی جو آن کی آن پوری نہ کی جاتی۔ عجب بات تھی کہ دمینتی کو بھی یہ بھونچال ایسی ادل بدل کوئی ایسی بُری نہ لگی تھی۔ اور وہ موسی کو ماں اور موسا کو باپ مان کر نئے ماحول کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

ساوتری دیکھتی کہ اُس کا شوہر کبھی کبھار اُکھڑا اُکھڑا اُداس دکھائی دینے لگتا ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ماں بیٹی طرح طرح سے اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرتیں۔ دِن بدل گئے تھے۔ ڈاکٹر دیو اب بھولے بھٹکے بھی اپنے دوسرے لڑکوں کے پاس نہ جاتے تھے۔

وہ لوگ بھی دوسروں کی طرح باپ کے اِس کایا کلپ پر حیران تھے۔ ساوتری کی بیوہ ماں اکثر کہتی۔ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا ہے۔ اب اِسے اِسی طرح رکھے رکھنا تمہارا کام ہے ساوتری۔

بیٹی باپ کے ساتھ اکثر بازار جاتی۔ جو مانگتی اُسے مل جاتا۔ اُس کے مشوروں سے گھر کا بھی کلیان ہو گیا۔ دیواریں توڑ توڑ کر کمرے کشادہ کیے گئے۔ فرش بدلے

گئے۔ غسل خانوں، رسوئی گھر اور دوسرے کمروں کو بھی نئے رنگ روپ اور لباس سے ملبوس کیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کا وہ معمولی سا پُرانا گھر ایک قطعی جدید طرز کے بنگلے میں تبدیل ہو گیا۔ گھر کے مکینوں کے رہن سہن کا ڈھنگ بھی اِتنا بدل گیا کہ وہ لوگ اب پہچانے میں نہ آتے تھے۔

دیپتی کے رِشتہ کی بات چل رہی تھی۔ درجنوں لڑکے دیکھے گئے۔ کسی کو باپ نے پسند نہ کیا تو کسی کو بیٹی یا اس کی نئی ماں نے۔ وہ ہر رِشتہ کی بات مزے لے کرتے۔ میں اپنی بیٹی اُسی لڑکے سے بیاہوں گا جو اُس کے قابل ہو گا۔ بیٹی کو باپ کی پسند پر اعتبار تھا۔ ہر کسی کو ہر کسی پر اعتبار تھا۔ ماں باپ اور بیٹی ایک زبان بولتے۔ ایک ڈھنگ سے سوچتے۔ زِندگی کے ہر زاویہ کو دیکھنے بھالنے اور پرکھنے کی اُن کی کسوٹیاں بھی اب ایک جیسی تھیں۔ زِندگی لفظ کے اصلی معنوں میں مناسب ڈھنگ سے جی جا رہی تھی۔ تین جنوں کے اِس گھر میں کہ ایک دن۔

دوپہر کا وقت تھا۔ ساوتری پچھواڑے گلی میں محلے کی عورتوں کے ساتھ بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھی کہ اچانک ڈاکٹر دیو لوٹ آیا وہ دوپہر کو کبھی گھر نہ آتا تھا۔ مگر اُس روز کسی مقامی لیڈر کی اچانک موت کی وجہ سے بازار احتراماً بند کر دیا گیا تھا۔

گھر کی نوکرانی نے بھی اُسے اندر آتے نہ دیکھا۔

ڈاکٹر دیو نے باری باری سب کمروں میں گھوم کر دیکھا۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ اُس نے کوٹ اُتارا، نکٹائی اُتاری قمیض کے بٹن کھولے، جوتے اُتارے، الماری سے لُنگی نکال کر پینٹ اُتار رہا تھا کہ اُس کے کانوں میں ایک دھیمی دھیمی بڑی ہی خوشگوار دُھن کے بول گونج اُٹھے۔ بول بڑے پیارے تھے۔ یہ کون گا رہا تھا۔ یہ آواز جانی پہچانی نہ تھی۔ قطعی نئی اور انوکھی تھی۔ لُنگی پہن کر وہ باہر نکل آیا اور لاشعوری طور پر اُس طرف بڑھنے لگا جدھر سے الاپ کے بول آ رہے تھے۔ غسل خانہ میں کوئی گا رہا تھا۔ کون ؟ وہ ٹھٹھک گیا۔ نہانے والا غسل خانہ کا دروازہ اندر سے بند کرنا بھول گیا تھا۔ قریب جاکر اُس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ بجلی کی جھلملاتی روشنی میں اپنی چھاتیوں کو دونوں ہاتھوں میں پالتو کبوتروں کی طرح پکڑے قد آور شیشے کے سامنے کھڑی دیپتی اپنے بے پناہ حُسن اور جسم کی دلکش بناوٹ پر دِل ہی دِل میں اِترا رہی تھی۔ اِتنا حُسن اِتنی بھرپور جوانی

ایسا تنا ہوا بدن۔ ڈاکٹر جیسے مدہوش سا ہو گیا اور اُس کے سارے بدن میں کپکپی سی آگئی۔ سارا خون لپکتا بھاگتا اُس کے سر میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور چہرہ جیسے ایک شعلہ بن گیا۔ اُس کا سارا جسم کسی بُھولی بھٹکی چاہت سے تن گیا۔ اور بدن کی بوٹی بوٹی کسی انجانے خوف سے لرزنے لگی۔ وہ ایک بے جان مجسمہ کی طرح وہیں جم گیا اور کتنی ہی دیر تک دمینتی کے عریاں جسم کو گھورتا رہا۔ یہ کوئی معمولی منظر نہ تھا۔ اور جنون جو اس کے ذہن کو چھیلتا شل کرتا جا رہا تھا بھی معمولی نہ تھا۔ وہ کب غسل خانہ میں داخل ہوا اور کیسے آگے بڑھ کر اُس نے دمینتی کو جو شاید اُسے اپنی طرف اِس طرح بڑھتا دیکھ کر بے ہوش سی ہو گئی تھی۔ گود میں بھر لیا اور ایسے ہی اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ کب اور کیسے اس نے اپنے کپڑے بھی اُتار پھینکے۔ اور ——

ہوش آیا تو دیکھا کہ دمینتی الف ننگی اوندھے منہ لیٹی سسک رہی ہے اور اُس کی کمزور اور ناتواں ساوتری ایک دم چنڈی کا روپ دھارے اُس پر گھاس کاٹنے والے گنڈاسے وار پر وار کیے جا رہی ہے۔

پاپی۔ نرلج۔ کمینے۔ چنڈال آج تو نے وہی کیا جس کے خوف سے برسوں پہلے اِسے جنمتے ہی میں نے غیروں کے حوالے کر دیا تھا اور بدلے میں اُن کا بیٹا لے لیا تھا۔ کتے کی اولاد، حرامی پلّے۔

یہ تیری منہ بولی نہیں۔ تیری اپنی بیٹی ہے۔ تیرا اپنا خون۔ وہ اپنا بیٹا لے گئے اور چھوڑ گئے اِس ابھاگن کو یہ دِن دیکھنے کے لئے۔ مگر میں تجھے آج زندہ نہ چھوڑوں گی۔ تو ہزار بار کُتّے کے جنم میں اِس دھرتی پر آئے گا تب بھی تیرا یہ پاپ نہ دُھلے گا۔ تو ابھیشاپ تھا ہم سب کے لیے۔ تو مرد کی ذات پر کلنک تھا۔

چند ہی منٹوں بعد ساوتری کی چیخیں سُن کر آس پڑوس کے لوگ اکٹھے ہوئے تو دیکھا کہ ساوتری اب چپ ہے اور بڑے اطمینان سے شوہر کی مردہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جا رہی ہے اور پاس والے کمرے سے دمینتی کی سسکیوں کی آواز آ رہی ہے۔

جن لوگوں نے ایسا ہی منظر پرتاپ حلوائی کے گھر چند سال پہلے دیکھا تھا۔ وہ ایک نظر دیکھ کر ہی ساری واردات بھانپ گئے۔ کسی نے بڑھ کر ساوتری کا ہاتھ

نہ پکڑا۔ نہ کسی نے دوسرے کمرے میں رونے والی کے آنسوؤں کو روکنے کی ہی کوشش کی۔

یہ قتل نہ تھا۔ سزا تھی۔ قدرت کا شاعرانہ اِنصاف جِس کو عمل میں لانے کے لئے کسی قاضی یا منصب کے قانونی فرمان کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔

طِلسم ہوش رُبا

"سلطان صاحب آپ بڑے گاؤدی ہیں، اب یہ سالن کیا آپ کے ابا مرحوم کھائیں گے کمبخت زہر ہو رہا ہے۔"

سلطان میاں چپ چاپ کمرے کے کونے میں کھڑے رضا بھائی کی گالیاں سُن رہے تھے۔ بیچارے کہتے بھی کیا، حرکت ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی ان سے۔

"لے چھوڑ غصّہ اور کھا موتی چور کے یہ لڈو۔ جب تقدیر میں لڈو لکھے ہوں میاں تو سالن سالا کیا کرے گا؟"

"تو ہر بڑی بات کو سکیڑ کر چھوٹ اور غیر اہم بنا دیتا ہے۔ تیری یہ حرکت مجھے قطعی نہیں بھاتی۔ کل دوپہر سے میں نے ڈھنگ کا کچھ نہیں کھایا۔ اللہ قسم رات بھر کام میں مصروف رہا۔ صبح ناشتہ کے لیے آنجناب مرغ بھون رہے تھے۔ چنداں چاہتے ہوئے بھی چائے کے ساتھ ہم نے کچھ نہ لیا۔ مبادا مرغ کے ساتھ ناانصافی ہو جائے اور مرغ پکا ہے تو —"

"بھئی ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"تو خود ہی چکھ کر دیکھ لے نہ۔"

"ارے تھوک غصّہ یار میرے اور چل میرے ساتھ آج شیرِ پنجاب میں مرغ مسلّم کھلاتا ہوں اس نمک بھرے مرغ کا بھی کچھ کریں گے۔ مگر بعد میں۔"

"تو میرا ایمان خراب کرنا چاہتا ہے؟"

"اتنا کمزور ہے تیرا ایمان جو ایک اچھے بھلے سکھ کے ہاتھ کا کاٹا اور پکا مرغ کھانے سے ہی متزلزل ہو جائے گا۔ میں روز تیرا گوشت کھاتا ہوں۔ میرے ایمان کا تو کچھ نہ بگڑا۔"

میرا گوشت تو کیوں کھائے گا کمبخت — مگر تو تو کافر ہے۔

علی رضا کا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ لڈو منہ میں ڈالتے ہوئے سلطان میاں کی طرف دیکھ کر مسکرائے — "ایکٹر بننے آئے تھے بمبئی میں، بیچارے کوئی خاندانی باورچی تھوڑے ہی ہیں۔"

سلطان نے بتیسی نکالی۔ اچھا خاصہ دلہن بننے کی صلاحیت تھی اس کے چہرے میں۔ آواز بھی ماشاء اللہ خاصی مردانہ تھی۔

"اب آپ کی سزا یہی ہے کہ لڈو چباتے چباتے دفع ہو جائیں اور سیدھے سینٹرل سٹیڈیو پہنچیں اور وہاں منیر میاں کا پکا ہوا مردہ کتوں کا قورمہ کھائیں۔"

سلطان کی جان میں جان آئی، بڑی مسکین ادا سے ذرا اور کھل کر مسکرائے۔ چلنے ہی لگے تھے کہ رضا نے حکم فرمایا: "یہ میرا دس سیر کا بستہ بھی اٹھا کر لے جائیں۔ میں کافر ہونے جا رہا ہوں۔"

٭ ٭ ٭

اس روز دوپہر دو ڈھائی کے قریب ہم بیلا ڈبیر لوٹے تو دیکھا کہ علی رضا کا وہ ایک ہی کمرہ والا فلیٹ مقفل ہے۔ دروازہ پر ایک بھاری بھرکم علی گڑھی تالا لگا تھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے نجی بریف کیس کے علاوہ چند ضخیم کتابیں، تھوڑی سبزی اور پولسن کا پاؤ بھر مکھن بھی تھا جو ہم صبح والے گوشت کو سنوارنے کی غرض سے لیتے آئے تھے۔ اب یہ ساری خرافات کہاں پھینکیں۔ ابھی ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ اچانک نگاہ اسی کمرہ کے ساتھ والے دروازے پر جا ٹکی جس کے اوپر والا روشندان کچھ اس ترتیب سے کھلا تھا کہ اس میں سے چھوٹی موٹی چیزیں بڑے مزے سے اندر پھینکی جا سکتی تھیں۔ ہماری جان میں جان آئی۔ ہم نے کتابوں کا بنڈل کھولا اور ایک ایک کر کے ساری کتابیں یکے بعد دیگرے اندر پھینکنا شروع کر دیں۔ جب سبزی کی باری آئی تو اصل مشکل پیش آئی۔ اب اس موٹی تازی لحیم شحیم لوکی کو کس طرح اندر گھسیڑیں۔ جیسے ہی اُچک کر ہم نے روشندان کے ادھ کھلے پاٹ کو مزید کھولنے کی غرض سے پکڑا، دروازہ پر ہمارا بوجھ بڑھتے ہی اس کا ایک پٹ کھل گیا اور ہم اندر گرتے گرتے بچے۔ ہم ایکدم ہکا بکا رہ گئے۔

دروازہ کے اندر قدم ڈالتے ہی کیفیت سمجھ میں آ گئی۔ دروازہ میں ایک ہی چٹخنی تھی جو غلط تختہ پر لگی تھی۔ اور یہ دروازہ تب سے اسی طرح کھلا تھا جب سے اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی یا یہ دروازہ

بنا تھا۔۔۔ یعنی لعنت ہے ایسی الغرضی اور لاپروائی پر۔ پورے دو سال سے حضرت اس کمرہ میں تشریف فرما ہیں اور۔۔۔ بھئی حد ہوگئی۔

آنے دو علی بابا کو ہم بھی نہ بتائیں گے کہ بغیر تالا کھولے ہم اندر کیسے گھسے۔

اب اگر بغرض محال شام تک ان لوگوں میں سے کوئی بھی اِدھر نہیں آتا۔ تو ہم کریں گے کیا۔ اب جبکہ ہم نے جان ہی لیا ہے کہ کمرہ محفوظ نہیں تو اسے اس طرح بے سہارا چھوڑ کر جا بھی کیسے سکتے ہیں، خدا نہ کرے اگر کچھ ہو جائے تو؟

کیا ہو جائے گا۔ کمرہ میں ہے ہی کیا۔ دو معمولی قسم کے چھوٹے چھوٹے اٹیچی ہیں۔ دو تین درجن کتابیں ہیں چند پرانی سکرین پلے کی سکرپٹس اور کچھ برتن۔ ہو سکتا ہے کچھ نقدی وقدی بھی کہیں رکھی ہو کسی کونے میں۔

اب تو آپ اس کمرہ کے قیدی ہیں حضرت۔ تب تک نظر بند رہیے جب تک کہ ان لوگوں میں سے ایک آدھ آکر آپ کو نجات نہیں دلا دیتا۔

مگر وقت کیسے کٹے گا۔ کچھ پڑھا جائے، مگر پڑھنے والی عینک تو ہم اپنے ہوٹل میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ چلو سالن کو دیکھتے ہیں۔ وقت بھی کٹ جائے گا اور شام کا کھانا بھی تیار ہو جائیگا۔ یہی ٹھیک رہے گا۔ سلطان میاں دعائیں دیں گے۔۔۔۔۔

باقی کہانی، یعنی اس کہانی کا اصلی پلاٹ بتانے سمجھانے کے لیے ہمیں آپ کو اس کمرہ کا پورا جغرافیہ سمجھانا ہو گا۔ دو اطراف ننگی دیواریں، ایک طرف دو دروازے، ایک بیکار جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں، اور ایک مقفل یعنی جس پر باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔ اِس، یعنی ان دروازوں والی دیوار کے سامنے والی دیوار میں دروازوں کے عین سامنے دو بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جو پاٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کھلی رہتی ہیں۔ البتہ لوہے کی موٹی موٹی مضبوط سلاخوں نے انہیں چوروں سے محفوظ کر رکھا ہے۔ مقفل دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے بالمقابل پانی کا نل ہے جسے دو ڈھائی فٹ کی دو طرفہ دیوار نے کمرہ سے کسی قدر علیحدہ کر رکھا ہے۔ یہ جگہ فلیٹ کے مکینوں کا باتھ روم ہے۔ اور کپڑے اور برتن دھونے مانجنے کا کونہ بھی۔

جیسے ہی ہم نے کاٹنے کی غرض سے لوکی کو ہاتھ میں پکڑا 'چتاخ' کی آواز آئی اور ساتھ والے مکان کی ہمارے عین سامنے والی کھڑکی تڑاخ سے کھل گئی۔ سامنے جو منظر تھا، وہ زندگی میں ایک ہی بار دیکھا ہے' دوبارہ دیکھنے کی ہوس بھی نہیں۔

لیجئے آپ بھی دیکھئے۔ مگر آپ تو تبھی دیکھ سکیں گے نہ جو ہم دکھا سکیں گے۔ خیر کوشش کرنے میں کیا قباحت ہے۔

ہاں تو صاحب سامنے والا گھر ہمارے والے اس گھر کے عین بالمقابل ہے اور دونوں کے درمیان بہ مشکل چار چھ فٹ کی خلا ہے۔ جس میں دونوں گھر کے مکین یعنی کرایہ دار اپنے اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ بلا تکلف دن رات پھینکتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہی ایسا کمرہ اُدھر دوسری طرف بھی ہے اور اس میں بھی ہماری ایسی ہی کھڑکیاں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پانی کا نل جو اس کمرہ میں بھی ہے ہمارے نل والی کھڑکی کے بالمقابل نہ رہ کر ہماری دوسری والی کھڑکی کے سامنے بنا ہوا ہے، اور ہمارے نل والی کھڑکی کے سامنے جو کھڑکی ہے، اور جو کھل اور بند بھی ہو سکتی ہے، اس میں ایک دبیز صوفہ چیئر رکھی ہے، جس پر ایک خاتون بڑے سکون سے ٹانگیں پھیلائے ننگ دھڑنگ بیٹھی ہیں۔ ان کے بیٹھنے کے انداز میں کوئی ادا یا تکلف نہیں گویا وہ اسی طرح بیٹھنے کی عادی ہوں۔

ان کے قدموں میں انھیں کی طرح ننگ دھڑنگ ایک مسکین سی قسم کا شہدہ سکڑا سمٹا بیٹھا ہے۔ خاتون کے ہاتھ میں ایک سویگر سٹک ہے۔ بالکل ایسی جیسی بڑے فوجی افسران کے ہاتھوں میں اکثر دیکھی جاتی ہے۔

شہدہ بیچارہ نہتا ہے۔

عورت نے ہمیں دیکھا تو مسکرائی۔ جھجکی وغیرہ کچھ نہیں۔ شہدہ نے البتہ ہماری جانب دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

عجیب و غریب منظر ہے۔ ہے نہ۔

منٹ دو منٹ بعد شہدہ کا ہاتھ محترمہ کی پنڈلیاں سہلاتے سہلاتے ان کے گھٹنوں کے اوپر سرکنا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ پر زور سے چھڑی کا وار پڑتا ہے۔ وہ اسی طرح مار کھائے جا رہا ہے مگر اپنی اس حرکت سے باز نہیں آرہا۔ وہ پوز بدلنے کے لیے بھی ذرا اوپر اٹھنا چاہتا ہے تو چھڑی حرکت میں آجاتی ہے اور اس کے نیم گنجے سر پر۔

ہم بے بس ہیں کھڑکی بند نہیں کر سکتے اور ترکاری بنانے کاٹنے کے لیے دوسری کوئی جگہ بھی کمرہ میں نہیں ہے۔

ہم سوچتے ہیں، ہم مرد ہیں۔ جب عورت کو شرم نہیں تو ہم ہی کیوں موم کی طرح حیا کی تپش میں

پگھلتے جائیں۔

اب ہم بھی اس کھیل میں ذہنی طور پر ہی سہی، باقاعدہ شریک ہیں۔ ہم سبزی کاٹتے جاتے ہیں اور سامنے کا منظر بھی دیکھتے جاتے ہیں۔ عورت کی اشتہاری مسکراہٹ میں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ وہ دونوں اپنے اس عجیب وغریب کھیل یا تنازع میں پوری دلچسپی سے مصروف ہیں۔

ہم نے لوکی کاٹی۔ پیاز لہسن، ادرک اور ٹماٹر کاٹے۔ سٹوو جلایا۔ اس پر پیاز لہسن اور چھلا ہوا ادرک بھوننا شروع کیا۔ مسالہ بھن کر تیار ہو گیا تو ہم نے اس پر صبح کے سالن کا شوربہ گوشت الگ کر کے ڈال دیا۔ پھر لوکی بھی ڈال دی۔ دس پندرہ منٹ بعد جب لوکی نیم تیاری کو پہنچ گئی تو ہم نے اس میں علیحدہ رکھا ہوا گوشت بھی ڈال دیا۔ اتنے میں بھی سامنے کے منظر میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی نہ وہ غریب مسکین اپنی مجنونانہ حرکت سے باز آیا نہ وہ عورت اور نہ اس کی چھڑی۔

یہ عورت ہے کون؟ کوئی پیشہ ور طوائف۔ کوئی بگڑی ہوئی فلمی ایکٹرس کوئی بیمار مغز سلٹ یا پھر کوئی تشنہ آرزو۔ سادیت کی مریضہ

اور وہ آزردہ و مغموم خبیث۔ یہ آدمی ہے یا سنڈاس کا کیڑا۔

عورت خاصی قبول صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ کبھی کافی حسین رہی ہوگی۔ مگر اب تو ـــــ وہ جس انوکھی ادا سے اپنے پاؤں سے لپٹے اس خبیث کتے کو جنسی ایذا پہنچانے کا لطف لے رہی ہے اس سے بھی اس کے کردار کی کوئی واضح تصویر نہیں بنتی۔ کیونکہ ساتھ ہی ساتھ بیچاری بے حد اداس بھی ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ جسے ہم لمحہ بھر پہلے اس کی اشتہاری مسکراہٹ کہہ رہے تھے، وہ دراصل بڑی ہی دلگیر ملول اور حزیں مسکراہٹ تھی گویا وہ عورت کسی بڑے ہی اندوہناک تجربہ سے گزر رہی ہو اور اس کا مضروب ساتھی اپنے کمزور ہاتھوں کی مضراب سے جن تاروں کو جھنجھنانا چاہتا ہے وہ ڈھیلے پڑ کر کب کے بے آواز ہو چکے ہیں۔

اور یہ سب۔ سب کا سب۔ ناقابل اصلاح ہے۔

ارے یہ کیا ہم تو بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں ان انجانے لوگوں کے بارے میں۔

لعنت ہے ہم پر۔

اچانک ہمارا سارا وجود نفرت اور حقارت سے بھر جاتا ہے اور جی میں آتا ہے کہ سارے کا سارا گرم گرم شوربا پھینک کر اس خبیث مرد کی چاند اور عورت کی رانیں جلا دیں۔

یہ ہم نے سوچا ہی۔ خدا کا شکر ہے کہ کیا نہیں۔ ہم ایک بڑے ہی کمزور دل اور یتیم قسم کے

آدمی ہیں۔ بے گناہی کی ندامت سے ہم اپنے اندر ہی اندر ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ جم کر، ابھر کر کچھ کر گزرنا ہم سے کبھی نہیں بنا۔

گوشت اور سبزی چکھی تو لطف آگیا۔ نمک مرچ مسالہ سب مناسب اور ذائقہ ایک دم اے ون۔ اب سالن کو اے ون بنانے کے لیے ہم نے اپنا آخری اور برسوں کا آزمودہ حربہ استعمال کیا اور پاؤ بھر مکھن کی ٹکیہ سالن میں ڈال کر دیگچی بند کر دی۔ اور اسٹوو بجھا دیا۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا اور رضا، عباس اور سلطان تقریباً ایک ساتھ کمرہ میں داخل ہوئے۔

ہم نے ایک نظر ان لوگوں کو دیکھا اور پھر گھوم کر سامنے والی کھڑکی کی طرف، مگر اب وہاں کچھ نہ تھا۔ کھڑکی کب بند ہوئی، دروازہ کھلنے سے پہلے، بعد، یا ایک ساتھ۔

ہم اندر کیسے آئے۔ ہم نے اندر آکر کیا دیکھا۔ ہمارے پاس دو دلچسپ کہانیاں تھیں۔ مگر ہم نے چپ رہ کر آنے والوں کے ردِ عمل سے لطف اندوز ہونے کے ارادے سے زبان بند رکھی۔

وہ تینوں چپ چاپ ہمیں گھورے جا رہے تھے۔

اور ہم مزے سے مسکرائے جا رہے تھے۔

"تم اندر کیسے آئے ہو؟"

"جیسے تم آئے ہو۔"

"کیا بکتے ہو!"

"بکنے کی اس میں کون سی بات ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں اندر ہوں اور اندر آنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ کھڑکیوں سے تو ظاہر ہے کہ میں گھسا نہیں۔"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔"

"تم علی بابا ہو کر پوچھتے ہو۔ میں نے کہا 'کھل جا' اور دروازہ کھل گیا۔ شکر کرو کہ میں چالیس چوروں کا سرغنہ نہیں ہوں، اور میں نے تمہارا کوئی خزانہ بھی نہیں چرایا۔

علی رضا نے اپنے ساتھیوں کی طرف مشکوک انداز سے دیکھا۔

وہ بُت بنے، بوکھلائے کھڑے تھے۔

"مجھے دیوی کا وردان ہے علی بابا۔ میں چاہوں تو تمہارے دیکھتے دیکھتے دیوار میں تحلیل ہو سکتا

ہوں۔ ازمانا منظور ہو تو پھر سے دروازہ مقفل کر کے نیچے سڑک پر اتر جاؤ۔ میں تمہیں وہیں مل جاؤنگا۔

تب علی رضا نے جو قہقہہ پر قہقہہ لگانا شروع کیا تو عباس اور سلطان تو جیسے سکتے میں آگئے۔

ہم سمجھ گئے کہ اس کی تیز نگاہوں نے دوسرے دروازہ کی غلط تختی پر چپکی چٹخنی پہچان لی ہے ہم نے بھی جواباً ویسا ہی پُر بہار قہقہہ لگایا۔

ہنستے ہنستے ہم دونوں بے حال ہو رہے تھے۔ کافی دیر بعد جب یہ سلسلہ ذرا تھما تو علی رضا نے ہمارا کندھا سہلاتے ہوئے کہا "بھئی مان گئے ہم تمہیں۔ ہم دو سال سے اس سالی کھولی میں جھک مار رہے ہیں اور تم نے ایک ہی نظر میں بھانپ لی۔ اس کی اتنی بڑی کمزوری۔"

عباس اور سلطان ابھی تک ویسے ہی چُپ چاپ کھڑے تھے۔

ہم نے جواب دیا۔ "بھانپا ہم نے بھی کچھ نہ تھا۔ بس اتفاق ہی سمجھو۔ جو——"

عباس نے غرا کر کہا "اب چھوڑو یہ لطیفہ بازی اور ہمیں بھی بتاؤ کہ تم اندر کیسے آئے"

"دروازہ کھول کر۔"

"مگر وہ تو مقفل تھا۔"

"تالا کھولا نہیں جا سکتا۔"

"مگر چابی؟" سلطان نے اپنی بساط کے مطابق جرح کی۔

"ارے احمق، چابی تو اور بھی بن سکتی ہے۔ یہ پوچھو کہ وہ دروازہ کھول کر اندر تو آگئے، پھر باہر سے دروازہ پر قفل کس نے ڈالا۔"

بڑا مزہ رہا جب علی رضا نے اپنی دیرینہ حماقت کی تشریح فرمائی۔

"کمبخت نے ہنسا ہنسا کر بھوک بھڑکا دی ہے۔ جائیے جناب سلطان صاحب اور کافروں کی دوکان سے درجن تندوری روٹیاں اور قورما لے آئیے۔"

"گھر میں آٹا نہیں ہے کیا۔"

"آٹا تو ہے مگر وہ صبح والا سالن کون کھائے گا۔"

"تم روٹی پکاؤ سلطان میاں، سالن کا انتظام ہم کیے دیتے ہیں۔"

"ابے چھوڑ کبیر نے بھانجے۔ صبح ناشتہ پر پورے دس اڑا دیئے تھے تو نے۔ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔"

وشو کرما۔

اور ہم نے دیگچی کا ڈھکن پلٹ دیا۔ سالن کی خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہو اُٹھا۔

علی رضا نے ایک بوٹی منہ میں ڈالی اور تالی بجاتے ہوئے چلاّیا۔

" انقلاب ـــــ خدا قسم تو دنیا کا سب سے بڑا باورچی ہے۔"

٭ ٭ ٭

کھانے کے بعد سلطان شام اور اگلی صبح کے لیے سبزی، انڈے، ڈبل روٹی وغیرہ لینے چلا گیا، اور عباس ریڈیو اسٹیشن خبریں پڑھنے۔

"تم اس گھر میں دو سال سے رہ رہے ہو؟"

" دو سال تین مہینے سے!"

"یہ سامنے والا گھر اور تمہاری یہ بلڈنگ تقریباً ایک سے ہیں۔"

" تقریباً نہیں، قطعی ایک جیسے۔ دونوں عمارتیں ایک ساتھ ایک ہی آدمی نے بنوائی تھیں۔ حاجی دستگیر صاحب نے جو کبھی بمبئی میں پہلے نمبر کے ڈراعی فروٹ مرچنٹ تھے۔ اب یہ دو سگے بھائیوں کی ملکیت ہیں۔"

" اور ہمارے اس کمرے کے سامنے والے کمرہ میں جو غالباً ہماری ہی طرح کا ہے، اس میں کون صاحب رہتے ہیں؟"

اس پر علی رضا قدرے چونکے۔" تو تم نے بھی؟"

" تو کیا اس سے پہلے تم میں سے بھی کسی نے وہ سب دیکھا ہے جو آج ہم نے دیکھا؟"

" تم نے دیکھا؟"

ہم نے ڈرامائی انداز میں حاتم طائی کی طرح فرمایا: " ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔"

" بکواس بند کرو اور سناؤ سارا قصہ۔"

ہم نے بکواس بند کر دی اور سارا قصہ جوں کا توں بغیر مرچ مسالہ لگائے یا سجائے سنوارے سُنا دیا۔

یہ سب تو پہلے کسی نے نہیں دیکھا۔ مگر عباس اور مجروح صاحب بتا رہے تھے کہ انھوں نے اس کمرہ میں ایک مرد عورت کو ننگے گھومتے دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خطرناک بات ہے، اور

ہمیں چھوڑنا چاہئے۔ حج کے دن قریب ہیں۔ لکھنؤ سے درجنوں بزرگ بمبئی آئیں گے اور یہیں ٹھہریں گے۔ ان کے رہتے بھی ان لوگوں نے کوئی ایسی ہی حرکت کر ڈالی تو وہ کیا سوچیں گے۔ سیدزادے نے انہیں کیسی منحوس جگہ ٹھہرایا ہے۔ ابا پہلے ہی ہماری فلمی وابستگی سے پریشان ہیں۔ اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

کیوں نہ آج ہی بلکہ اسی وقت۔

اگلے پانچ منٹ میں ہم دونوں بغل والی بلڈنگ کے کمرہ نمبر سات کے سامنے کھڑے گھنٹی بجا رہے تھے۔

اندر سے ایک مہین سی نسوانی آواز آئی۔ "کون صاحب ہیں؟"

"ہم آپ کے پڑوسی ہیں" علی رضا نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ان کے لہجہ میں غصہ وغیرہ ایسی کوئی علامت نہ تھی۔

دروازہ کھلا۔ "آیئے تشریف لایئے۔"

تھیں تو یہ وہی دوپہر والی خاتون ہی مگر کالے کنارے والی سفید سوتی ساڑی اور آدھے بازو والے نیم سفید بلاؤز میں ملبوس، وہ قطعی نئی ہستی لگ رہی تھیں۔

بڑی بڑی، کالی کالی معصومیت سے دھیمے دھیمے مسکراتی ہوئی پُراسرار آنکھیں، چوڑی پیشانی، خوش رنگ چہرے پر انوکھی سجاوٹ سے سجی سجائی، ستواں ناک، بھرے بھرے نیم سُرخ ہونٹ اور سفید موتیوں ایسے بے داغ دانت۔

بھرے بھرے مگر کس کر تنے ہوئے خوبصورت جسم والی یہ عورت راجہ روی ورما کا کوئی ماڈل لگتی تھی دمینتی، رادھا، سیتا۔ کوئی بھی۔

بڑا وقار تھا اس عورت کے سرتاپا وجود میں۔ کچھ عجب تمکنت سے آنکھیں جھپکائے بغیر وہ ہماری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں کوئی سوال تھا نہ جھجک نہ شکایت نہ ندامت ہی۔

قدرے جھجک کر علی رضا نے کہا "ہم آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں۔"

"میں آپ کو جانتی ہوں رضا صاحب۔"

"یہ ہمارے دوست ہیں!"

"میں انھیں بھی جانتی ہوں۔"

"تو گویا ..... "

"میں ہی کیا اڑوس پڑوس کا ہر آدمی آپ کے نامِ گرامی سے واقف ہے۔ آپ چائے لیں گے یا کہ ٹھنڈا ؟"

" جی ہم ــــــ"

" دیکھئے آپ پہلی بار ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں۔ اتنی عزت بخشی ہے تو تھوڑی اور بھی ــــ"

" آپ ضرور ہی کچھ پلانا چاہتی ہیں تو ہم لوگ چائے لے لیں گے "

شکریہ کہہ کر وہ پردے کے پیچھے چلی گئی جو کمرے کے بیچوں بیچ کھینچا ہوا پارٹیشن تھا۔ کمرے میں دو گاڈریج کی الماریاں تھیں، گہرے ہرے رنگ کا لیدر صوفہ تھا۔ کتابوں کی خاصی بڑی الماری اور لکھنے پڑھنے کی میز اور کرسی۔ ہر چیز قیمتی تھی، اگرچہ کسی قدر پرانی۔ کمرہ علی رضا والے کمرے جیسا ہی تھا۔ اتنا ہی لمبا چوڑا مگر دونوں کی ترتیب و تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دیواروں پر چند ہی تصویریں تھیں، مگر سب کی سب ایسی کہ جنہیں ایک ہی نظر دیکھتے ہی صاحبِ خانہ کے بلند ذوق و شوق کا پتہ چلتا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھی خاصے بھاری اور قیمتی پردے ٹنگے تھے۔

عورت چائے لے کر آگئی۔ چائے کے ساتھ اس نے درجن بھر کباب بھی سینک لیے تھے ٹرے میں چار پیالے تھے۔

چوتھا پیالہ کس کے لیے تھا۔ یہ ہم پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی۔ اور ایک صاحب اندر تشریف لے آئے۔ انھیں دیکھتے ہی ہم دنگ رہ گئے۔ یہ وہی دوپہر والے حضرت تھے، مگر پتلون اور بش شرٹ میں ان کی شخصیت اب قطعی دوسری تھی۔

چھوٹتے ہی چہکے " ارے رضا صاحب! آپ ہیں ؟"

محترمہ نے نووارد کو ہم سے متعارف کراتے ہوئے فرمایا: " یہ ہریش بابو ہیں، فلموں میں کام کرتے ہیں۔"

جواب میں ہریش بابو مسکرائے اور محترمہ کی طرف دیکھ کر بولے " ان سے تو آپ مل ہی چکے ہیں۔ آپ سعیدہ بیگم ہیں۔ آپ کی ہم وطن اور آپ ہی کی طرح سعید زادی بھی ۔۔"

ہم لوگ کوئی گھنٹہ بھر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ فلموں کی باتیں، ادب و آرٹ، مقامی سیاست اور گرد و نواح کی باتیں۔

ہریش بابو اور سعیدہ بیگم دونوں خاصے پڑھے لکھے، ذہین اور سلجھے ہوئے مذاق کے بڑے لوگ تھے۔ جنہیں ناشناس زندگی نے چھوٹے لوگوں کی طرح جینے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ میاں بیوی تھے یا بن بیاہے ہی میاں بیوی کی طرح رہ رہے تھے۔ جو بات ہم سے پوچھتے نہ بنی تھی وہ آخر علی رضا نے پوچھ ہی لی۔ جواب میں ہریش بابو مسکرائے۔

"میں نے ان کی والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کے مذہبی عقاید میں کبھی مخل نہ ہوں گا اور اپنا نام بھی تب تک نہ پہناؤں گا جب تک کہ یہ نام واقعی اس قابل نہ ہو جائے، لہٰذا یہ آج تک سعیدہ بیگم ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آج تک کسی قابل نہ ہو سکا۔ میں دس برسوں سے فلموں میں ہوں۔ سبھی مجھے اچھا ایکٹر مانتے ہیں مگر آج تک مجھے کوئی ایسا رول نہیں ملا جو مجھے وہ مقام دلا سکتا جس کا میں حقدار ہوں۔ سوائے پولیس افسر اور جج کے میں نے آج تک کوئی کردار نہیں کیا۔ حالانکہ ـــــــــ" وہ یکایک رُک گئے۔ ہم نے دیکھا کہ محترمہ بھی کچھ کہنا چاہتی ہیں۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" پھر رضا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

"رضا صاحب، یہ غلط فرما رہے ہیں، میرا نام 'سعیدہ ہریش' ہے۔ اور یہ میں پورے فخر سے کہہ رہی ہوں۔" ان کے لہجہ میں پیار بھری شکایت تو تھی ہی وہ یقین بھی تھا جو اپنی کہی منوا لینے کا دم رکھتا ہے۔

٭ ٭ ٭

ہم کوئی دو گھنٹہ بعد لوٹے تو آتے ہی کپڑے بدل کر لیٹ گئے۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

آخر ہم سے رہا نہ گیا۔ "تم سوچ رہے ہو کہ اس عجیب وغریب جوڑے کے بارے میں جو واقعہ ہم نے تمہیں ابھی ابھی سنایا تھا من گھڑت تھا۔"

"نہیں۔" رضا کا جواب مختصر تھا۔

ہم دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"تم تحت الشعور کی ہپناٹک طاقتوں کے قائل ہو کہ نہیں۔"

"تو تم ؟"

"آدمی کے ذہن کے تہہ خانوں میں نہ جانے کیا کیا چھپا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے

جو دیکھا یعنی تم جو سمجھتے ہو کہ تم نے واقعی دیکھا تھا، وہ تم نے دراصل دیکھا نہ ہو۔ وہ سب سہارا تصور یا کوئی خواب آوارہ ہی ہو۔"

ہمیں غصّہ آرہا تھا: "ہم نہ صرف جاگ رہے تھے علی بابا بلکہ باقاعدہ کام کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں یہ ہم نے ہی نہیں، تم خود اعتراف کر چکے ہو کہ ہم سے پہلے عباس میاں اور مجروح صاحب نے بھی۔"

" کبھی کبھی آدمی جاگتے جاگتے بھی سویا سویا سا ہوتا ہے۔ اب تم خود ہی غور کرو تم کس طرح اچانک اس کمرہ میں داخل ہوئے۔ ایک بار اندر آگئے تو لوٹ نہ سکے کیونکہ اس طرح کمرے کو کھلا اور بے سہارا چھوڑ کر چلے جانا تمہاری نظر میں مناسب نہ تھا۔ اب تم کمرے میں اکیلے تھے، تمہارے سوچ کی اُڑان تمہیں کہیں بھی لے جاسکتی تھی۔ اب اس حالت میں یا تو تم کوئی ایسی شعوری حرکت کرتے جو تمہارے لیے بغیر کہیں جائے ممکن ہوتی یا پھر تم سے دوسرے عامیانہ کام کراتی۔ آدمی کا شعور اسے اپنے غیبی ساتھیوں یعنی تحت الشعور اور لاشعور کے حوالے بھی کبھی کبھی کر دیتا ہے"

"بکواس بند کرو"، ہمیں اب واقعی غصّہ آرہا تھا۔

میں جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بول رہے، مگر ہم دونوں نے ابھی ابھی تمہاری کہانی کے جن دونوں کرداروں کو دیکھا ہے، وہ کیا ——— ؟"

یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو دیکھا، وہ درست تھا، جس کیفیت کا تم ذکر کر رہے ہو وہ ہماری بجائے اس وقت اُن دونوں پر طاری تھی ———

ہو سکتا ہے۔ آدمی واقعی بڑی خبیث شے ہے۔ البتہ مناسب یہی ہے کہ ہم اب مان لیں کہ

خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا ———

جو سُنا، افسانہ تھا ———

افتتاحیہ:— ریل میں سفر کر رہے دو اجنبی مسافروں میں سے ایک نے طلسمی کہانیوں کی کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے دوسرے سے پوچھا کیوں صاحب آپ بھوت پریت کو مانتے ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا "نہیں" اور غائب ہو گیا۔

ہم اس عالیشان تاریخی شہر میں جو کبھی شمالی ہندوستان کی ایک وسیع و عریض ریاست کا دارالخلافہ رہا تھا میسور یونیورسٹی کی طرف سے ایک بین الاقوامی سمینار میں شرکت کی غرض سے آئے تھے.. بنگلور سے چلنے سے کئی روز پہلے ہی یونیورسٹی کے رجسٹرار نے سمینار کی انتظامیہ کمیٹی کو ہمارے پروگرام اور پہنچنے کی تاریخ وغیرہ سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا اور ہمیں یقین دلایا تھا کہ ہمارے قیام کا بندوبست کر دیا گیا ہے اور ہمیں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہ آئے گی کسی وجہ سے رجسٹرار کا خط منتظمین تک نہ پہنچا تھا اور یہ سوچ کر کہ میسور یونیورسٹی سمینار میں شریک نہ ہوگی. انھوں نے ہمارے ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہ کیا تھا جیسے ہی ہم انتظامیہ ادارہ کے دفتر میں پہنچے ہر طرف بھگدڑ مچ گئی اور اراکین کمیٹی ادھر ادھر بھاگنے لگے اغلب تھا کہ یہ افراتفری اسی طرح دیر تک جاری رہتی کہ ایکا ایک ہمیں خود ہی یاد آگیا کہ ہمارے ایک پرانے دوست اس شہر کے ایک قدیم شاہی محل کے نئے خداوند ہیں اور اگر ان سے ملا جائے تو کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور ہو سکتا ہے۔

ٹیلی فون پر بات کرنے کی دیر تھی کہ ادھر سے ایک بلند مخلصانہ قہقہہ گونجا اور خداوند نے حکم دیا کہ ہم ایک دم اسپورٹس انسٹی ٹیوٹ تشریف لے آئیں۔ اور ہمارے ہمراہ اگر دس بیس

اور حضرات یا خواتین (لفظ خواتین پر انہوں نے زیادہ زور دیا تھا) بھی ہوں تو ان کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا بھی معقول بندوبست ہو جائے گا۔ سیمینار میں اپنی شمولیت کی اولین تفصیلات طے کر کے جیسے ہی ہم صاحب کمیٹی کے دفتر سے باہر آئے آنندی بابو کی کار ہمیں انسٹی ٹیوٹ لے جانے کے لیے پہنچ گئی۔

ھیرا محل ایک قدیم اور پر وقار عمارت تھی۔ ہم جیسے ہی آنندی بابو کے پُر تکلف دفتر میں داخل ہوئے ہمارا پُر جوش استقبال کیا گیا اور ہمیں انسٹی ٹیوٹ کے اراکین سے یکے بعد دیگرے بڑے پُر تکلف اور گرم جوشی سے ملوایا گیا۔

پرانی اور نئی باتوں میں کوئی گھنٹہ بھر اُلجھے رہنے کے بعد آنندی بابو نے ہمیں اپنے ایڈم آفیسر کے حوالے کر دیا اور سفارش کی کہ ہمیں ایگلز نیسٹ یعنی سویٹ نمبر ۲۲ میں ٹھہرایا جائے اور ہماری خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آنندی کے دفتر سے سویٹ نمبر ۲۲ کوئی دو سو قدم کی دوری پر واقع تھا۔ راستہ چلتے چلتے ایڈم آفیسر کالرا صاحب نے بتایا کہ یہ سویٹ ایک مخصوص امتیاز کا مالک ہے اور اس میں ہمیشہ وی آئی پی قسم کے حضرات ہی ٹھہرائے جاتے ہیں اور کہ حکومتِ ہند کے پہلے نائب وزیر اعظم عالی جناب سردار ولبھ بھائی پٹیل اس شہر میں اپنے پہلے اور آخری قیام کے دوران اسی سویٹ میں جلوہ افروز رہے تھے۔ اور انھیں کی وجہ سے اسے احتراماً ایگلز نیسٹ یا عقاب کا گھونسلا کہا جاتا ہے۔

ایگلز نیسٹ چار کمروں پر مشتمل ایک بڑا فیملی سویٹ تھا۔ مہمانوں سے ملنے کا کمرہ یعنی ڈرائنگ روم۔ کپڑے بدلنے کا کمرہ یعنی ڈریسنگ روم، غسل خانہ اور بیڈ روم ــــ بیڈ روم کے علاوہ تینوں کمرے بڑے کشادہ اور خوبصورت تھے۔ بیڈ روم جو ڈرائنگ روم سے ملحق تھا البتہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ ایک الماری ایک لکھنے کی میز اور کرسی اور ایک سات بائی بارہ کے بیڈ نے ہی کمرہ لبالب بھر دیا تھا۔ ایر کنڈیشنر بیڈ کے عین سامنے فکسڈ تھا۔ مگر کچھ ایسے سلیقہ اور نفاست سے کہ ہمیں اس کی موجودگی کا احساس تبھی ہوا جب کالرا صاحب نے بیڈ ہی سے لگے ایک بٹن کو دبا کر اسے چلا دیا۔

کمرہ ایک دم سرد اور خوشگوار ہوا سے بھرنے لگا۔ ہمیں بتایا گیا کہ دیوار کے دوسری جانب پھولوں کا باغیچہ ہے جس میں رات کی رانی کے بے شمار جھاڑ ہیں۔ اور رات بھر ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ خوشبو کی لپٹیں بھی کمرے میں متواتر آیا کرتی ہیں۔ سونے کا یہ کمرہ ڈریسنگ روم سے بھی چھوٹا

جان بوجھ کر رکھا گیا ہے تاکہ ایرکنڈیشنڈ کی برکتیں کٹ بٹ کر ادھوری نہ رہ جائیں۔ دس پندرہ منٹ میں سویٹ کی باقی ماندہ خصوصیات اور چہار اطراف پھیلے ہوئے بے شمار بجلی کے بٹنوں کی پوری تفصیل سمجھا کر کالرا صاحب تشریف لے گئے۔

اب ہم تھے اور چار کمروں پر مشتمل ہمارا سویٹ نمبر ۲۲۔ بنگلور میں ہمارے پاس اس سے آدھی جگہ بھی غالباً نہ تھی۔ اچھا ہی ہوا جو سمینار والوں نے ہمارے ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہ کیا تھا ورنہ اس تاریخی سویٹ کے قیام سے ہم محروم رہ جاتے۔ پھر یہ سوچ کر کہ پورا ایک ہفتہ ہم اسی بیڈ پر سوئیں گے۔ جس پر ملک و قوم کی اتنی بڑی ہستی بھی کبھی سوئی تھی، تو ہمیں گدگدی سی محسوس ہوئی۔

سفر کی تھکان نے ہمیں اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ بغیر سفری لباس تبدیل کیے محض جوتے اتار کر ہی ہم بستر پر دراز ہو گئے اور لیٹے لیٹے پرانے راجاؤں کے جاہ و جلال کے بارے میں سوچنے لگے۔ آنندی بابو نے بتایا تھا کہ مقامی راجا کے فرزند ارجمند جو کبھی اس بڑی ریاست کے پرنس آف ویلز یعنی ولی عہد تھے آج کل شربت، مربے، چٹنیوں اور اچار وغیرہ بنانے کا کارخانہ چلا رہے تھے یعنی کہ گردش دوراں نے بیچارے شہزادے کو کارخانہ داران کی صف میں لا کھڑا کیا تھا یہ تو پھر بھی غنیمت تھا کہ انھیں کسی غیر کی نوکری نہ کرنی پڑی تھی، نوکری بہر حال نوکری ہے۔ حکومت کی نوکری، کسی سرمایہ دار کی نوکری یا یونیورسٹی کی نوکری۔ کہیں کوئی فرق نہیں۔ نوکر ہر صورت میں ایک بینک نوٹ ہے۔ دو سو کا، ہزار کا یا آنند بابو کی طرح دو ہزار کا۔

والد مرحوم نے، بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے، کوئی معقول اثاثہ چھوڑا ہوتا تو غالباً ہم خود بھی نوکری کے بجائے کارخانہ داری یا دکان داری وغیرہ کرتے ہوتے۔ گھما پھرا کر ہم اپنی سوچ کے زاویوں کو ہمیشہ اقتصادیات کے دائرے میں لے آتے ہیں۔ ہمارا ذہن گھریلو اور وراثتی اقتصادیات (ECONOMICS OF INHERITANCE) کے بھنور میں پھنسا تھا۔ اغلب تھا کہ اس رو میں بہتے بہتے ہم سمینار میں اپنے پیپر کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض شروع کر دیتے، کہ ہمیں نیند نے دبوچ لیا۔ تھکا ماندہ بدن اور ایرکنڈیشنڈ کی ہلکی ہلکی معطر ہوا کے جھونکے، ماں کی لوریوں کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے، جانے کب ہم نیند کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔

کافی سو چکے تو لگا کہ کوئی دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہا ہے۔ بتی تو جل رہی تھی۔ نو وارد کو بے کھٹکے اندر چلے آنے کے لیے کہہ کر ہم اٹھ بیٹھے۔

نو وارد سفید کپڑوں میں ملبوس گورا چٹا اور مضبوط کاٹھی کا کوئی پہاڑی چھوکرا تھا جو چائے لے کر حاضر ہوا تھا۔

"مہاراج نے حکم دیا تھا کہ چائے آپ کو ٹھیک پانچ بجے پہنچا دی جائے۔"

"مہاراج نے؟" تو آنندی بابو آج کل مہاراج کہلاتے ہیں۔

"اچھا بھائی لے ہی آئے ہو تو تھوڑی مہربانی اور کرو۔ اور ایک پیالی بنا بھی دو۔" ہم نے یہ حکم کچھ ایسے لب و لہجہ میں صادر فرمایا کہ بات حکم بھی لگے اور التجا بھی۔ کیوں کہ ہمیں ابھی تک یہ پتہ نہ تھا کہ ہم محض مہمان ہیں یا مہمان خصوصی۔ آپ جانتے ہیں کہ اول الذکر کو ایسی جگہوں پر اکثر نجی خرچ پر رہنا ہوتا ہے۔ اور دوئم لفظ کے اصلی معنوں میں مہمان ہوتے ہیں۔ یعنی کہ پورے طور پر مفت خور۔

نو وارد نے چائے بنا دی جو ہم نے شکریہ کے ساتھ قبول فرمائی۔ "چائے تو بہت اچھی ہے۔" ہم نے بات چھیڑنے کی غرض سے انکشاف فرمایا۔ حالانکہ چائے واقعی خوب تھی۔

"جی شکریہ۔ مہاراج میس کے معاملات سے ذاتی دلچسپی لیتے ہیں اور پھر جناب تو مہاراج کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔"

خاص یعنی نزدیکی دوست۔ یعنی کہ مہمان خصوصی۔

"ایک پیالہ اور بناؤ جی۔ ہم ہمیشہ دو پیالے لیتے ہیں۔"

نو وارد نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے انداز میں عجیب قسم کا رکھ رکھاؤ اور نزاکت تھی۔

"برخوردار تم پنجابی تو نہیں ہو۔" ہم نے پھر ایسے ہی کہہ دیا حالانکہ ظاہر تھا کہ اس قدر تمیز اور شائستگی سے بولنے والا میس ویٹر پنجابی نہیں ہو سکتا۔ پنجابی کو یہ آداب آ جائیں تو وہ ایک دم بڑا آدمی بننا چاہتا ہے۔ میس ویٹری پر ہی قناعت نہیں کرتا۔

"جی میں رامپور شہر کا رہنے والا ہوں۔ شملہ میں پڑھا ہوں۔ ہمارے ہاں اردو اچھی خاصی بولی جاتی ہے۔ رامپور دربار تو فارسی اور عربی کے بھی دلدادہ تھے۔ کچھ ایک شہزادے تو شعر وغیرہ بھی کہہ لیتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے جی ہمیں تو مجبوراً نوکری کرنا پڑ رہی ہے کھیتی ویتی

ہوتی تو نوکری کاہے کو کرتے۔

پھر وہی اقتصادیات کا چکر۔

لڑکا بڑا باتونی تھا۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دوسرا کوئی معقول کام نہ ملے تو آدمی نوکری ہی تو کرے گا۔ پھر یہ نوکری بُری بھی نہیں۔ سرکاری ملازمت کسی بنیے کی غلامی سے ہر صورت بہتر ہے۔

بیرا چائے پلا کر چلا گیا تو ہم پھر سے بستر پر دراز ہو گئے اور جانے کب پھر نیند لگ گئی اور کب تک ایسے ہی سوتے رہے۔

دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ میں گھنٹی کی تیز و ترش آواز بھی آئی تو ہم چونک کر اٹھ بیٹھے۔ غنودگی کا عالم اب بھی طاری تھا۔ تھکے اکسائے انداز میں کلائی پر لگی گھڑی دیکھی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ گویا دن چھپنے کا وقت قریب تھا۔ بیڈ روم سے باہر آ کر ڈرائنگ روم کے باہر کے دروازے کی طرف جھانکا تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے اور چٹخنی چڑھی ہے۔

تو پھر وہ چائے والا چھوکرا کہاں سے آیا تھا؟

اس حیرانی کے عالم میں ہی بڑھ کر ہم نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ میس ویٹر چائے کی ٹرے لیے کھڑا ہے۔ یہ کوئی دوسرا میس ویٹر تھا۔

تو گویا پہلی دو پیالیاں آنجناب نے خواب میں پی تھیں۔ خواب ہی تو تھا کمبخت ورنہ محض ایک گھنٹہ کے وقفہ کے بعد چائے کی اس قدر حاجت نہ ہوتی۔ ہمارے جسم کا رواں رواں چائے کا طلب گار تھا۔

"ساتھ میں کچھ اور بھی لیجئے گا؟" انداز تکلّم تو اس چھوکرے کا بھی بُرا نہ تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ برخوردار"

"جی بندہ کو سلامت علی کہتے ہیں۔ سلامت علی قزلباش مگر حضور مجھے سلامت کہہ کر بلایا کریں۔ کیوں کہ میں اسی مختصر نام سے یہاں پکارا جاتا ہوں۔" بات تو یہ چھوکرا بھی تقریر نما ہی کرتا ہے۔ اور انداز تکلّم کی بات بھی سمجھ میں آئی۔ کہاں کے رہنے والے ہو عزیزم۔"

"جی خادم علی گڑھ کا ہے۔ بڑے صاحب کے ساتھ دلی میں تھا۔ وہ ادھر تشریف لے آئے

تو بندہ بھی ان کے ساتھ چلا آیا۔"

جب ہم نے مزید کوئی بات نہ کی تو سلامت علی نے پھر پوچھا: "جی میں نے عرض کیا تھا کہ حکم ہو تو کھانے کے لیے کچھ حاضر کروں۔"

"کھانے کے لیے کیا ہے۔"

"جی ایک دم تیار تو بسکٹ اور کیک وغیرہ ہی ہوں گے مگر آپ چاہیں گے تو انڈا، آملیٹ، ٹوسٹ وغیرہ کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔"

"شام یعنی رات کا کھانا کس وقت ملتا ہے۔"

"جی ڈنر کے اوقات تو آٹھ سے ساڑھے نو بجے تک کے ہیں مگر پہلے یا بعد میں چاہیں گے تو اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ اکثر حضرات البتہ ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان ہی تشریف لاتے ہیں۔ میں آپ کے سویٹ کے بالمقابل یعنی کمرہ نمبر ۲۱ میں ہوں۔

ابھی کچھ کھالیا تو ڈنر خراب ہو گا۔ لہٰذا ابھی جانے دو۔ فی الحال چائے ہی کافی ہے۔

چائے اچھی تھی۔ ہم نے دو پیالے بمعہ تین سگریٹ نوش فرمائے۔ دو پیالے جو ہم نے خواب میں لیے تھے اتنے ہی گرم اور لذیذ تھے۔ آخر یہ جگہ کبھی راجاؤں کی آماجگاہ تھی۔ جگہ کی بھی روایت ہوتی ہے۔ چائے پی کر ہم سامنے لان میں آئے تو دیکھا کہ کھلاڑی لوگ لڑکے اور لڑکیاں کھیلوں کے میدان سے لوٹ رہے تھے یا اِدھر اُدھر گشت میں مشغول تھے۔ آسمان دُھل دُھلا کر صاف شفاف ہو گیا تھا۔ ہمیں یاد آیا کہ جب ہم اس محل کے احاطے میں داخل ہوئے تھے تو مطلع ابر آلود تھا۔ بارش ظاہر تھا کہ ہمارے سوتے سوتے ہوئی تھی۔ سڑکیں، بڑے لان کا فرش، محل کی دیواریں، مینار اور چبوترے سب دُھل کر ترو تازہ دکھنے لگے تھے اور بڑی ہی لطیف ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔

خوب سپنا تھا۔ مطلع ابر آلود ہو جیسا کہ آج دوپہر کو تھا تو سپنے آتے ہیں۔ سپنا بے تکا ضرور تھا مگر تھا دلچسپ ایسے شاہانہ بستروں پر کھانے پینے کے خواب نہ آئیں گے تو کیا چیخنے چلانے کے آئیں گے۔

کوئی سوا آٹھ بجے بھوک نے ستایا تو ہم میس میں تشریف لے گئے جہاں بہت سے لوگ پہلے ہی سے جمع تھے۔ سب کھلاڑی قسم کے لوگ تھے۔ تندرست اور توانا ایک ہماری ہم عمر

محترمہ بھی تھیں جو بڑی ہی قبول صورت واجبی دم خم اور پیکھے خدو خال کی مالکہ تھیں۔ ایک بدیشی نو عمر چھوکری تھی جس کا خوب صورت بچہ سارے میس کا منظور نظر بنا بیٹھا تھا۔ سب لوگ اس سے باتوں میں مصروف تھے۔ اور وہ بھی کچھ ایسی تیکھی پنجابی بول رہا تھا کہ سنتے ہی بنتا تھا۔

کھانے کی میز پر ہمارے بالمقابل جو حضرت تشریف فرما تھے، باقی سب سے الگ تھلگ تھے۔ انھوں نے خود ہی بتایا کہ وہ انسٹی ٹیوٹ کے پبلک ریلیشن آفیسر ہیں۔ کبھی جرنلسٹ تھے اور وطن یعنی حیدر آباد چھوڑ۔ یہاں اس لیے آن بسے ہیں کہ یہاں کی آب وہوا انھیں خوب راس آئی ہے۔ انھیں کھیلوں اور کھلاڑیوں کے درمیان رہنے کا خبط ہے۔ خود بھی ہاکی فٹ بال والی بال۔ بیڈ منٹن اور ٹینس کھیلتے ہیں۔ خود کھیلنے سے بھی زیادہ انھیں .... گیمز کے دیکھنے کا شوق ہے، جو ظاہر ہے کہ اس جگہ کے علاوہ دوسری کسی جگہ پورا نہیں ہو سکتا۔ شادی نہیں ہوئی۔ ارادہ بھی نہیں۔ انھوں نے اپنے نام کے علاوہ اپنے بارے میں تقریباً سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہاں ہر آدمی تقریر کرتا ہے۔ آب وہوا کا اثر ہے غالباً ان کی تقریر محض حیدر آبادی اردو میں ہونے کی وجہ سے اور بھی دلکش ہو گئی تھی۔ ان کا نام جو بھی ہو آدمی دلچسپ تھے اور معقول تھے۔ ہمیں اچھے لگے۔ کھانے کے دوران میں انھوں نے ہمیں کچھ اس طرح الجھائے رکھا کہ دیر تک کسی دوسرے صاحب یا صاحبہ سے کوئی بات نہ ہو سکی۔

"آپ سویٹ نمبر ۲۲ میں قیام فرما ہیں۔"

"جی ہاں"۔ ہمارے منہ میں مرغے کی ٹانگ تھی۔

وہ ذرا متفکر ہو کر بولے "وی آئی پی سویٹ ہے۔ جو ہمارے بڑے صاحب خود الاٹ کرتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ آپ ہمارے صاحب کے قریبی جاننے والوں میں سے ہیں"۔ یہ ہمارے دائیں طرف بیٹھے ہوئے صاحب تھے۔

ہم نے گردن گھمائی تو ان نئے حضرت نے اپنا تعارف کرایا۔ "خادم کو مرزا کہتے ہیں۔ مرزا علی بیگ۔ فٹ بال کا انسٹرکٹر ہوں۔"

اتنے بڑے کمرے میں آپ ایک دم بور ہو جائیں گے، کوئی چھوٹا کمرہ لے لیا ہوتا۔ یہاں ایسے کتنے ہی کمرے ہیں۔" اب کے بولنے والی یہ وہی محترمہ تھیں ہمیں وہم سا ہوا تھا کہ وہ ہمیں ایک مدت سے

بغیر پلک جھپکے متواتر گھورے جارہی تھیں مگر اس سے پہلے بولی ایک لفظ بھی نہ تھیں۔
"آنندی بھائی نے جہاں بھیجدیا چلا آیا۔ بس چند دن ہی کی تو بات ہے۔
"سو تو ہے" یہ مرزا جی تھے۔
کھانا ہو چکا تو سبھی حضرات اور خواتین باہر لان میں آکر بیٹھ گئے۔ جہاں کافی کا دور چلنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹا یہ اجتماع کسی بڑے کلب کی تصویر پیش کر رہا تھا۔
"ہمارا اپنا گروپ بس یہی تین چار حضرات کا گروپ ہے۔ آپ کی آمد سے تصویر امیر و ہو گئی آج۔" مرزا جی کے بات کرنے کا انداز واقعی منفرد تھا۔
"ہیلو الطاف بھائی۔ میں آپ کے گروپ میں شامل ہو سکتی ہوں۔" ایکا ایک پیچھے سے بڑی ہی دل کش نسوانی آواز سنائی دی۔ جیسے بے شمار گھنگرو ایک ساتھ چھنک اٹھے ہوں، یہ وہی محترمہ تھیں۔
"آئیے آئیے اور ان سے ملیے ...... آہیں" وہ مجبوراً رک گئے کیوں کہ ابھی تک ہم نے بھی انھیں اپنے نام اور کام کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ ہم پر تو خیر ظاہر ہو ہی گیا تھا۔ کہ یہ حضرت الطاف بھائی ہیں۔
ہم نے ادب سے اٹھ کر محترمہ کو خوش آمدید کہا اور بتایا کہ ہم بنگلور سے آئے ہیں۔ جہاں ہم میسور یونیورسٹی میں اقتصادیات کے معلم ہیں اور نام ہمارا اندر سروپ دت ہے۔
"کنیز کو بملا بالی کہتے ہیں اور میں انسٹی ٹیوٹ میں لڑکے لڑکیوں کو پیراکی کے گر سکھایا کرتی ہوں۔" ساتھ والی کین کی ٹوکری نما کرسی پر بیٹھتے ہوئے محترمہ نے بڑے ادب اور سلیقہ سے اپنا تعارف کرایا۔
"مس بالی بھارت کی سابقہ چیمپین تیراک ہیں اور اولمپکس میں بھی حصہ لے چکی ہیں۔" مرزا جی نے مزید تشریح فرمائی۔
"دت اور بالی تو ایک ہی کنبہ کے افراد ہوئے موئیال۔ براہمن جو براہمن کم اور لڑاکو زیادہ ہوتے ہیں۔" مس بالی نے ذات برادری ملا کر خود کو ہمارے قریب تر بن کر لیا۔ "خاکسار کو الطاف حسین کہتے ہیں۔ میں بھی ذات کا سید یعنی آپ ہی لوگوں کی طرح مسلمانوں کا براہمن ہوں۔" الطاف صاحب نے بھی بالآخر اپنا تعارف پورا کرا دیا۔ کافی اور سگرٹوں کے دور چلتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔

راجاؤں کی باتیں۔ گیمز کی باتیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے تذکرے۔ حکومت کی تعلیم اور کھیلوں کے متعلق پالیسی۔ مقامی سیاسیات۔ شاعری اردو ہندی۔ ہم تم اور وہ۔ یہ سلسلہ گرما گرم ہی تھا کہ آنندی بابو کی سلطنت کے چند ایک اور کارکن بھی شریک محفل ہوگئے۔ حیرت کا مقام تھا کہ ہر کسی کو ہمارے سویٹ نمبر ۲۲ کا مکیں ہونے کا علم تھا۔

"آپ تو اکیلے ہی ہیں نہ۔" ایک حضرت نے جو غالباً ہاکی کے استاد تھے کچھ ایسی جھجک مسکینیت اور حیرت سے کہا گویا ہم اس شاہی سویٹ میں اکیلا رہنے کے حقدار نہ ہوں۔ حقدار تو ہم خیر واقعی ہی نہ تھے۔ مگر واقعہ تھا کہ ہم بہر حال وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور ابھی کم از کم سات آٹھ دن اور بھی ٹھہرنے کا پروگرام تھا ہمارا۔

"میرا مطلب ہے" وہ صاحب وضاحت فرماتے ہوئے بولے "آپ قطعی اکیلے ہیں اور سویٹ باقاعدہ ایک بڑی فیملی کی عارضی رہائش کے لیے بنا ہے۔ آپ ڈرس گے تو نہیں۔۔۔

ڈرنا ضروری ہے تو ہم ضرور ڈرس گے۔" ہم نے ان کی تشفی کے لیے پُر بہار قہقہہ لگایا گو اندر ہی اندر ہم کس قدر ڈگمگا ضرور گئے تھے۔

"حیرت تھی کہ ہمارے قہقہہ میں کوئی شریک نہ ہوا۔

"پروفیسر اندر سروپ دت ظاہر ہے کہ دلیر آدمی ہیں موئیاں لوگ غازیانہ فطرت کے ہوتے ہیں اور پھر وہ آنندی بابو کے واحد دوست ہیں۔ انھوں نے یقیناً کچھ سوچ سمجھ کر ہی انھیں اس سویٹ میں ٹھہرایا ہوگا۔" بملاجی کی آواز میں اُداسی تھی اور۔۔۔۔۔ ایک انوکھی طرز کا کنسرن جو اپنوں کے لیے ہی کوئی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ہم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب تو یہ کھلی حقیقت تھی کہ سویٹ یا کمرہ نمبر ۲۲ جسے احتراماً ایگلز نیسٹ بھی کہا جاتا تھا، کوئی خاص ہی شے تھی جس کے متعلق کوئی افسانہ یا حادثہ کی یاد وابستہ تھی اور یہ سرگوشیاں بے معنی نہ تھیں مگر بات کیا تھی کہ جس کی پردہ داری تھی۔

یہ کچھ بھی ہو موئیاں برادری کی ایک معزز خاتون نے بڑے فخر سے ہمیں دلیر آدمی کہا ہے تو ہم مر مٹ کر بھی راز کریدنے کی کوشش نہ کریں گے۔

مرزاجی نے اپنی بش شرٹ کے کالر بٹن بند کرتے ہوئے محفل کے دوسرے ساتھیوں کی یاد دہانی کے لیے فرمایا: "آج رات کو تو ہوا میں بلا کی خنکی ہے۔ آپ میں سے کسی حضرت کو

رات میں نہانے کا خبط ہو تو میری التجا مانئے اور یہ خبط کم از کم تب تک ملتوی رکھے جب تک کہ گرمی واقعی جوبن پر نہیں آجاتی۔"

جیسے اس مشورہ کی مزید تشریح کی غرض سے مس بالی نے کہا: "مرزا جی نے واقعی پتے کی بات کہی ہے خود میں نے بھی دیکھا ہے کہ یہاں موسم بڑی جلدی بدل جاتا ہے آج رات تو خیر کون مسخرا نہانے کی سوچے گا۔ ان دنوں میں تو رات کو نہانا ویسے بھی نامناسب ہے۔" اور پھر ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں: "آپ سے تو میری خاص التجا ہے کہ آپ کو رات کو نہانے کی عادت ہو تو بھی، اور نہ ہو تو بھی کم از کم آج رات نہ نہائیں۔ نہا کر ایر کنڈیشنڈ کمرے میں سونا ہر صورت میں مضر صحت ہے۔ سردی زکام کچھ بھی ہو سکتا ہے آدمی کو۔"

کیسے پیارے لوگ ہیں یہ سب۔ اسپورٹس مین واقعی عجب مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ آنندی بابو بھی کہیں سے اچانک آدھمکے سبھی نے ادب واحترام سے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔

"میں آپ کے سویٹ میں گیا تھا آپ کو وہاں نہ پا کر سیدھا ادھر آگیا۔" انہوں نے ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے اور ہمارے قریب ہی کی ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے فرمایا: "مجھے افسوس ہے کہ میں پہلے حاضر نہ ہو سکا۔ امید ہے کہ آپ آرام سے ہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو سلامت کو بلوا کر منگوا لیجئے گا۔ ویسے تو کمرہ میں ہر چیز جو اس موسم میں درکار ہو سکتی ہے پہلے ہی سے موجود ہے۔"

"میں بڑے مزے میں ہوں۔ دوپہر کو جی بھر کر سویا ہوں اور ڈنر بھی خوب ڈٹ کر کھایا ہے سویٹ ایک دم اے ون ہے اور کھانا بھی فرسٹ کلاس۔ باقی اطلاع بعد میں دوں گا" ہم نے جھکتے ہوئے شکرانہ ادا کیا۔

"یہ تو خیر آپ کی ذرہ نوازی ہے" پھر مس بالی اور دوسرے حضرات سے ہم کلام ہوتے ہوئے آنندی بابو فرمانے لگے۔ "ہمارے عزیز دوست پروفیسر اندر سروپ دت جو ہمارے شہر میں ایک بین الاقوامی سیمنار میں میسور یونیورسٹی کی طرف سے شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں ماہر اقتصادیات تو ہیں ہی بہت اچھے شاعر، افسانہ نویس اور صحافی بھی ہیں۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے کہ وہ جس نئی

جگہ بھی جاتے ہیں وہاں کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ یہاں سے جا کر وہ ہمارے ہماری مہمان نوازی اور ہمارے ادارے کے بارے میں بھی اپنے ہنرمند قلم کو ضرور جنبش دیں گے۔"

آنندی بابو کے تشریف لاتے ہی سلامت نے اندر سے لان کی تمام روشنیاں جلادی تھیں اور سب حضرات ایک دوسرے کو اب صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔ ہم نے مجلس کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ حاضرین ایسے مسکرا رہے تھے جیسے کسی گہرے راز کے اچانک افشا ہو جانے پر لوگ اکثر مسکرا دیا کرتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں: "اچھا تو یہ بات ہے۔"

محفل کوئی بارہ بجے کے قریب برخاست ہوئی۔ جیسے ہی ہم کمرے میں لوٹے سلامت ٹھنڈے پانی کی صراحی اور گلاس لے کر حاضر ہو گیا۔ ہم نے ایک پورا گلاس پی کر باقی پانی بیڈ روم میں لکھنے کی میز پر رکھوا دیا۔

"آپ بڑا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کرلیں۔"

"کیوں ایسی کیا بات ہے؟"

"بس یوں ہی احتیاطاً کہہ دیا۔ ادھر کئی آوارہ کتے بلیاں ہر وقت گھومتی پھرتی ہیں ناحق پریشان نہ ہوں۔ اس لیے گزارش کی ہے۔ ویسے کوئی ڈر یا خطرہ کی بات نہیں۔"

ڈر، خطرہ، وہی الفاظ وہی لہجہ۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔ سلامت سے، ایک معمولی میس ویٹر سے اس بارے میں تفصیل سے پوچھنا ڈر کا اعتراف کرنا ہوتا۔ سلامت چلا گیا تو ہم نے احتیاطاً سارے کمروں کی روشنیاں باری باری جلا کر نہ صرف بڑے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی دیگر سب دروازے اور کھڑکیاں بھی اچھی طرح سے بند کر دیے۔ غسل خانہ میں جسم ہلکا کیا اور منہ ہاتھ دھو کر اپنے خلوت کدہ میں تشریف لے آئے۔

ایر کنڈیشنڈ کے بدستور کئی گھنٹے چلتے رہنے کی وجہ سے کمرہ خاصا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس طرح اس ٹھنڈ کو بنائے رکھنے کی غرض سے یا پھر کسی تحت الشعوری خوف کے زیر اثر ہم نے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کے درمیان والا دروازہ بھی بند کر دیا۔ اب ہم لفظ کے اصل معنوں میں خلوت گزیں تھے۔ اکیلے تھے۔ ہم تھے یا پھر تھے وہ خیالات جو آج شام کی گفتگو نے ہمارے ذہن میں بھر دیے تھے۔ رات کے کپڑوں میں ملبوس ہو کر ہم بستر پر دراز ہو گئے تو ہمیں بڑے آرام اور

آسودگی کا آبھاس ہوا۔ نرم ریشمی بستر۔ اتنا خوب صورت اور کشادہ پلنگ۔ آج کوئی ساتھ ہوتا تو زندگی بھر کے لیے مفت میں ایک خوب صورت یاد تیار ہو جاتی۔

بملا ہماری ذات میں پہلی ہی ملاقات میں آج اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی تھی ہمیں بملا ہی کا کیوں خیال آیا۔ شکنتلا کا کیوں نہیں آیا۔ جس کی محبت کے فریب میں ہم نے جوانی سے کچھ پہلے اور بچپن سے کچھ بعد کے دن مدہوشی کے سے عالم میں ایسے گزار دیئے تھے جیسے زندگی کا یہی واحد مقصد ہو۔ اور وہ مار دھاڑ جس کی وجہ سے ہمارا داہنا بازو ایک عرصہ کے لیے بیکار ہو گیا تھا۔ اور جس سے عبرت لے کر شکنتلا نے مالک رام نیگی کے چھوکرے سے شادی کر لی تھی۔

کنتی کو چھوڑو ہمیں آج کملا کی یاد کیوں نہ آئی۔ کملا جو ہماری ہم جماعت تھی اور ہم پر جان چھڑکتی تھی اور ہماری محبت کا جواب تب تک پوری گرم جوشی سے دیتی رہی تھی جب تک کہ اسے ہم سے بہتر پیار کرنے والا نہ مل گیا تھا۔ پیارے لال مقامی شوگر مل کے مالک کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کے پاس اس قسم کے پلنگ پیدا کر دینے کی اہلیت ہم سے کہیں زیادہ تھی۔

گولی مارو کملا کو بھی آج تو سلمیٰ کو یہاں ہونا چاہیئے تھا۔ سلمیٰ جو دلشاد طوائف کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ہنستی گاتی ناچتی طوائف زادی زندگی کی اصلیت ہے۔ اور شکنتلا اور کملا سراب۔

لعنت ہے ذرا آسودگی میسر ہوئی اور عشق کا خبط سوار ہو گیا۔ اُتارو اس عشق کے بھوت کو ذہن سے میاں۔ تم ایک سمجھ دار، پڑھے لکھے دانشور قسم کے آدمی ہو۔ یہ پلنگ کمبخت اتنا اونچا کیوں ہے۔ آج کل اس طرح کے قد آور پلنگوں کا کہاں رواج ہے۔ مگر یہ تو شاہی بستر ہے جناب۔ کون جانے کون کون شہزادے شہزادیاں یا راجے رانیاں کبھی اس پر سوئے ہونگے

اصول ہے کہ نئی جگہ جاؤ تو سونے سے پہلے ہر طرح سے اپنی "تشفی" کر لو نہیں تو نیند خواہ مخواہ خراب ہوتی ہے۔

کیسی تشفی؟

بھئی ایسے ہی جانور وانور سے ___

ہمارا دل واجبی رفتار سے دھڑک رہا تھا لہذا اطمینان ہوا کہ ڈرے ورے تو بہر حال ہم کوئی

ایسے ہیں نہیں، پھر بھی اصولوں کو بے وجہ جھٹلانے میں کون سی بہادری ہے۔ ہم نے اٹھ کر پہلے تو قدآور الماری کھولی جو ظاہر ہے خالی تھی ماسوائے ہمارے ہی اٹیچی اور بریف کیس کے جو سلامت میاں نے الماری کے اوپری خانوں میں سجا رکھے تھے۔ اتنی بڑی الماری اس میں دو یا تین اچھے خاصے آدمی بڑی آسانی سے چھپائے جا سکتے ہیں۔ اتنی بڑی الماری کو اتنے چھوٹے سے کمرے میں رکھنے کی بھلا کیا تُک ہے۔

ارے یہ کیسی عجیب سی آواز ہے۔ جیسے اپنے علاوہ کوئی اور بھی اس کمرے میں سانس لے رہا ہے۔ پھر وہی ڈر۔ ہم نے جھک کر پلنگ کے نیچے ٹارچ جلا کر دیکھا ایک بلّی کمبخت کہیں سے آگئی تھی جو ٹارچ کی روشنی سے نہ گھبرائی نہ ہلی جلی ہی۔ ہم نے کمبخت کو ڈرانے دھمکانے کی غرض سے کچھ ایک عجیب وغریب آوازیں بھی نکالیں۔ مگر سب سنی ان سنی کر دیں ظالم نے۔

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

ماجرا جلد ہی ہماری سمجھ میں آگیا جسے ہم بلند آواز کہتے تھے حلق سے نکلتی تو یقیناً ہم کو سنائی دیتی۔ وہ وہیں کہیں حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ معاملہ واقعی تشویشناک تھا اور ہمارے رونگٹے بھی اب باقاعدہ کھڑے ہونا شروع ہو گئے تھے اور دل بھی ذرا تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ کسی طرح دل کڑا کر کے ہم نے الماری سے کپڑوں کے ہینگر اتارے اور یکے بعد دیگرے بلّی پر دے مارے ہینگر کل ملا کر چھ تھے پانچ پھینکے جا چکے تھے کہ حقیقت ہم پر آشکارا ہوئی بلّی مرچکی تھی مگر کیسے۔ کیا عجب کسی سانپ وانپ نے ڈس لیا ہو غریب کو۔ کالرا صاحب نے بتایا تھا کہ بیڈ روم کے پائیں باغ میں رات کی رانی کی بے شمار جھاڑیاں تھیں۔ رات کی رانی کی بیلیں جن پر سانپ اکثر لپٹے رہتے ہیں۔ تو گویا ایک مردہ بلّی کے علاوہ ایک آدھ سانپ بھی ہمارے اس کمرے میں موجود تھا۔ خاصہ تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ اب اتنی رات گئے ہم کرتے بھی کیا۔ گھنٹی بجا کر سلامت علی کو بلوا سکتے تھے مگر وہ غریب بھی ان حالات میں کیا کر سکتا تھا۔

آخر بہت غور و خوض کے بعد ہمیں ایک ترکیب سوجھی اور ہم نے چپکے سے بیڈ روم کی فائر پلیس کے بالمقابل گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ چند منٹ بعد جیسے ہی سلامت علی نے باہر سے خیریت پوچھی ہم نے بڑی شاطرانہ ایکٹنگ کرتے ہوئے اس سے اندر چلے آنے کی تلقین کی اور کس طرح پیٹ پکڑ کر اس سے گرم پانی لے آنے کی درخواست کی۔ ظاہر تھا کہ ہمارے پیٹ میں درد ورد کچھ نہ تھا مگر ہم بے چارے بے سہارا اس پردیس میں اتنی رات گئے اپنے مونس و غمخوار سلامت

کے علاوہ اور کس کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ داد دینی پڑتی ہے سلامت میاں کو کہ انہوں نے ذرا بھی برا نہ منایا اور بھاگے بھاگے جا کر چند ہی منٹوں میں گرم پانی کی پوری کیتلی لے آئے۔

''ڈاکٹر کو بلواؤں صاحب''

''نہیں سلامت میاں۔ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ یہ پرانا مرض ہے جس کی دوا ہمارے پاس ہمیشہ رہتی ہے۔'' اس بیچ ہم نے پیپرمنٹ کی چند سفید گولیاں کو دانتوں سے پیس کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر لیا تھا۔

''بس گرم پانی درکار تھا جو تم لے ہی آئے ہو۔''

گرم پانی سے پیپرمنٹ کی گولیوں کا دانتوں سے بنایا ہوا سفوف ہم نے کسی طرح نگلا، اور جیسے اطمینان کی سانس لی۔

''صاحب آپ کو گیس ہے۔ بالی آپا کے پاس گیس کی بڑی ہی اچھی دوا ہے۔ صبح ہوتے ہی لے آؤں گا۔''

''نہیں بس اب اس کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہم چند ہی منٹوں میں بھلے چنگے ہو جائیں گے'' ہم نے بڑی انکساری سے فرمایا۔

پھر ہم نے سلامت علی سے پلنگ کے نیچے سے گٹھری نما جو چیز پڑی تھی باہر نکال دینے کے لیے کہا۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے کمرہ خاصہ بدبودار ہو رہا تھا سلامت نے بغیر ٹارچ جلائے ہاتھ بڑھا کر وہ چیز باہر نکال دی۔ ہم نے جھوٹ موٹ مردہ بلّی کو کپڑوں کی گٹھری سی کوئی چیز کہا تھا۔ مگر وہ واقعی ایک پرانے کالے رنگ کے کمبل میں لپٹا ہوا اسٹیل کا بدبودار تکیہ تھا۔ ہمیں دل ہی دل میں بڑی ندامت ہوئی۔ اگر سچ مچ ہی کہیں سانپ ہوتا پلنگ کے نیچے؟

بڑا حرامی ہے یہ روم بوائے صاحب۔ شہر دار کیا ہوا کمبخت اپنے آپ کو نواب کا بچہ سمجھتا ہے اور دیکھئے یہ ہینگر۔ بھلا یہ ہینگر رکھنے کی جگہ ہے۔

خوش قسمتی سے سلامت کے ہاتھ ایک ہی ہینگر لگا تھا اور نہ جانے وہ کیا سوچتا۔ سلامت چلا گیا تو ہم پھر بیڈروم میں اکیلے رہ گئے۔ وقت ایک سے اوپر ہونے کو آیا تھا اب جو ہم سونے کی تیاری کر رہے تھے تو ہم نے محسوس کیا ہمارے کمرے کے عین اوپر والے کمرے میں کوئی بھاری

قدم حضرت بے چینی سے اِدھراُدھر گھوم رہے ہیں۔ کچھ عرصہ تو ہم نے یہ نئی مصیبت کسی طرح برداشت کی۔ مگر جب یہ ڈرل کسی طرح بند نہ ہوئی تو ہم واقعی پریشان ہونے لگے۔ مگر کرتے کیا رات بہت ہولی تھی۔ کسی سے شکایت کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر سلامت علی کا خیال آیا۔ سوچا کہ اسے بلاکر تفتیش کرنے کے لیے کہیں۔ اور ممکن ہو تو وہ اوپر والے حضرت سے التجا کرے کہ انھیں گھومنا ہی ہے اور کمرے میں ہی گھومنا ہے تو کم از کم اپنے فوجی بوٹ ہی اتار لیں تاکہ اس طرح کا دل دھڑکا دینے والا دھماکہ تو نہ ہو۔
ہم ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ان حضرت نے گھومنے کی بجائے باقاعدہ ناڈو کی پریکٹس شروع کردی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی ایک اور پاؤں بھی ان کے ساتھ تھرکنا شروع ہوگئے۔
عجیب دھماچوکڑی تھی۔ قہقہوں کا بلند آواز شور۔ گھنگھروؤں کی جھنک۔ یہ سلسلہ جانے کب تک جاری رہا پھر ایکا ایک بند ہوگیا۔ یا پھر ہمیں ہی نیند آگئی۔ ایک تو لمبے سفر کی تھکان پھر نیند میں ایسا خلل۔ صبح نیند کھلی تو گیارہ کا وقت تھا غنیمت تھا سمینار کی پہلی یعنی ابتدائیہ بیٹھک دوپہر کے بعد یعنی تین بجے ہونا طے پائی تھی۔

صبح کی چائے اور بریک فاسٹ تو ظاہر ہے ہم نے لیا ہی نہ تھا۔ نہا دھوکر لنچ کی میز پر پہنچے تو بھوک پورے طور پر سلگ چکی تھی ـــــ گہری نیند نے کئی روز کے سفر کی تھکان کافی حد تک دور کردی تھی۔ اور اب ہم خوب ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے تبھی شب کے ساتھیوں اور خاص طور پر مس بملا بالی نے ہمیں دیکھا تو بہت مسرور ہوئیں۔ ہر کوئی پھر بھی ہمیں ایسے دیکھے جا رہا تھا گویا ہم کوئی مسخرا لیڈر یا ایکٹر وغیرہ سی کوئی شے ہوں اور اچانک کوئی بڑے معرکہ کی بات یا حرکت انجانے میں کر گئے ہوں۔

مس بالی تو ہم پر باقاعدہ فریفتہ ہوئی جاتی تھیں۔ آخر بات کیا ہے اصلیت کا انکشاف ہمیں لنچ کے بعد ہوا۔ جب مس بالی کو لے کر اپنے سویٹ ڈرائنگ روم میں آگئے۔
رات کی تقریبِ رقص کا ہم نے مس بالی سے ذکر کیا تو وہ ایک دم حیران ہوگئیں۔
"مگر آپ کے اوپر والا کمرہ تو کئی سالوں سے بطور فرنیچر اسٹور استعمال ہو رہا ہے۔
اور اس قدر بھرا ہوا ہے پرانے ٹوٹے پھوٹے فرنیچر سے کہ اس میں چلنا پھرنا یا ناچنا تو درکنار ایک قدم گھسنا تک ناممکن ہے۔"
"تو پھر یہ میرا وہم ہی ہوگا۔"

مس بالی نے بتایا کہ سویٹ نمبر ۲۲ آسیب زدہ ہے کہا جاتا ہے اور لیجنڈ ہے کہ وہاں کبھی ایک سابقہ رانی کا قتل ہوا تھا۔ پوری تفصیل تو خیر کسی کو بھی ٹھیک ڈھنگ سے معلوم نہ تھی مگر وجہ قتل رانی کے اپنے کسی ناتی کے ساتھ ناجائز تعلقات کا اچانک انکشاف تھا۔ راجہ نے رانی اور اس کے عاشق کو ایک ساتھ مشکوک حالات میں دیکھ کر گلا دبا کر مار ڈالا تھا۔ رانی کوئی خاندانی شہزادی نہ تھی بلکہ کسی پہاڑی گاؤں کی الھڑ دوشیزہ تھی۔ جسے دربارِ شاہی کے ایک رکن خاص مہاراج ادھیراج کی تفریح طبع کے لیے اٹھالائے تھے۔ تاکہ حضور مہاراج کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ یہ دیہاتی لڑکی جو واقعی نسوانی حسن کی بے مثال مورت تھی۔ راجہ کے من کو اتنی بھائی کہ انہوں نے اسے رانی بنا کر حرم میں داخل کر لیا۔ اور وہ اس ہیرا محل کی زینت بن گئی۔ ایسی کتنی ہی زینتیں قریب قریب ایسے ہی حالات میں شاہی محل میں لا لا کر اس طرح رانیاں بنا دی گئی تھیں۔ ایک معمولی عورت کو رانی کے خطاب سے اس لیے نوازا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ راجہ کی ملکیت رہے اس رانی نے راجہ کی واحد ملکیت ہونا منظور نہ کیا یہی اس کی ٹریجڈی تھی۔ محل کے اتہاسک کہتے ہیں کہ اس رانی کا پرانا عاشق جس کے ساتھ اس نے غالباً ساتھ ساتھ جینے اور مرنے کے عہد و پیماں کر رکھے تھے رانی کی محل میں آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد خود بھی وہیں چلا آیا اور رانی کی سفارش سے ملازم رکھ لیا گیا۔ کہتے ہیں یہ نوجوان چھوکرا راجہ کا چہیتا ملازم تھا اور صرف اسی رانی کی خدمت کے لیے مقرر تھا۔ جہاں سینکڑوں رانیاں ہوں راجہ ہر شب تو ہر کسی کے پاس جا نہیں سکتے۔ راجہ ہوتے تب بھی اور نہ ہوتے تب بھی۔ یہ ملازم رانی کے کمرے کے باہر سوتا تھا۔ تاکہ طلب کیے جانے پر حاضر خدمت رہے۔

رانی کا نام چاندنی تھا اور اس نوجوان عاشق کا نام لکشمن۔

"رامپور کا لکشمن"، ہمارے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

تو آپ نے یہ کہانی پہلے ہی سے سن رکھی ہے۔ مس بالی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"آپ بھی غضب کرتی ہیں۔ پہلے بھلا کہاں سے سنتا۔ ابھی کل ہی تو آپ کے شہر میں آیا ہوں اور پہلی بار آیا ہوں۔ "رام پور کا لکشمن"، تو ایک فلم کا نام ہے، جو اچانک میری زبان پر اپنے آپ آ گیا۔"

"حیرت ہے"، مس بالی نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ لکشمن واقعی رام پور کا تھا۔ یوپی والے رام پور کا نہیں۔ رام پور شہر کا جو ہماچل پردیش میں کبھی خود ایک اچھی خاصی

ریاست تھی۔

چاندی جوانی بن کر بعد میں چاند رانی کہلائی البتہ رام پور کی نہ تھی بلکہ جھیل کے کسی قریبی گاؤں کی رہنے والی اور لکشمن کے بھائی کی سالی تھی۔،،

کہانی سُن کر ہم پر جو کیفیت ظاہر ہے کہ طاری ہونا تھا ہوئی۔ نہ جانے ہمارے چہرے کے ہاؤ بھاؤ کیسے تھے۔ البتہ یہ ظاہر تھا کہ مس بالی واقعی ایک دم چونک گئی تھی۔

''آپ ایک دم ایسے پریشان کیوں ہوگئے ہیں۔،،

''میں خود سوچ رہا ہوں کہ چونکہ رام پور کے لکشمن سے ہماری مٹھ بھیڑ ہو چکی ہے۔ چاند رانی سے بھی ظاہر ہے کہ ضرور ہوگی۔،، اور ہم نے مس بالی کو گذشتہ دوپہر کے خواب کی ساری تفصیل سُنا دی۔ ہماری اس عجیب وغریب کہانی کو سُنکر مس بالی کا رنگ ایک دم فق ہو گیا اور وہ اداس ہوگئیں۔

''ارے آپ کیوں ناحق پریشان ہورہی ہیں۔ عام کہاوت ہے کہ دوپہر کے بادلوں تلے سونے کی وجہ سے ایسے ایسے خواب آتے ہیں۔،،

''کچھ بھی ہو خدا کے لیے آپ کمرہ بدل لیجیے یا کم ازکم کسی اور کو اپنے ساتھ رکھ لیجیے۔ آپ کو ابھی کئی اور راتیں یہاں ٹھہرنا ہے۔،، مس بالی کے دل میں ہمارے لیے واقعی عجیب وغریب اُنسیت پیدا ہوگئی تھی۔

مگر ہم ڈر جاتے اور ہتھیار ڈال دیتے تو بزدل کہلاتے ابھی کل ہی تو اسی مس بالی نے ہمیں دلیر آدمی کہا تھا۔ یہ ہماری عزت کا سوال تھا۔

''آپ نے فرمایا تھا نہ کہ چاندی عرف چاند رانی بے حد حسین عورت تھی جسے ایسی معرکہ آرا حسینہ کی قربت حاصل ہو وہ کسی دوسرے کو کیوں اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ ہاں البتہ ہم نے شرارتاً چھیڑتے ہوئے فرمایا آپ خود ساتھ دیں تو ہم تجویز پر غور کر سکتے ہیں۔

''آپ بڑے وہ ہیں۔،،

''تو گویا آپ تیار ہیں۔،،

''میں آپ کے ساتھ جہنم میں جانے کو بھی تیار ہوں وجہ میں نہیں جانتی۔ مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ بال بچے دار آدمی ہیں۔،،

"یہی اعتراض چاندی عرف چاندرانی محترمہ کو بھی ہوا تو میں محفوظ ہوں۔"

"دت صاحب آپ واقعی دلیر آدمی ہیں۔"

"دلیر نہیں ڈھیٹ البتہ ضرور ہوں۔"

"اے کاش ہم کچھ سال پہلے ملے ہوتے۔"

"کچھ سال پہلے یہ دل کشی مجھ میں نہ تھی۔ اس دل کشی کی وجہ آپ کی میرے تئیں ہمدردی ہے۔ جو یہیں انھیں مخصوص حالات میں پنپ سکتی تھی۔ علاوہ انہیں آپ مجھے کتنا بھی پہلے مل جاتیں تو بھی بات نہ بنتی۔ کیوں کہ میری شادی ۲۴ سال پرانی ہے اور اگلے سال میں اپنی ازدواجی زندگی کی سلور جبلی منانے کا ارادہ رکھتا ہوں، بشرطیکہ محترمہ چاندرانی نے خود یا مہاراج ادھیراج کی روح کو اکسا کر میرا ابھی گلا دبوا کر یہ کہانی ختم نہ کر دی۔"

"مریں آپ کے دشمن۔ آپ کی جگہ میں مر جاؤں۔"

"تو گویا آپ میری دشمن ہیں۔"

"یہ مسخرا پن چھوڑیے۔ پروفیسر صاحب اور خدارا شہر کے کسی بھی ہوٹل میں منتقل ہو جائیے ایک بار راضی ہو جائیے انتظام میں خود کر دوں گی۔ الطاف بھائی ادھر سبھی ہوٹل والوں کو جانتے ہیں۔"

"ہم آپ کے تہہ دل سے مشکور ہیں مس بالی مگر ہم میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونے والے آدمی نہیں ہیں۔ اگر آنندی بابو نے جان بوجھ کر ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے تو ہم بھی یونہی ڈٹے رہیں گے، اور یار کی چھیڑ کی انتہا دیکھیں گے۔"

"آپ ویسے ہی ضدی ہیں۔"

"ویسے کیسے۔"

"بتاؤں گی پھر کبھی۔"

"دیکھئے مس بالی آپ نے پھر یہ پہیلیاں بجھوانا شروع کر دیا ہے۔ خدارا اور نہ الجھائیے۔"

"آپ مجھے بملا کہہ کر کیوں نہیں بلاتے۔"

"اس حق کی دین کا شکریہ، گو میں اس سے بھی بڑے حق کی تمنا رکھتا ہوں بملا جی۔ مجھے آپ اندر کہہ کر پکار سکتی ہیں۔ کیوں کہ میرے دوست، احباب مجھے اس نام سے پکارتے

ہیں۔"

"بملا جی نہیں محض بملا۔ زیادہ پیار آئے تو بمی۔ کیوں کہ میری ماں مجھے اسی نام سے پکارتی تھیں۔"

"تھیں"

"جی ہاں۔ اندر جی وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دراصل میرا اپنا کہنے کو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

باتوں کا یہ سلسلہ جانے اور کب تک رہتا۔ اگر سلامت آکر رکشا والے کے آنے کی اطلاع نہ دے دیتا۔ پونے تین کا وقت ہو چلا تھا اور سمینار کا وقت تین بجے کا تھا۔

بملا سے شام کی چائے اکٹھے پینے کا وعدہ کر کے ہم رکشا میں بیٹھ گئے۔

اس طرح کے انٹیمیچول گٹ ٹوگیدر اکثر بلا وجہ طول پکڑ جاتے ہیں۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور ہم بھی بندوق بھر کر لے گئے تھے۔ لہٰذا محض دو گھنٹہ کی یہ ابتدائیہ بیٹھک جس کا واحد مقصد سمینار کا پروگرام اور ایجنڈا ترتیب دینا تھا۔ بڑی مشکل سے چار گھنٹہ میں کہیں جاکر ختم ہوئی۔ بالآخر ہم لوٹے تو آٹھ بج چکے تھے۔ ڈنر پر الطاف صاحب نے اطلاع دی کہ مس بالی کو اچانک تیز بخار ہو گیا ہے، ناساز طبیعت کے باوجود شام کو میس میں چائے پینے آئیں اور کوئی ایک گھنٹہ بیٹھیں بھی مگر بعد میں ان کی طبیعت ایکا ایک زیادہ بگڑنے لگی تو اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ ابھی ابھی وہیں سے آرہے تھے اب وہ کھانے پر نہ آسکیں گی۔ ڈاکٹر نے کھچڑی تجویز کی تھی جو انھوں نے ان کی ایک شاگردہ کے ہاتھوں ابھی ابھی بھجوائی ہے۔ کھانے کے بعد وہ ایک بار پھر ان کی خیریت پوچھنے جائیں گے۔

"آپ بھی چلیے۔"

"ضرور چلوں گا" ہمیں بڑی گلانی ہو رہی تھی۔

ایک وہ تھیں کہ خرابی صحت کے باوجود اپنے وعدہ کو نبھایا تھا اور ایک ہم تھے کہ اپنی ہی تقریر سننے کے لالچ میں وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے تھے۔

کھانے کے بعد ہم دونوں مس بالی کو دیکھنے گئے ان کا بخار کسی قدر ہلکا ہو چکا تھا اور وہ السٹریڈ ویکلی کے تازہ پرچہ میں ہمارا تر و تازہ مقالہ اکنامکس آف انہیریٹینس پڑھ رہی تھیں

ہم کو دیکھتے ہی بولیں۔ "آپ تو واقعی غضب کا لکھتے ہیں۔"

"گولی مارئیے میرے لکھنے کو۔ بتائیے آپ کیسی ہیں۔" ہم نے جان بوجھ کر اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکنے کی بات ٹال کر دی۔

"آپ کیسی ہیں۔" ایک معمولی رسمی جملہ تھا مگر یہ ہمارے دل سے نکلا ہوا تھا جس کا درد بملا بھانپ گئیں، اور سارے گلے شکوے ہو گئے اس ایک جملے کی تہہ میں۔

"آپ کی دعا ہے۔" ایسے ہی جانے کیوں تھوڑا سا بخار آ گیا تھا کھانے پینے کی کوئی بد پرہیزی ہی غالباً اس کی وجہ ہے۔ اب میں ٹھیک ہوں۔" اور جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہوں اب آپ آ گئے ہیں تو صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔

بملا نے بتایا کہ آنندی بابو بھی اُس کی مزاج پرُسی کے لیے تشریف لائے تھے۔ جب میں نے شکایت کی کہ کیوں انھوں نے آپ کو ایک آسیب زدہ کمرہ میں ٹھہرایا تو وہ خوب ہنسے۔ کہنے لگے مس بالی آپ اندر سروپ دت کو نہیں جانتیں وہ خود ایک بھوت ہے ہمارے کالج کے زمانے میں شرط لگا کر پوری ایک رات قبرستان میں سویا رہا تھا میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ دم خم اب بھی ہے کہ نہیں۔

"ظاہر ہے کہ آپ بڑے حوصلہ مند انسان ہیں اور آپ کا ایگزیبیسٹ میں ٹھہرایا جانا دو پرانے دوستوں کی باہمی چھیڑ چھاڑ ہے۔ مگر میں پھر بھی کہوں گی کہ آپ الطاف بھائی کو اپنے ساتھ سلا لیجئے یا پھر رات انھیں کے کمرے میں کاٹیے۔ اس سویٹ میں آپ کا اکیلے رہے جانا بخانے مجھے کیوں اِتنا اکھرتا ہے۔"

"آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں بڑے مزے میں ہوں اور رہوں کہ رات کو خراٹے بہت بھرتا ہوں، خواہ مخواہ الطاف بھائی کی نیند حرام نہیں کرنا چاہتا۔"

"آپ بہت بہادر ہیں۔"

"بہادر تو خیر ہم ایسے نہیں ہیں مگر توہمات کا شکار بھی ہم نہیں ہیں۔"

آنندی بابو جو اس پرانی عمارت کے چپہ چپہ سے واقف ہیں اس میں بھوتوں وغیرہ کی موجودگی کو غالباً مانتے ہیں البتہ یہ واقعہ صحیح ہے کہ اس عمارت کی پراسرار آتمائیں

شریف ہیں، اور محل کے نئے مکینوں سے ذرا بھی خفا نہیں۔ شاید اس لیے کہ ہم سب منصب وجاہ کے نمائندہ نہ ہو کر انھیں ہی کی طرح کے عام آدمی ہیں۔ الطاف صاحب کی تقریر دلچسپ بھی تھی اور حوصلہ افزا بھی۔

"پھر تو گھبرانے کی کوئی بات ہی نہیں۔ علاوہ ازیں میں بھوتوں پریتوں میں ایمان نہیں رکھتا۔ یہ سب ہمارا واہمہ ہے" یہ ہماری خفت مٹانے کی ناکام کوشش تھی کیونکہ ہم بملا کو بتا چکے تھے کہ ہم رامپور کے لکشمن کے ہاتھوں سے دو پیالے چائے چکھ چکے تھے اور وہ بھی سویٹ نمبر ۲۲ میں اپنی آمد کے پہلے ہی چند گھنٹوں میں۔

"آپ کا ایک پوری رات اطمینان سے کاٹ دینا آپ کے بے پناہ حوصلہ کا ضامن ہے اور اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ آپ واقعی اس قسم کی باتوں میں ایمان نہیں رکھتے۔ مگر میں پھر بھی کہوں گا کہ آپ کا سویٹ آسیب زدہ ہے اور یہ بات ایک چھوڑان درجنوں صاحبان نے کہی ہے، جو گاہے بگاہے اس سویٹ میں ٹھہرے ہیں" ہاں البتہ تقریر جاری رکھتے ہوئے الطاف صاحب نے فرمایا "کپڑے بدلنے کا کمرہ واقعی آسیب زدہ نہیں رہا ہے کیوں کہ وہاں ایک پاکباز مسلمان نے پانچ وقت کی نماز پورا ایک مہینہ پڑھی ہے۔ یہ حضرت ایک جرنیل صاحب کے اردلی تھے اور اپنے آقا اور ان کی بیگم اور بچوں کے ساتھ پورا ایک مہینہ اس سویٹ میں مقیم رہے تھے۔"

"آپ نماز نہیں پڑھتے۔"

"پڑھتا ہوں۔ مگر میں ایک ماڈرن قسم کا آدمی ہوں اور میرے ایمان میں وہ شدّت کہاں، جو پرانے بزرگوں میں ہوتی تھی خدا تو آپ جانتے ہیں ایمان کی چیز ہے میں تو سیّد زادہ ہوتے ہوئے بھی آدھا کافر ہوں۔"

"بخدا الطاف بھائی آپ بڑے دلچسپ اور دلدار آدمی ہیں۔ مگر آنندی بابو ہمارے پرانے کرم فرما ہیں۔ ہم نے کبھی ان سے سو روپے کی شرط اسی قسم کی ضد پر جیتی تھی۔ اگر انہوں نے مذاقاً یا تفریحاً پھر وہی ضد کی ہے تو ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے جو ہو گا دیکھا جائیگا بھلے ہی یہ چند راتیں ہمیں جاگ کر گزارنی پڑیں" ہم نے غازیوں کا سا نعرہ لگایا۔

"آپ ضد کیوں کرتے ہیں۔ مان کیوں نہیں لیتے ہماری بات" بملا واقعی بہت گھبرا گئی ہیں۔

ہم نے دیکھا مگر پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ابھی ابھی الطاف بھائی نے بتایا ہے کہ نماز کے اثر سے بھوت پریت بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر نماز میں اس بلا کا اثر ہے تو ہمارے منتر بھی ایسے بے اثر نہ ہوں گے۔ آپ مجھے گایتری کے سہارے چھوڑ دیجئے، اور فی الحال اپنا خیال کیجئے۔"

اس طرح کی باتیں کوئی گھنٹہ بھر ہوتی رہیں۔

لوٹے تو وقت گیارہ سے بھی تجاوز کر گیا تھا۔ الطاف صاحب کو راستے میں ان کے کمرہ کے قریب کی سیڑھیوں کے پاس چھوڑ کر ہم اپنے سویٹ کی جانب جا رہے تھے کہ دو لمبے لمبے سایوں کو ایک دوسرے کے پیچھے ہوا کی تیزی کے ساتھ بھاگتے دیکھ کر ایکا ایک رک گئے۔ ایک سایہ بھاگتے بھاگتے ایک اچھے خاصے آم کے درخت کو پھلانگ گیا، اور دوسرا درختوں ہی کے جھرمٹ میں کہیں تحلیل ہو گیا۔

ہم پسینہ سے تر ہو گئے۔ یہ خوف کا پسینہ تھا یا گرمی کا بہر حال ہم نے طے کر لیا کہ خوب جی جان سے نہا دھو کر ہی اب سونے کا اہتمام کریں گے۔

پچھلی رات کی محفل کا رات کو نہ نہانے کا مشورہ ہمارے ذہن سے قطعی مفقود ہو چکا تھا۔ غسل خانہ کی تینوں روشنیاں باہر ڈریسنگ روم سے جلا کر جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ فوارہ پورے زور سے چل رہا ہے مگر ہم تو جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے فوارہ بند کر کے گئے تھے۔ ممکن تھا ٹھیک ڈھنگ سے بند نہ کر پائے ہوں۔ اگرچہ ہم اس وقت بالکل ننگے اور نہانے کے لیے بالکل تیار تھے مگر ہماری پہلی امیلس بڑھ کر فوارہ بند کر دینے کی تھی۔ جیسے ہی ہم اس غرض سے آگے بڑھے ہمیں لگا جیسے ہم کسی دوسرے انسانی جسم سے بھڑ گئے ہوں ہم ایک دم چونک کر پیچھے ہٹ گئے۔ مگر پھر بھی کہیں کچھ نہ پاکر اور اس کیفیت کو بھی ذہن کا واہمہ سمجھ کر ہم پھر فوارہ کی زد میں داخل ہو گئے۔ یہ فوارہ کوئی عام قسم کا فوارہ نہ تھا۔ گھوڑے کی کھڑ کی شکل کا ایک جنگلا تھا جو زمین سے اوپر تک کوئی آٹھ نو فٹ بلند تھا ایک خاص ڈھنگ کے پائپ کی جا بجا موریوں سے پانی کی پھواریں اوپر کے علاوہ چہار جانب سے کچھ اس طرح چھوٹتی تھیں کہ جسم کا ہر حصہ ایک دم سیراب ہو جاتا تھا یعنی کہ جسم کے ہر ایک حصہ پر پانی کچھ ایسی تیزی اور شوخی سے برستا تھا کہ ہاتھ پیر ہلائے بنا جسم کے تمام عضو

اپنے آپ دُھل جاتے تھے۔ بڑی ہی پُر بہار اختراع تھی۔آپ ایک بڑی طشتری نما سفید زمین پر کھڑے ہیں، اور بے شمار ان دیکھے ہاتھوں سے مل مل کر آپ کا جسم دُھل رہا ہے۔ نکھر رہا ہے۔ بہلایا جا رہا ہے۔

ہم تقریباً آدھا گھنٹہ پانی کی پھواروں بلکہ بوچھاڑوں کا پُر تکلف لطف لیتے رہے، اور بالآخر پوری طرح سے سیر ہو کر فوارہ بند کر دیا۔ نہا کر جیسے ہی ہم باہر نکلے فوارہ پھر چلنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ ہم نے غالباً پہلے ہی کی طرح فوارہ ٹھیک ڈھنگ سے بند نہ کیا تھا اب کی بار ہم نے کنٹرول تاب گھما کر ایسے زور سے جما دیا کہ خود بہ خود نہ کھل سکے، اب کی بار ہم باہر نکلے تو فوارہ دوبارہ نہیں چلا۔ تسلی سے ڈریسنگ روم میں آ کر ہم نے جسم پونچھا اور اپنے شب خوابی کے جامہ میں ملبوس ہو گئے۔

ڈریسنگ روم میں آ کر دروازوں اور کھڑکیوں کا دوبارہ جائزہ لیا اور جیسے ہی بیڈ روم میں داخل ہونے لگے غسلخانہ سے فوارہ کے پھر سے چلنے کی آواز آنا شروع ہو گئی اب تو واقعی ہمارا دل دھک سے رہ گیا۔ دوبارہ فوارہ بند کرنے کی ہمت نہ پا کر ہم نے بھاگ کر غسلخانہ کا دوبارہ جائزہ لیا اور جیسے ہی بیڈ روم میں داخل ہوئے دروازہ بند کر دیا، اور چٹخنی چڑھا دی۔ روشنیاں بھی گل کر دیں۔

اب ہم اس کمرے میں کھڑے تھے جس کی فضا بقول الطاف بھائی خدا کے کسی پاکباز بندے نے مہینہ بھر نماز پڑھ کر بھوتوں اور پریت آتماؤں سے آزاد کرا رکھی تھی۔ حیرت تھی کہ ہمیں اس کمرہ میں ذرا بھی خوف نہ لگ رہا تھا، کیوں نہ رات ہم یہیں بسر کریں۔ مگر کیسے۔ کمرہ خاصہ گرم تھا اور اس میں پنکھا وغیرہ بھی نہ تھا۔ اس کے برعکس ہمارا بیڈ روم مثل کشمیر گل و گلزار ہو رہا تھا۔ ٹھنڈا اور بھینی بھینی خوشبو سے مہکتا ہوا۔ جی کڑا کر کے اپنے آپ پر اور اپنے تربیت یافتہ عقل و فہم پر لعنت بھیجتے ہوئے ہم بالآخر کسی طرح بیڈ روم میں آ کر بستر پر دراز ہو گئے۔ مگر پہلے احتیاطاً پچھلی رات کی طرح الماری کے اندر اور پلنگ کے نیچے جھانک کر اطمینان کر لینے کے بعد۔ بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کا درمیانی دروازہ تو ہم بند کر ہی چکے تھے، ہمیں اپنی ہوشیاری پر فخر سا محسوس ہوا۔ اب کوئی ڈر نہ تھا۔ اگر کوئی شے تھی کوئی پریت آتما وغیرہ تو ہم اسے غسلخانہ میں بند کر آئے تھے، اور راستہ میں اللہ کا گھر تھا، مسجد تھی جو ایک بفرزون کا کام دے رہی تھی۔ دماغ کا انتشار دور کرنے کے لیے

ہم نے سگریٹ سلگائی، اور لیٹے لیٹے کش پر کش لینے لگے۔ اس وقت اگر گرما گرم چائے کا پیالہ کہیں سے دستیاب ہو جاتا تو زندگی باغ و بہار ہو جاتی۔ چائے کا خیال آنا تھا کہ رام پور کا لکشمن پھر سے ہمارے ذہن میں سرک آیا، اور پھر ہم گھبرا گئے۔ گھبراہٹ کی دوسری وجہ یہ تھی کہ باہر سے ہمارا دروازہ کوئی متواتر کھٹکھٹائے جا رہا تھا ہم نے گایتری کا جاپ کرنا شروع کر دیا، اور سگریٹ ایش ٹرے کے حوالے کر کے وہ روشنی بھی گل کر دی جو آنکھوں کو چکا چوند کیے دیتی تھی اور بیڈ کے ٹھیک اوپر چھت میں لگی تھی۔ ہم کسی طرح سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیند بہت دیر بعد آئی جب آئی تو ایسی گہری جیسے مدہوشی کے عالم میں آتی ہے۔ خوب کھا کر اور بے حد پی کر۔

غسلخانہ میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ چھناک سے شیشہ کی کوئی چیز ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اندر ایسی کیا چیز تھی ہمیں یاد آیا کہ ہم نے شیشے کی صراحی اور گلاس زمین پر دے مارے تھے۔ گویا ہم نے چاند رانی کو خفا کر دیا تھا! اور صبح اٹھ کر سب سے پہلے ہمیں فرش پر جھاڑو دلوانا ہوگا، مگر دونوں اشیاء کے اس طرح چور چور ہو جانے کی وجہ کیا بتائیں گے لوگوں کو۔ یہ ادھیڑ بن جانے کب تک جاری رہی۔

چند گھنٹوں کے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ کوئی اور بھی ہمارے ساتھ سو رہا ہے، اور ہماری چادر کھینچ رہا ہے، سلمیٰ اکثر ایسا کیا کرتی ہے مگر آج ہم اسے ایسا نہ کرنے دیں گے۔ سردی اسی کو نہیں ہمیں بھی تو لگتی ہے۔ ہم نے چادر کس کر لپیٹ لی اپنے اردگرد۔ دیکھیں کیسے کھینچتی ہے۔ اب چادر، لحاف یا کمبل کھینچنا سلمیٰ کی پرانی عادت ہے۔ مگر ایسی باقاعدگی سے دھیرے دھیرے اس نے یہ سب پہلے تو کبھی نہ کیا تھا۔ یہ کوئی نیا انداز تھا خیر ہم نے بھی ضد پکڑ لی اور چادر نہیں چھوڑی۔

پھر کچھ عرصہ بعد ہمیں محسوس ہوا کہ چادر ہمارے اوپر سے پوری کی پوری سرک گئی ہے، اور ہم ایک دم ننگے ہیں۔ کمرہ اگرچہ اب بھی کافی معتدل تھا مگر پہلے ایسا ٹھنڈا نہ تھا یہ ڈر ہی تھا کہ جس نے ہمیں بیدار کر دیا تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایر کنڈیشنڈ بھی بے آواز تھا۔ یہ تو خیر آٹو میٹک تھا اور خود بخود بند ہو جاتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد

یہ روشنی، روشنی کا کیا ہوا۔

ارے بھائی ہم نے خود ہی تو سب روشنیاں گل کر دی تھیں۔ ہم نے ٹیبل لیمپ

جلانے کی کوشش کی۔ چھت کی بتی کا سوئچ دبایا مگر بے سود۔ ہاتھ سے دیا سلائی ٹٹولی۔ مگر بے کار جانے کمبخت کہاں رکھی گئی تھی۔ کافی دیر کے بعد عقل نے ہماری سمجھ کی پاسبانی کی اور سمجھایا کہ یہ کیفیت بجلی کے کرنٹ کے ایکا ایک چلے جانے کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے اور چادر ہمارے اوپر سے کسی غیر نے نہیں کھینچی بلکہ خود ہمیں نے اتار پھینکی ہے۔ غالباً گرمی کی وجہ سے۔

مگر یہ کیا ہمارے ساتھ تو واقعی کوئی سو رہا ہے وہی ہماری والی چادر اوڑھے ہلتا جلتا انسانی قالب۔ سانسوں کی مترنم آواز اور عطر کے بھبکے۔

ظاہر تھا کہ الطاف بھائی، بملا اور اس شام کے دوسرے سب احباب ٹھیک ہی فرمارہے تھے اور یہ کمرہ واقعی آسیب زدہ تھا، اور ہمارے ساتھ اس وقت ہمارے ہی بستر پر محوِ خواب ہستی جو یقیناً کوئی عورت یا عورت کی روح ہی ہو سکتی تھی، چاند رانی ہی تھی۔

چاند رانی !!

حسن کی وہ پرکالہ جس کے عشق نے ایک اچھے خاصے راجہ کو پاگل بنادیا تھا۔

سب روز روشن کی طرح عیاں تھا، مگر ہم اپنی ہم بستر ہستی کو محسوس تو کر سکتے تھے مگر دیکھ نہ سکتے تھے۔ یہ غنیمت ہی تھا ورنہ دماغی توازن قطعی طور پر کھو بیٹھتے اور بھی جانے کیا ہو جاتا۔ اب بھی جو ہو رہا تھا غیر معمولی تھا مگر جو نظر نہ آئے وہ خوف اتنا قاتلانہ نہیں ہوتا، جتنا وہ جو صاف سامنے نظر آرہا ہو۔ اب کے اگر ہم بچ نکلے تو پھر اس منحوس کمرے میں نہ سوئیں گے، اور آنندی بابو کو بیس سال پہلے جیتا ہوا سو کا نوٹ لوٹا دیں گے۔ آنندی بابو نے ٹھیک ہی سوچا تھا ہم میں وہ پہلے ایسا دم خم واقعی نہ تھا کہاں بیس کی اولین جوانی اور کہاں چالیس سالہ بڑھاپا لوگ چالیس سال کی عمر کو بڑھاپے کی جوانی کہتے ہیں۔ یہ سب کہنے کے ڈھنگ ہیں۔ جیئے جانے کے بہانے —

ہم اپنی ہم بستر ماہ پارہ کی اور خود اپنی سانسیں ایک ساتھ گنتے جارہے تھے۔

اے کاش ہم شادی شدہ ہوتے۔ شادی کرتے تو کس سے وہ کمبخت شکنتلا اور کملا تو ایسے نکل گئی تھیں، ہماری زندگی سے گویا ہمارے وجود دبدن کانٹوں کی جھاڑی ہوں۔ گولی مارو ان بے وفاؤں کو۔ ہم خود بھی شادی کے لیے راضی ہوتے تو کوئی بھی معقول عورت ہماری بیوی بننا اپنا فخر سمجھتی۔ ہم یونیورسٹی میں سینئر ریڈر ہیں۔ ملک کے مانے ہوئے

دانشوروں میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ بیگم ہوتیں تو ساتھ ہوتیں، اور ہمیں اس طرح کسی مردہ عورت کی بیقرار روح سے ہمبستری پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔

ارے ہم کدھر بھٹک رہے ہیں۔ دھیان کیوں نہیں دیتے۔ اس حقیقت پر جو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہمیں گھور رہی ہے۔ حقیقت یعنی موت جو ہمارے ساتھ ہمارے ہی بستر پر ایک بھری ہوئی عورت کا روپ دھارن کیے آرام سے سو رہی ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے بے نیاز، بے فکر یہ محترمہ رانی جی۔

مگر انہوں نے اتنی تیز خوشبوؤں کو کیوں مل رکھا ہے جسم پر۔ ایسا بھی کیا۔ اتنے سالوں کی پرانی لاش عطر میں یوں اس طرح لبریز ہوتی تو۔ یہ خوشبو تیز سہی مگر کسی جسم کی بدبو سے تو بہتر ہی ہے۔

مگر یہ جسم کہاں ہے یہ تو روح ہے ایک محبوبہ کی روح جس نے راج محل میں آکر بھی اپنے غریب عاشق کا ساتھ نہ چھوڑا، اور ایک دن اس کے لیے جان بھی دے دی۔ اس کے برعکس وہ شکنتلا، وہ کملا، یہ ایک مہمان آتما ہے۔ یہ لیلیٰ ہے، شیریں ہے، ہیر ہے، یہ محبت کی، عشق کی روح ہے، جبھی تو یہ اتنی رحم دل ہے کہ اس نے آج تک کسی زندہ آدمی کو نقصان نہیں پہنچایا۔

یہ عطر کی بھپکیاں نہیں۔ محبت سچی محبت کی خوشبو ہے، حسن کا جوہر۔ مگر یہ غسلخانے سے باہر کیسے نکلیں؟

بڑے احمق ہو میاں۔ روحوں کو کھلے اور بند کواڑوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ روح بہر حال روح ہے جو لوہے کے کواڑ بھی پھاند سکتی ہے، اور پتھر کی دیوار میں بھی تحلیل ہو سکتی ہے۔

اندھیرے میں اچانک ہمارا ہاتھ اس جانب سرک گیا جہاں چاند رانی، حسن و عشق کی شہزادی محوِ خواب تھی اور ہماری چیخ ہی تو نکل گئی۔ کمرہ روشنی سے ایک دم جگمگا اٹھا اور ایرکنڈیشنڈ بھی چلنے لگا۔

پلنگ پر کچھ نہیں تھا بس ہم تھے اور ہمارے آوارہ بو کھلائے خیالات۔
سانسوں کی موسیقی بند ہو گئی تھی، اور ایرکنڈیشنڈ کی سرگوشیاں شروع۔
خوشبو کا البتہ اب بھی وہی عالم تھا۔

ہم ابھی اس سحر میں غلطاں پریشان تھے کہ باہر کا دروازہ زور زور سے کھٹکنا شروع ہو گیا۔ ہم نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو دن کے نو بج رہے تھے۔

شرمندگی کے احساس سے ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور باہر آ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا باہر حیران و پریشان بملا کھڑی تھی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا وہ دوڑ کر ہم سے چمٹ گئی، اور ایسے رونے لگی جیسے ندی کا رُکا ہوا پانی بند کھل جانے پر ایک دم بھبک کر دھاڑ کر اُچھلتا اور کودتا اور چھلانگیں بھرتا نکلتا ہے۔

ہم دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ بملا بدستور روتی رہی اور ہم اُسے اپنے سینے سے چمٹائے مبہوت و ساکن کھڑے اس کے بالوں میں کنگھی کرتے رہے۔ بہت دیر بعد جب اس کی ہچکیاں بند ہوئیں تو اس نے بڑی مشکل سے بس اتنا ہی کہا "بھگوان کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ٹھاک ہو میں رات بھر نہیں سوئی۔"

"میں بھی رات بھر نہ سو سکا۔ کم از کم اب مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔"

عورت کی ضد تو مشہور ہے۔ مرد کی ضد کا کرشمہ البتہ آج پہلی بار دیکھنے کو ملا۔

"کیا کرشمہ؟"

"شیشہ میں ذرا اپنا منہ دیکھ کر آیئے۔ پھر بات کیجئے۔"

بملا نے شیشہ کا ذکر کیا تو ہمیں غسلخانے کے فوارے اور رات کو صراحی اور گلاس کے ٹوٹنے کی یاد آئی۔

اب اگر ہم غسلخانے کی طرف جاتے ہیں تو یقیناً دروازہ کھولنا پڑتا ہے اور ہماری مردانگی کا سارا بھرم ہوا ہو جاتا ہے۔ مگر اپنی بملا سے کیا پردہ۔ ہم نے غسلخانہ کھولا تو دھچکا سا لگا۔ فوارہ بند تھا اور شیشے کی صراحی اور گلاس جوں کا توں کانس پر دھرے تھے۔ شیشے میں منہ دیکھا تو لگا کہ کسی نے ہمارے رُخِ روشن پر سیاہی مل دی ہے۔ سارا چہرہ سیاہ ہو چلا تھا۔

ایک ہی رات میں اتنا ایسا ردّ و بدل۔ ابھی جیسے حیرانیوں کا طلسم برقرار تھا۔ صراحی کو ہاتھ میں لیا تو وہ چکنا چور ہو کر فرش پر بکھر گئی۔ گلاس بھی ہاتھ لگتے ہی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

"بملا جو پیچھے پیچھے چلی آئی پھر بھبھک بھبھک کر رونے لگی۔"

"ارے بھئی تم کیوں ناحق پریشان ہو رہی ہو۔"

"اسے دیکھیے۔" بملا نے اب ہمارے سامنے ایک فریم شدہ تصویر رکھ دی، جو وہ پہلے ہی سے پکڑے ہوئے تھی۔

"یہ تو ہو بہو میری تصویر ہے۔ مگر یہ کپڑوں کا سٹائل ہے نہ قدرے تھیٹریکل" تصویر کے پیچھے دسمبر ۱۹۳۴ء کی کوئی تاریخ تھی جو پڑھی نہ جا سکتی تھی۔

"میری تصویر آپ کے پاس کیسے پہنچ گئی۔"

"یہ میرے پتاجی کی تصویر ہے۔ کوئی چالیس سال پرانی۔"

"تم تصویر کی عمر بتا رہی ہو یا میری۔"؟

"تصویر کی۔ پتاجی ۹ ر جنوری ۱۹۳۵ء کی رات آپ ہی کی طرح ایک بھوت بنگلہ میں محض یہ ثابت کرنے کے لیے رہ گئے تھے کہ وہ بھوت پربت کو نہیں مانتے اور دوسری صبح لوگوں نے اُن کو مردہ پایا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کی موت کسی خوف کے تحت دل کی حرکت کے اچانک بند ہو جانے سے ہوئی تھی۔ صبح پو پھوٹنے سے ذرا پہلے یعنی ٹھیک ۱۰ ر جنوری ۱۹۳۵ء کے دن۔ میں ان کی موت سے ٹھیک آٹھ مہینے بعد پیدا ہوئی۔"

"اور میں ٹھیک ان کی موت ہی کے دن بلکہ وقت۔"

"ہے نا عجیب اتفاق۔"

"یعنی میرا اور تمہارا محض آٹھ مہینے کا فرق ہے۔ مناسب فرق تو آٹھ سال کا ہوتا ہے مگر فرق تو بہر حال ہونا ہی چاہیئے۔ اتنا ہی سہی۔

اتنے میں باہر دروازے پر دستک دے کر سلامت علی چائے لے آیا۔

"صاحب رات میں دروازہ ہلا ہلا کر ہار گیا۔ مگر آپ ایسی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ جگے ہی نہیں۔"

"کیا کام تھا۔؟"

"آپ فوارے کا ناب گھمانا غالباً بھول گئے تھے۔ ایسا آپ سے صبح بھی ہوا تھا۔

بائیں باغ کی ساری زمین پہلے ہی دلدل ہو رہی تھی۔ فوارہ رات بھر چلتا رہتا تو نئے پھولوں کی کیاریاں ایک دم برباد ہو جاتیں۔"

"پھر تم نے بند کیسے کیا کیونکہ ابھی ابھی جب میں نے دروازہ کھولا تو فوارہ بند تھا۔"

سلامت مسکرایا "ذرا بندر بننا پڑا۔ غسلخانے کی کھڑکی کبھی بند نہیں ہوتی۔ اسی میں سے کود کر اندر آیا تھا۔ البتہ ایک گستاخی ہو گئی۔ آپ کے کمرے کے صراحی اور گلاس مجھ سے ٹوٹ گئے تھے۔ مگر میں نے ویسے ہی کانس پر رکھ دیئے۔ خدا کو منہ دکھانا ہے اس جھوٹ کو برقرار رکھتے نہ بنا۔ تو اب آپ سے کہہ دیا۔"

سلامت چلا گیا تو بملا کو چائے بنانے کے لئے کہہ کر ہم بیڈ روم سے سگریٹ لینے گئے تو دیکھا کہ قالین پر ہماری جاباکسم کی شیشی اوندھی پڑی ہے۔ ایک ساتھ رات کے سارے راز افشا ہو گئے۔

اب ہماری ہنسی روکے نہ رکتی تھی۔ بڑی مشکل سے ہم بملا کو اپنے رات کے تجربات اور اصل حقیقت سے آگاہ کر سکے۔

تو گویا آپ ابھی تک کنونس نہیں ہیں، کہ بھوت پریت ہوتے ہیں۔

اب تو اور بھی کنونس ہو گیا ہوں۔

اب یہاں کوئی نہیں آئے گا

ایک جیسے تین کمروں والا وہ گھر ذاتی نہ ہوتے ہوئے بھی اُسے بے حد عزیز تھا۔
ایک کمرے کا دروازہ چونکہ گلی کی طرف کھُلتا تھا اور اُس میں تین بڑی بڑی کھڑکیاں بھی تھیں لہذا وہ لوگ اُسے بیٹھک یعنی ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس کمرے اور باقی کے دو کمروں کے درمیان خاصا کشادہ صحن تھا جس کے ایک طرف پانی کا ہینڈ پمپ لگا تھا۔

یہیں کھُلے میں وہ سب لوگ نہاتے اور کپڑے اور برتن وغیرہ دھوتے تھے۔ نل کے بالمقابل اُوپر چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں اور اُن کے نیچے کی بچی ہوئی جگہ میں ایک طرف اینٹوں کی دیوار کھڑی کر کے اور اس پر ٹین کی عارضی سی چھت ڈال کر اُن لوگوں نے ایک چھوٹا سا رسوئی گھر بنا رکھا تھا۔ کھانا پکانے کی اشیا تو اندر کے کمرے میں ہی رکھی جاتیں۔ مگر انگیٹھی اور پکانے کے بڑے برتن یہیں دھرے رہتے۔

باقی دو کمرے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ دونوں کے بیچوں بیچ ایک دروازہ تھا جسے یہ لوگ کبھی بند نہ کرتے تھے۔ یہ دروازہ بند کر دیا جاتا تو آخر والے یعنی تیسرے کمرے میں دیکھنا بھالنا تو درکنار سانس تک لینا محال ہو جاتا۔ اُس کمرہ میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔

لہذا روشنی کا واحد راستہ یہ بیچ والا دروازہ ہی تھا۔ یہ کمرہ ہر اعتبار سے گاؤں کے کچے مکانوں کی بھیتری کوٹھریوں کی مانند تھا اور اسی وجہ سے گھر کے سامان سے بھرا رہتا تھا۔ گھر کے مکینوں کے کپڑے بستر، صندوق، اٹیچی وغیرہ سب اِسی میں رہتے۔ اِسی کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے سٹا ہوا ایک بڑا پلنگ بچھا رہتا تھا۔ جس پر ماں وشرام فرماتیں۔ اِس کمرے کے آس پاس کی اور پچھلی دیوار چونکہ آس پاس اور پچھواڑے کے مکانوں سے سٹ کر بنی ہوئی تھی لہذا یہ کمرہ دوسرے دونوں کمروں کی نسبت ٹھنڈا بھی رہتا تھا۔

ماں کو اپنا یہ کمرہ بے حد پسند تھا۔ گھر کے کام کاج سے جیسے ہی فراغت پاتیں وہ اپنے اِس کمرے میں آبیٹھتیں۔ پلنگ والے کونے کے سامنے جو کونہ تھا باقی گھر سے نسبتاً صاف ستھرا رہتا تھا۔ یہ کونہ ماں نے اپنے نام ابھیاس کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ ہر روز اِس کونے کو کم از کم ایک بار ضرور صاف کرتیں یا کرواتیں۔ یہیں بیٹھ کر وہ اپنے گورو مہاراج سے ملے ہوئے نام کا سمرن کرتیں اور بھگوان کی رضا میں مست و مسرور رہتیں۔

گھر میں بجلی نہ تھی۔ جب یہ گھر اِن لوگوں نے کرائے پر لیا تھا تو محلّے کے اکثر گھروں میں بجلی نہ تھی۔ پھر آہستہ آہستہ گھر گھر بجلی لگ گئی۔ ایک وقت آیا کہ سارے محلّے میں صرف یہی ایک گھر رہ گیا جس میں بجلی نہ تھی۔ گھر کی بیوہ مالکن بیچاری مجبور تھی۔ اُس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ اُنھیں یہ سہولت بہم پہنچاتی۔ جب اُن لوگوں نے اپنے خرچ سے بجلی لگوا لینے اور یہ خرچہ کرائے میں مجرا کر لینے کا سجھاؤ دیا تب بھی وہ نہ مانی۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُس کی گذر بسر اِسی مکان کے کرایہ پر ہوتی ہے۔ بجلی لگوانے پر پورے ساٹھ کا خرچ تھا جس کا مطلب تھا کہ پورے چھ مہینہ اُسے کرایہ کے بغیر رہنا ہوگا۔ یہ اُس کے بس میں نہ تھا۔ اِدھر اب یہ لوگ بھی اتنے

خوشحال نہ رہے تھے کہ پورے ساٹھ روپے خود اپنی طرف سے خرچ کر دیتے۔

جب پہلے پہل یہ لوگ اِس مکان میں آئے تھے تو حالات ایسے نہ تھے۔ تب تو سَو دو سَو کی مار بھی وہ سہہ لیتے، مگر تب بجلی تھی ہی نہیں۔ بجلی کے بغیر رہنے کی اُنھیں عادت پڑ چکی تھی۔ اور عادت آپ جانتے ہیں حالات سے مانوس اور مطمئن ہو جانے کا دوسرا نام ہے۔

اپنے دو چھوٹے بچوں کو پالنے پڑھانے کے لیے ماں دِن رات پاس پڑوس کے لوگوں کے کپڑے سیتی تھی مگر کیا مجال جو گھر کے خرچ اور بچوں کے رہن سہن میں کسی طرح فرق آجائے۔ مشین چلاتے چلاتے ماں کے بازوؤں میں غیر معمولی طاقت آگئی تھی۔ مگر لگاتار ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے اور گھر کی چار دیواری سے باہر کبھی قدم نہ رکھنے کی وجہ سے اُن کی ٹانگوں میں وہ قوت نہ رہی تھی جو چلنے پھرنے کے لیے آدمی کو درکار ہوتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی اِس کمی کو کبھی محسوس نہ کیا۔ ایک جگہ بیٹھ کر وہ کچھ بھی کر سکتی تھیں، آٹھ دس گھنٹے مسلسل مشین چلا سکتی تھیں۔ ایک ساتھ دس آدمیوں کا کھانا تیار کر سکتی تھیں۔ بس اُٹھ کر یا دو قدم چل کر کوئی چیز لانے میں اُنھیں کوفت ہوتی۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ مناسب نہیں ہے اور اِس طرح کی کاہلی سے ہڈیوں میں پانی بھر جاتا ہے، مگر وہ مجبور تھیں۔ محلّہ کی دوسری عورتوں کی طرح بے مقصد گھر گھر گھومنا اُنھیں کبھی نہ بھایا تھا۔

اُن کے مرحوم چچازاد بھائی کا لڑکا نندلال جو اُن کے ساتھ رہتا تھا اور اُنھیں اپنے دو بچوں کی مانند ہی عزیز تھا۔ اُن کے گھر بار کے سارے کام منٹوں میں نبٹا دیتا۔ یہ لڑکا نہ ہوتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ وہ اکثر کہا کرتیں۔ اُنھیں کبھی خیال نہ آتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے کام تو اُن کے اپنے بیٹے بھی کر سکتے تھے مگر وہ اُن سے اِس قسم کا کوئی کام نہ کراتی تھیں۔ وہ ایک بڑے باپ کے سکول جانے والے بچے تھے۔

انھیں گھر کے کاموں پر لگا دیا گیا تو وہ پڑھائی کب اور کیسے کر پائیں گے۔

گھر میں غریبی ہونے کے باوجود اُن کے دونوں بچے محلّے کے اچھے سے اچھے بچوں سے بھی صاف ستھرے رہتے تھے۔ اچھا کھاتے اچھا پہنتے اور جیب خرچ بھی انھیں دوسرے بچوں ہی کی طرح باقاعدہ ملتا۔

پانچ سال پہلے جب اماں راولپنڈی سے جالندھر آئی تھیں تو بڑی خوشحال تھیں۔ سال میں چار بار اُن کے شوہر رقم بھیجتے تھے۔ ہر بار دو سو ڈالر یعنی آٹھ سو روپے۔ انھیں روپیوں کے بوتے پر وہ نندو کو گھر لے آئی تھیں۔ یہ لڑکا اُن کے اپنے دونوں بچوں سے بڑا تھا اور بڑا سمجھدار اور نیک بچہ تھا۔ چار جنوں کے لیے ڈھائی سو ماہانہ کی رقم بہت کافی ہوتی۔ اُن دنوں روپیہ کا سولہ سیر آٹا اور سیر بھر گھی آتا تھا۔ محلّے والے ان لوگوں کو بے حد خوشحال سمجھتے تھے وہ اکثر حیران ہوتے کہ محلہ کے اتنے گھر چھوڑ کر ماں نے بیوہ رتن وتی کا گھر کیوں پسند کیا۔ اِس گھر کے پسند کرنے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ سارے محلہ میں صرف یہی ایک گھر تھا جو پورے کا پورا لیا جا سکتا تھا۔ دوسرے گھروں میں مکاندار یا تو خود رہتا تھا یا دوسرے کرایہ دار بھی رہتے تھے۔ سارا محلہ ماں کی عزّت کرتا تھا۔ وہ عُمر کی کوئی ایسی بڑی نہ تھیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں سبھی بڑے چھوٹے انھیں دیوی ماتا ہی کہہ کر بلاتے ویسے اُن کا نام ہر دیوی تھا۔

ماں کی شادی ہوئی تھی تو وہ پندرہ برس کی تھیں سُسرال آکر معلوم ہوا کہ اُن کی ایک بیٹی بھی ہے جو اُن سے ایک سال بڑی ہے۔ یہ شادی کیسے ہوئی یہ بھی ایک کہانی ہے۔ کہاں راولپنڈی جیسا خوبصورت پُر وقار شہر اور کہاں ہوشیار پور کا ایک معمولی پچھڑا ہوا گاؤں۔ مگر وِدھاتا کے تو اپنے ہی رنگ ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیوی ماتا کے والد لالہ ایشر داس اُس شہر کی ایک معزز اور صاحب ثروت ہستی تھے۔

سارا شہر انھیں جانتا اور ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ لالہ جی کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ جب اُن کے دوست لال خاں تھانے دار نے اپنی بیٹی ساجدہ کا نکاح ڈاکٹر سجّاد سے کیا تو انھوں نے بھی طے کر دیا کہ وہ بھی بیٹی کسی ڈاکٹر کو ہی دیں گے۔ سجاد بڑا ہی پیارا نوجوان تھا۔ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کبھی دوسروں سے الگ تھلگ نہ سمجھتا۔ ہر کسی کی عزّت کرتا۔ بڑا ہی ملنسار اور خلوص والا ساجدہ کے بھاگیہ کھل گئے تھے۔

میں بھی ہر دیوی کی شادی تیرے جیسے کسی ڈاکٹر چھوکرے سے کروں گا۔ تیری نظر میں کوئی ہندو ڈاکٹر ہو تو مجھے بتانا۔

ڈاکٹر سجّاد نے اس قسم کی کوئی خبر نہ پہنچائی مگر ایک دن لال خاں تھانے دار خود اُدھر آنکلا۔ اُس کے ہاتھ میں انگریزی اخبار سول ملٹری گزٹ کا پرچہ تھا۔ آتے ہی بولا "لے ایشرے تیرا کام بن گیا۔ تو کہتا تھا نا کہ ہر دیوی کی شادی تو کسی ڈاکٹر سے ہی کرے گا۔ آج میں تیری بیٹی کے لیے رشتہ لایا ہوں" اور اُس نے پڑھ کر سنایا "ضرورت ہے اچھے گھر کے ایک ہونہار، تندرست، خوبصورت اور برسر روزگار نوجوان کے لیے ایک مناسب رشتے کی، لڑکا ڈاکٹر ہے اور لاہور کے میو ہسپتال میں ملازمت کرتا ہے۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے اشتہار کا جواب لکھا گیا۔ دوسری طرف سے تفصیلی جواب آنے پر معلوم ہوا کہ لڑکا پچیس سال کا ہے اور ہوشیار پور کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔

تو گویا تیرا ہونے والا داماد دوآبے کا باسی ہے۔ دوآبے کے لوگ بڑے دقیانوسی ہوتے ہیں ایشرے مگر تو فکر نہ کر یار لڑکا لاہور میں نوکری کرتا ہے اور لاہور تیری قسم ہماری پنڈی سے بھی بڑا شہر ہے۔ لڑکا تندرست، خوبصورت اور صاحب روزگار ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تیرے سجّاد کی طرح ڈاکٹر بھی ہے۔ اب یا دھا نہ پوچھ

میرے یار اور چپ چاپ کر دے بیٹی کی سگائی۔ اللہ بھلا کرے گا۔"

"۲۵ سال کی عمر کوئی بڑی تو نہیں۔"

"ارے بھئی لڑکا ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹری کوئی دو دن میں تو مِل نہیں جاتی۔ سجاد ساجدہ سے آٹھ سال بڑا ہے۔ تیرا داماد دس سال ہی تو بڑا ہے ہر دیوی سے۔"

لال خاں نے لفظ داماد استعمال کر کے جیسے آخری فیصلہ دے دیا ہو۔ لڑکا دیکھا گیا۔ لاکھوں میں ایک۔ انگریزوں جیسی شکل و شباہت اور انھیں جیسا رہن سہن۔ ایسے ہوتے ہوئے بھی ذاتی ٹانگہ رکھے ہوئے تھا۔

سگائی ہو گئی اور پھر کچھ وقت نکلنے پر شادی بھی۔

ماں سسرال آئی تو رشتہ کی شرارت پسند عورتوں نے ساوتری کو لا کر اُن کی گود میں بٹھا دیا۔ "لو سنبھالو بہو اپنی بیٹی۔"

وہ لوگ تو چنگاری لگا کر چلی گئیں مگر ہر دیوی کو رات بھر نیند نہ آئی۔ ایک ہی دِن میں ساری صورتِ حال اُس پر واضح ہو گئی تھی۔

اُس کے شوہر اُس سے پورے بیس سال بڑے تھے۔ یہ اِتنی بُری بات نہ تھی۔ اُدھر اُس کے میکے میں اُس کی چاچی، چاچا سے اٹھارہ سال چھوٹی تھی۔ مگر اِن لوگوں نے بابو سے یہ کیوں چھپایا کہ لڑکا رنڈوا ہے اور اُس کی مرحوم بیوی کی نشانی ایک لڑکی بھی ہے۔

یہ غم دیرپا نہ رہا کیوں کہ ڈاکٹر لال ایک بھرپور اور پیار کرنے والا مرد تھا اور دیکھنے میں ۲۵-۲۶ سال سے ایک دن بھی زیادہ نہ لگتا تھا۔

کچھ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ وقت اور عمر اُن کو کبھی نہیں چھوتے۔

"میں بڑھیا ہو گئی مگر مجھے نہ جانے کیسے یقین ہے کہ تیرے بابو جی آج بھی اسی طرح جوان اور خوبرو ہوں گے۔" وہ اکثر اپنے بچوں کو اپنی کہانی سُنایا کرتیں۔

بچوں کو باپ پر غصہ آتا کہ وہ کیوں اُن کی ماں کو چھوڑ کر بدیش چلا گیا۔ مگر یہ غصہ

دیرپا نہ ہوتا۔ کیوں کہ جب وہ اپنے باپ کی حیرت انگیز باتیں ماں دوسرے رشتہ داروں، دادا دادی یا گاؤں کے لوگوں سے سُنتے تو فخر سے اُن کا سر اونچا ہو جاتا۔ اُن کا باپ حیرت انگیز قوتوں کا مالک اور بڑا ہی دلچسپ آدمی تھا۔ اپنے سارے علاقہ کا ہیرو۔ کہا جاتا ہے کہ اِس علاقے میں ریل کی لائن بچھوانے کا سہرا اُس کے سر تھا۔ کتنے ہی سال لوگ نواں شہر میکریاں کی ریلوے لائن کو ڈاکٹر لال کی ریل کہہ کر پکارتے رہے۔

ہر دیوی کی شادی کے دو ہی مہینے بعد ساوتری کا بیاہ ہو گیا۔ وہ لوگ تو جیسے اِسی انتظار میں تھے۔

بیٹی کی شادی سے نبٹتے ہی ماں لاہور پتی کے پاس چلی آئیں۔

اچھا کشادہ گھر۔ سیر و تفریح کے لیے نجی ٹانگہ دو دو نوکر اور سب سے بڑھ کر پیار کرنے والا شوہر۔ زندگی مزے سے کٹ رہی تھی۔ شادی کے سال بھر بعد رام پیدا ہوا اور پانچ سال بعد شام۔ دونوں بچے فرشتوں کی مانند خوبصورت تھے۔ زندگی میں سُکھ ہی سُکھ تھا۔ شام بمشکل چھ مہینے کا تھا کہ مُلک کے کسی کونے سے گاندھی بابا نے نمک پر ٹیکس لگائے جانے کے خلاف جہاد کا نعرہ بُلند کیا جس کی گونج سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ سالٹ سنیگرہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے کی وجہ سے ڈاکٹر لال ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔

اچھی خاصی سرکاری نوکری کے اِس طرح چھُوٹ جانے پر بھی کوئی خوش ہو سکتا ہے۔ یہ ماں نے پہلی بار دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب نئی صورت حال سے بے حد مطمئن بلکہ مسرور تھے۔ وہ آزاد ہو گئے تھے۔ اب وہ خود اپنی پریکٹس کر سکتے تھے اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی

مگر پریکٹس تو کاروبار ہے اور کاروبار میں ہر کوئی کامیاب نہیں ہوتا۔ لیاقت کے علاوہ اچھا مقدر ہونا بھی ضروری ہے۔ پریکٹس سے ہار کر ڈاکٹر لال نے امریکہ جانے کی

ٹھان لی۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی ناکامی کے پیچھے جو ہاتھ ہے۔ بہت لمبا ہے اور وہ انھیں جم کر پریکٹس نہ کرنے دے گا۔ لاہور سے جالندھر اور جالندھر سے وہ ہوشیار پور منتقل ہوئے مگر کمشنر کا رسوخ دور رس تھا اور وہ ہندوستانی چھوکرے کو سبق سکھانے پر تُل گیا تھا۔

جب تنگ آکر وہ امریکہ چلے تب شام بمشکل ڈیڑھ سال کا بچہ تھا اور بڑا رام ساڑھے چھ سال کا۔

گاڑی چڑھتے وقت اُنھوں نے چھوٹے بیٹے کی پپّلی چھوکر کہا تھا۔ اس مُسلمان کا خیال رکھنا ہردیوی بڑا معصوم ہے بے چارہ۔ اُن کی آنکھوں میں پیار کے آنسو تھے۔ اور سینکڑوں پیارے پیارے وعدے۔

لال خاں نے اپنی ساجدہ کے تیسرے بچے کا ختنہ کیا تو ساتھ میں شام کا بھی کرادیا۔ بڑی دھوم مچائی تھی لالو نانا نے۔

"اب بول سالے" اپنے دوست کو بانہوں میں جکڑ کر اُس مردِ مومن نے کہا تھا۔ تیرا ناتی تو مُسلمان ہوگیا۔ اب تیری ہندوانی کہاں گئی۔"

نانا ایشر داس نے جواب دیا۔ "ارے اِتنا سا غیر ضروری مانس کاٹ دینے ہی سے تو کوئی مُسلمان نہیں ہوجاتا۔ راجپوت بچوں کے شریر پر ہزار ہزار زخم ہوتے ہیں۔ اِس پر تو ابھی پہلا ہی وار ہوا ہے۔"

"بڑی دوستی تھی تیرے نانا لال خاں اور نانا ایشر داس میں۔ ایسی دوستی گھر گھر پھیل جائے تو اپنا یہ ہندوستان جنّت بن جائے اور جس نے تیرے باپ کو جلاوطن ہونے پر مجبور کیا اپنے آپ بھاگ کھڑا ہو۔"

پتی کے چلے جانے کے بعد ہردیوی میکے رہنے لگی تھی۔ کبھی باپ کے گھر اور کبھی چچا لالو کے گھر۔ وہ ساجدہ کی سہیلی تھی۔ جب بھی ساجدہ میکے آتی ہردیوی کو بلا بھیجتی اور دونوں سہیلیاں ساتھ ساتھ رہتیں ایسے موقعوں پر اُس کے لالو چچا بڑی دھوم مچاتے،

جشن مناتے اور شامو کو کندھوں پر بٹھائے ہر ایک کو دِکھاتے پھرتے۔ یہ ہے میرا اصلی نواسا" شام خاں راجپوت تُم دیکھنا بڑا ہوکر رسول کی اولاد کا سب سے بڑا دوست بنے گا۔

یہ دن بھی مزے سے کٹ رہے تھے۔ امریکہ سے جو خط آتا وعدوں اور خوابوں کی خوشبوؤں سے معطر ہوتا۔ کلپنا کی دُنیا تو سبھی جانتے ہیں۔ بڑی حسین دُنیا ہوتی ہے۔ ہاتھ میں کُچھ نہ رہتے ہوئے بھی آدمی زندگی سے ہر طرح مطمئن رہتا ہے۔

ہردیوی کی ماں نے آنکھیں بند کیں تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا دُکھوں کا اُن کے بابا کے سر پر۔ اُنھوں نے دُکان پر جانا ہی بند کر دیا۔ سب کُچھ مُلازموں پر چھوڑ دیا ایک ہی سال میں لاکھوں ہزاروں کا کام مٹی ہوگیا۔

لال خاں تھانے دار نے اپنے دوست کو ایک مقامی سیٹھ کے ہاں ملازمت دلادی مگر اس سے بگڑی بات نہ بنی۔ خود سیٹھ کہلانے والا اب ایک معمولی ملازم تھا۔

بہت پہلے ہر دیوی کو ایک بار امریکہ سے شوہر نے روپے بھیجے تھے۔ تب لالہ ایشر داس اپنے رنگ میں تھے۔ اچھے وقتوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ روپے اُنھوں نے وصول تو کر لیے مگر بیٹی کو دینے کی بجائے داماد کے باپ کو بھجوا دیے اور اُسے لکھ بھیجا کہ وہ آئندہ بیوی کو روپے نہ بھیجا کرے کیونکہ ابھی بچّی اور ناتیوں کے لیے اُن کے پاس خُدا کا دیا بہت ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ یا تو خود لوٹ آئے یا اُن لوگوں کو بھی اپنے ساتھ بدیش لے جائے۔

اِس کے بعد جو رنجشیں اور اُلجھنیں پیدا ہوئیں اُنھیں کسی نے سُلجھانا ضروری نہ سمجھا۔ ہر دیوی کے سُسرال میں ہر سال دو تین ہزار ڈالر کی رقم آتی تھی جو لوگ مزے سے کھاتے تھے۔ اُن کی دونوں نندیں بھی شوہروں اور بچوں سمیت میکے آبسی تھیں۔ اب وہ خود کبھی سُسرال جاتی تو اُسے کوئی منہ نہ لگاتا۔ میکے کے روپے پیسے جب خرچ

ہو جاتے تو بے چاری لوٹ آتی۔ اماں کے مر جانے اور باپ کے دیوالیہ ہو جانے کے بعد تو ساس سُسر اور بھی ظالم ہو گئے تھے۔ اب بڑا لڑکا قدرے سیانا ہو گیا تھا۔ اُس نے پتا کو خط لکھ کر حالات سے آگاہ کیا تو اُنھوں نے اس شرط پر روپے بھیجنے شروع کر دیے کہ وہ لوگ اپنے نانا کے پاس نہ رہ کر جالندھر میں مکان لے کر رہیں۔

یہ ساری باتیں ماں بیٹوں کو رو رو کر سُنایا کرتیں اور وہ معصوم اِس کے آس پاس لیٹے لیٹے سُنا کرتے۔ اُنھیں اپنے دادا دادی پر غصّہ آتا اپنے آپ پر بھی غصّہ آتا مگر بچپن کے غصّہ میں کتنی شدت ہوتی ہے۔ باپ کی ایک چِٹھی آجاتی یا روپے آجاتے تو سب کو سب کچھ بھول جاتا۔

زندگی کسی طرح کٹ رہی تھی کہ دوسری جنگ عظیم نے بیچ میں آکر اس کا سرے سے ڈھرا ہی بدل دیا۔ باہر سے خط وکتابت پہلے کم ہوئی، پھر دھیرے دھیرے بالکل ہی بند ہو گئی۔

دو تین سال تو ماں نے کسی طرح زیور بیچ بیچ کر گزارے۔ جب کچھ بھی نہ بچا تو اُنھوں نے لوگوں کے کپڑے سینے شروع کر دیے۔ اپنے بچوں کے سر پر کبھی ایک روپیہ کا قرض بھی اُنھوں نے چڑھنے نہ دیا۔ نہ کبھی کسی رشتہ دار کے سامنے ہی ہاتھ پھیلائے۔

دن رات محنت مزدوری کرنا اور زندگی کے دن کسی طرح پورے کرنا اب اُن کا معمول ہو گیا تھا۔ شوہر کی آس بھی اُنھوں نے ایک طرح سے چھوڑ دی تھی۔ اب کبھی کوئی اُن کا ذکر بھی کرتا تو غصّہ سے چمک اُٹھتیں۔

”وہ جھوٹا تھا، بے ایمان تھا۔ پوتر اگنی کے ساکشات کیے ہوئے وعدے بھی جس نے بھلا دیے اُسے آدمی کون کہے گا۔ میرا خیال نہ سہی اپنے ان معصوم بچوں کے لیے ہی کچھ کرتا۔“

بچے بھی سوچتے، کیا آدمی ہے اُن کا باپ۔ اُنھوں نے سُن رکھا تھا کہ آدمی اپنی

عورتوں سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ خوبصورت عورتوں پر تو جان تک نچھاور کر دیتے ہیں۔ اُن کا باپ کیسا آدمی ہے۔ اُنھیں اپنی ماں دُنیا کی سب سے خوبصورت عورت لگتی تھی۔ مگر۔۔۔۔۔

"مقدر خوبصورت ہونا چاہیے بیٹے، تن کی سُندرتا کے کوئی معنی نہیں ہوتے"، ماں اکثر سمجھاتیں۔

کون جانے کہاں کیا ہوا تھا جو اُن کے باپ نے اُنھیں یکسر فراموش کر دیا تھا۔

وقت کٹ رہا تھا، وقت کب رُکتا ہے کسی کے لیے لڑکے بڑے ہو گئے۔ اچھی بھلی ملازمت بھی دونوں کو مل گئی۔ اب گھر میں تھوڑی سی چہل پہل رہنے لگی تھی۔ تین کمانے والے ہوں اور چار کھانے والے تو ظاہر ہے کہ کسی چیز کی کمی نہیں پڑتی۔

"سارے محلہ میں بجلی ہے، پنکھے ہیں، ریڈیو ہیں، بس ایک ہمارا ہی گھر ہے جہاں کچھ بھی نہیں۔ ایسا لگتا ہے ہم شہر میں نہیں کسی پچھڑے ہوئے گاؤں میں رہ رہے ہیں"، بڑے لڑکے کی ناراضگی داجب تھی۔

"سستا گھر ہے بیٹے اور پھر آس پڑوس کے سبھی لوگ ہمیں جانتے اور دُکھ سکھ میں ہمارے برابر کے شریک رہتے ہیں۔ کسی اجنبی محلہ میں چلے جائیں گے تو کون جانے کیسا پڑوس ملے"۔

لڑکوں نے ضد کر کے بجلی تو لگوالی مگر چھت والے پنکھے لگوانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ تینوں کمروں کے شہتیر بوسیدہ ہو گئے تھے اُن میں سے کسی پر بھی پنکھا نہ لگایا جا سکتا تھا۔ لاچار ہو کر لڑکے ٹیبل فین لے آئے۔

ہماری تہذیب ہمیں ہمسائے کی طرح رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ مکان کی مالکہ نے پورے دس سال سے گھر میں سفیدی نہ کرائی تھی۔ لڑکوں نے یہ بھی اپنے خرچ پر کرالی۔ مگر محض سفیدی سے گھروں کے در و دیوار سنورتے سدھرتے تو لوگ قیمتی پلستر اور

دروازوں پر رنگ و روغن کیوں کراتے۔

وقت، بارش اور اَن گنت موسموں کی تبدیلیوں نے نیم پختہ گھٹیا اینٹوں کی مٹی کی چنائی سے بنے ہوئے اِس گھر کو بے حد بدوضع بنا دیا تھا۔ لڑکے دُعا کرتے تھے کہ کم بخت کل کا گرتا آج ہی گر جائے تاکہ اُن کی ماں مکان بدلنے کو تیار تو ہو۔

آخر جب پڑوسی سیٹھ چمن لال کے محل نما گھر کا ایک حصّہ خالی ہوا تو لڑکوں نے زبردستی سامان اٹھوا کر وہاں رکھوا دیا۔

ماں نے بہت کہا سُنا مگر اُنھوں نے اُس کی ایک نہ سنی نیا گھر بڑا کشادہ اور ہر اعتبار سے آرام دہ تھا۔ مالک مکان نے تینوں کمروں میں پنکھے لگوا رکھے تھے۔ کرایہ تیس روپیہ یعنی اُن کے پہلے گھر سے تین گُنا تھا۔ مگر لڑکے بہت خوش تھے اُوپر سے تو وہ کچھ نہ کہتی تھیں مگر اندر ہی اندر ماں سُلگتی رہتی تھیں۔

ایک دن بڑے لڑکے نے پوچھ ہی لیا۔ ”آخر بات کیا ہے اماں، تم اڑوس پڑوس کی بات کرتی تھیں سو ہم نے پڑوس نہیں چھوڑا۔ محلہ نہیں چھوڑا۔ گلی نہیں چھوڑی۔ بالکل دو گھر چھوڑ کر تیسرا گھر لیا ہے۔ پھر بھی تم دُکھی رہتی ہو۔ محلے کے ہر فرد کو علم ہے کہ ہم نے مکان بدل لیا ہے ہر ڈاکیہ بھی یہ جانتا ہے۔ پھر بھی تم ۔“

”یہ اپنا گھر نہیں ہے بیٹے۔ غیر کے ایک بڑے محل کا حقیر سا کونہ ہے اپنا گھر وہ ہوتا ہے جہاں آدمی بھوکوں رہ کر بھی گھر کی مان مریادہ سنبھال کر رکھ سکے۔ یہاں تو ہر کوئی جانتا ہے کہ آج ہمارے یہاں کیا پکا ہے ہم نے کیا کھایا ہے۔ کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔ ہم آدھ سیر دودھ لیتے ہیں یا دو سیر۔ میں اب تمھیں کیسے سمجھاؤں ۔“

”تم دیکھ رہی ہو اماں کہ ہمیں وہ گھر چھوڑے چار مہینے ہو گئے ہیں مگر ابھی تک اُس پر قفل پڑا ہوا ہے کسی نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔“

نہ دیکھے کوئی۔ میں تو یہی کہوں گی کہ ہمیں وہیں رہے جانا چاہیے تھا جب تک ۔ ۔ ۔ ۔

"جب تک۔ کب تک اماں؟"

الفاظ ماں کے حلق میں اٹک گئے تھے۔

چھوٹے لڑکے نے بڑے بھائی کو جھڑک کر کہا "تم سمجھتے کیوں نہیں بھیّا۔"

پھر یہ سب سُننے میں آیا کہ کرایہ دار تو رتن وتی کے پاس کئی آئے۔ مگر اُنھوں نے کبھی کو مکان کی چابی نہ دی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کوئی کہتا اِس غریب ودھوا کو اُس کی بہو بہت تنگ کرتی ہے۔ اِس لیے وہ خود ہی اِدھر آنا چاہتی ہے۔ کئی دنوں سے گھر کی مرمت ہو رہی تھی۔ دیواروں پر پلستر چڑھایا جارہا تھا۔ دروازے بدلے جارہے تھے۔ تینوں کمروں کی چھتوں کے بڑے شہتیر بھی بدل دیے گئے تھے۔ چند ہی ہفتوں میں مکان کی کایا کلپ ہوگئی۔ بجلی تو آ ہی چکی تھی۔ رتن وتی نے تینوں کمروں میں پنکھے بھی لگوا دیے۔ رسوئی بھی بنادی اور غسلخانہ بھی۔ اب یہ ایک مکمل گھر تھا۔ ہر لحاظ سے معقول۔

"جب ہم اِدھر تھے تو کمبخت مکان پر ایک دھیلہ خرچنے کو تیار نہ تھی اور اب سنا ہے پورے پانچ سو خرچ کر کے مکان کو سُدھارا ہے۔"

"تم لوگ کہو تو میں اُس سے پھر بات کروں۔ اب تو وہ گھر ہمارے اِس گھر سے بھی بہتر ہوگیا ہے۔"

"مگر اب وہ دُگنا تگنا کرایہ مانگے گی۔"

"نہیں رے وہ ایسی عورت نہیں۔"

"کہہ دیکھو مان جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" دوسرے دن جب رتن وتی نے خود آکر چابی رام کے ہاتھ تھمادی تو وہ واقعی حیران ہوگیا۔

وہ پھر اُسی گھر میں لوٹ آئے۔

جنوری کا مہینہ تھا سب لوگ چھت پر بیٹھے اِتوار کی کھلی دھوپ کا آنند لے رہے تھے کہ نیچے دستک ہوئی۔ بڑے نے ممٹی سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ولایتی سوٹ میں

ملبوس فیٹ پہنے ایک بوڑھا کھڑا دِکھائی دیا۔ اُس کا دِل دھڑکنے لگا۔ باری باری اُسے سبھی نے دیکھا مگر کسی نے کسی سے کچھ نہ کہا یکے بعد دیگرے سب بھاگ کر نیچے اتر آئے۔

رام نووارد کو اندر لے آیا۔

"تم ڈاکٹر لال کے بڑے بیٹے ہو۔"

"جی ہاں۔"

"تمھارا وہ مسلمان بھائی کہاں ہے۔" شام نے اندر آکر خالص لکھنوی ڈھنگ سے آداب کیا۔

"اور تمھاری ماتا جی۔"

"اندر ہیں۔"

ماں دروازہ سے سٹ کر کھڑی دروازے کی دراز سے نو وارد کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میرا نام رادھا کرشن ہے۔" نو وارد نے بتایا۔

لڑکے چپ تھے ماں نے اشارہ سے اُنھیں اندر بُلا کر بتایا کہ رادھا کرشن جی اُن کے والد کے پرم متر ہیں۔

"میں پچھلے مہینہ ہی امریکہ سے لوٹا ہوں، بھابھی مجھے جانتی ہیں۔ میں تمھارے والد کا بچپن کا دوست ہوں۔ امریکہ میں وہ پہلے پہل میرے پاس ہی آئے تھے۔ آج کل میکسیکو میں منتقل ہو گئے ہیں۔ تم لوگوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔"

"یاد کرتے ہیں تو ہمیں لکھتے کیوں نہیں۔"

"چند مجبوریاں تھیں جو بھگوان کے دیا سے اب سلجھ گئی ہیں۔ وہ جلد ہی تم لوگوں کو لکھیں گے۔" اپنے بریف کیس سے ایک پیکٹ نکال کر اُنھوں نے رام کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ میری بہن کو دے دو۔ تم سب کے لیے گھڑیاں اور پین ہیں اور بھابھی کے لیے

دو ایک زیور اور دو ہزار روپے۔ یہ سب تمھارے باپ نے بھیجا ہے۔"

"تم لوگ نہ ملتے تو مجھے گاؤں جانا پڑتا، جہاں سُنا ہے تمھارے چچا نے دھاندلی مچا رکھی ہے اور تمھارے باپ کا سب کچھ ہڑپ کر لیا ہے۔ لال نے یقین دلایا تھا کہ تم لوگ مجھے یہیں اسی گھر میں ملوگے۔ اُس کے الفاظ تھے اگر وہ زندہ ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے تو اُسی گھر میں ملے گی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میرے پاس یہی اُس کا آخری پتہ ہے۔"

پورا دن اُن کے ساتھ گزار کر رادھا کرشن جی چلے گئے۔

سارا دن وہ اُن کے باپ ہی کی باتیں کرتے رہے تھے لڑکوں کا اپنے باپ پر ایمان لوٹ آیا۔

——— اُن کا باپ واقعی ایک قابل احترام ہستی ہے۔ وہ بلا وجہ اُن سے بدظن تھے ———

شام کو جب وہ سب اکٹھے ہوئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ اُن کی ماں کا سکون بھی لوٹ آیا ہے اور وہ بے حد مسرور و شادماں ہے۔ اُنھوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر اُن کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ دیکھا تُم نے۔ میں نے کہا تھا کہ ہمیں اس گھر کو نہ چھوڑنا چاہیے۔

مُلازمت کے سلسلہ میں رام مدراس اور شام دلّی چلا گیا۔ اب گھر میں ماں اور اُن کا بھتیجا ہی رہتے تھے۔ چھوٹے نے کئی بار کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلی چلے مگر وہ نہ مانیں۔

اب پھر اُنھوں نے محلے والوں کے کپڑے سینے شروع کر دیے تھے مگر اب وہ اُجرت نہ لیتی تھیں۔ اکیلے بیٹھے رہنے کی نسبت کچھ کرتے رہنا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ من مصروف رہے تو بلا وجہ بھٹکتا نہیں لڑکوں کو یہ پسند نہ تھا مگر وہ مجبور تھے۔

چھ مہینہ بعد چھوٹا لڑکا گھر لوٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گھر کا سارا سامان بیٹھک میں پڑا ہے اور ماں رسوئی بھی وہیں کرتی ہیں۔ باقی گھر یعنی پچھلے والے دونوں کمرے رتن دتّی نے خالی کرا لیے تھے اور آج کل وہ خود وہاں رہنے لگی تھی۔ ماں نے بتایا کہ

بیچاری کے بیٹے بہو نے اُسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب وہ جاتی بھی تو کہاں۔

"تم نے دو کمرے اُسے دے دیے اور اپنے پاس ایک ہی رکھا۔"

"یہ کمرہ ہوادار ہے، بڑا بھی ہے۔ پھر یہ گلی میں کھلتا ہے۔ ڈاکیہ آتا ہے تم لوگوں کی چٹھی آتی ہے تو اسی کمرہ میں پھینک کر چلا جاتا ہے۔ رتنی کی چھٹیاں بھی اُسے میں ہی دیتی ہوں۔"

تو تم محض چٹھیوں کی خاطر اس ایک کمرہ میں دن کاٹ رہی ہو۔ جن کی چٹھیوں کا تمھیں اس قدر انتظار رہتا ہے اُن کے پاس جاکر کیوں نہیں رہتی ہو۔"

"جاؤں گی رے، تم لوگ پہلے میری بہوئیں تو لے آؤ۔"

بڑے بیٹے کی شادی تو ہوگئی مگر اس کی نوکری ایسی تھی کہ بے چارے کو کسی ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا نصیب نہ تھا۔ بہو آئی تو وہ بھی ساس کے ساتھ اس کمرے میں رہنے لگی۔ رتن وتی نے اتنا کیا کہ صحن میں ان کے لیے ایک کوٹھری بنوا دی اور رسوئی گھر بھی اُن کے لیے خالی کر دیا۔

اب ماں کے سر پر بہو کی حفاظت کا بوجھ بھی آپڑا تھا۔ بڑا لڑکا آتا سال میں دو مہینے کی چھٹی پر تو وہ لوگ بیٹھک میں منتقل ہوجاتے اور ماں اور اُن کا تیسرا بیٹا کوٹھری میں۔ وہ چلا جاتا تو وہ بہو کے ساتھ بیٹھک میں لوٹ آتی اور اُن کا بھتیجا کوٹھری ہی میں رہے جاتا۔

اُن لوگوں نے کئی بار مشورہ دیا کہ وہ لوگ کوئی بڑا مکان کرائے پر لے لیں مگر ماں کبھی راضی نہ ہوتیں۔

"اب تو یہ گھر میری عادت بن گیا ہے بیٹے۔"

"تم کہا کرتی تھیں اماں کہ گھر ایسا ہونا چاہیے کہ آدمی اپنی مریادہ میں رہ سکے۔ اب اس چھوٹے سے گھر میں ایک غیر عورت کے ساتھ رہتے ہوئے تمھاری مریادہ کا بھرم

نہیں ٹوٹتا۔"

"ارے بھئی وہ بے چاری اکیلی جان ہے۔ ہم دونوں عورتیں ہم عمر ہیں اور ایک جیسی ہیں۔ وہ بیچاری دُکھیا ہے۔ زمانے کی مار کھائی ہوئی دُکھیا۔ بہو کو اُسے سونپ کر منٹ دو منٹ کے لیے اندر باہر بھی آجا سکتی ہوں۔ بڑے مزے سے کٹ رہی ہے۔ کوئی ڈر یا خوف بھی نہیں کیوں خواہ مخواہ مکان بدلتے پھریں۔"

بڑے کا ٹریننگ پیریڈ ختم ہوگیا اور اس کی تبدیلی لاہور ہوگئی۔ جہاں وہ کم از کم چار پانچ سال بڑے مزے سے ٹک کر کاٹ سکتا تھا۔ وہ آکر بیوی کو لے گیا۔ ماں پھر اکیلی ہوگئیں۔ اُس نے لاکھ کہا مگر وہ اس کے ساتھ جانے کو راضی نہ ہوئیں۔

"تم لوگوں کے کھیلنے کھانے کے دِن ہیں۔ یہ دِن پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے جاؤ موج مناؤ۔"

ایک دو سال ایسے ہی گزر گئے۔

پھر ایک دِن چھوٹے لڑکے کو خبر ملی کہ اُس کے والد کا میکسیکو میں دیہانت ہوگیا ہے۔

"مجھے آپ کو مطلع کرنے کی ہدایت دی گئی ہے کہ آپ کے پوجیہ پتا ڈاکٹر لال ۱۰ راگست ۱۹۴۷ء کی صبح کو دِل کی حرکت اچانک بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال فرما گئے اور مقامی قانون کے مطابق اُن کی بیوہ شریمتی ایجو جنز ڈی ورما اُن کی جائیداد وغیرہ کی واحد وارث قرار دے دی گئی ہیں۔"

چھوٹے نے بڑے بھائی کو خبر دی اور بڑے نے گاؤں میں اپنے بوڑھے دادا دادی کو۔ سب لوگ جالندھر کے مکان کے اُس کمرے میں جمع ہوگئے۔ سب رو رہے تھے۔ لال کی بہنیں چیخ چیخ کر بھائی کا ماتم کر رہی تھیں۔ اِس ماتم کدہ میں کوئی چُپ تھا تو وہ ستی دیوی ماں۔"

سب کہہ رہے تھے اِسے بھی رو دھو کر دِل کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہیے نہیں تو یہ بوجھ اس

کی جان لے لے گا۔

سارے حربے آزمائے گئے مگر نہ اُن کی زبان کھلی نہ آنکھوں سے دو بوند جل ہی ٹپکا۔

"کون کر سکتا ہے اِس عورت کے غم کا اندازہ۔"

رتن وتی سب کو بتا رہی تھی۔ "بیچاری پانچ سال پتی کے ساتھ رہی اور بیس سال اُس کے اِنتظار میں۔ پیسہ پیسہ جوڑ کر اور بچوں کو بتائے بغیر اِس نے اِس کھنڈر کی مرمت کرائی تاکہ۔۔۔۔اور وہ ہرجائی۔۔۔۔۔۔عورت کے لیے اِس سے بڑی لجّا کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کے رہتے اُس کا پتی کسی دوسری سے بیاہ رچالے۔ اِس مکان کا پتہ اُس کے نرلج شوہر کو معلوم تھا اسی لیے کبھی یہ گھر نہ بدلا۔"

"یہ کچھ دن جو پاس والے مکان میں رہی بھی تو اس طرح جس طرح مچھلی پانی کے بغیر۔ اس کے غم کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔"

مرحوم کی ماں چلاّئی "یہ جھوٹ ہے میرا بچہ ایسا نہ تھا۔" بچوں کے دادا نے چنگھاڑ کر کہا۔ "چپ رہ چنڈال۔ ایسا ہی تھا وہ ناخلف۔ تو نے ایک چنڈال ایک شیطان کو جنا تھا۔ آج میں شرم سے مرا جا رہا ہوں کہ میں اُس کا باپ ہوں۔ آج پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ میری بہو کیا چیز ہے۔"

نند نے ماں کے لیے زبان کھولنی چاہی تو دادا مزید چنگھاڑے۔ "چپ رہ تو شیطان کی خالہ۔ بہن ہو کر تو بھائی کے ہِت کے خلاف رہی۔ ساری عُمر اور میرے سونے جیسے پوتے یتیموں کی طرح پلے یہ اِسی دیوی کی ہمت تھی کہ اس نے انھیں پڑھا لکھا کر کسی قابل بنا دیا۔"

اپنی جگہ سے اُٹھ کر دادا جی نے بہو کو سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بولے۔

"میں اُس حرامی کا نہیں تیرا باپ ہوں۔ بیٹا میں اپنی شرم داس ہوں۔ میں۔۔۔۔۔۔" ان کا گلا رُندھ گیا۔

سب نے دیکھا۔ ماں کی آنکھیں پھوٹ پڑی ہیں اور ایک جل دھارا بہہ نکلی ہے اُن میں سے۔

رو دھوکر اور کچھ دِن رہ کر وہ لوگ اپنے اپنے دھام چلے گئے۔ رام بھی بہو کو لے کر لاہور لوٹ گیا۔

ماں نے شامو کے سر میں اُنگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں رے تو کہاں رہتا ہے دلّی میں؟"

"تو جانتی تو ہے ماں کہ میں جامع مسجد کے سامنے رہتا ہوں۔"

"تو مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا نا۔"

شام اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ خوشی سے اُس کی باچھیں کھِل گئیں۔ سچ ماں تو میرے ساتھ دلّی چلے گی مگر وہ تو مسلمانوں کا محلّہ ہے۔ میں لوٹتے ہی گھر بدل لوں گا اور پھر تمھیں آکر لے جاؤں گا۔"

ماں نے ہنس کر کہا۔ تو تو جنم کا مسلمان ہے رے۔ اپنے نانا لال خاں کا چہیتا نواسہ گھر بدلنے کی ضرورت نہیں ہے رے۔ جہاں تو رہے گا میں بھی وہیں رہ لوں گی۔ اب باقی زندگی ہی کتنی ہے۔

"ایسی نراشا کی باتیں کیوں کرتی ہو ماں۔ ہمارا باپ ایک ابھیشاپ تھا جو اُتر گیا۔ اب ہم تم مِل کر نئی زندگی شروع کریں گے۔"

ماں نے کہا تو ٹھیک کہتا ہے شامو۔ یہ گھر، یہ سامان یہیں چھوڑ جائیں گے۔ تیرے اِس تیسرے بھائی کے لیے۔ اب تو یہ خود بھی کماؤ ہو گیا ہے کیوں رے۔"

انھوں نے اپنے بھتیجے کو پیار سے نہارتے ہوئے کہا۔ "اپنی شادی میں ماں کو بلائے گا نا۔"

ماں کے اِس تیسرے بیٹے کی زبان نہ کھُلی مگر آنکھوں نے وہ ہار پرو دیے جو بھگوان پر چڑھائے جاتے ہیں۔

دیوی ماں کی رُخصتی کا وقت آیا تو سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا۔ رتن وتی، چمن سیٹھ کی ماتاجی

اور دوسری کتنی ہی عورتیں رو رو کر اپنی سہیلی سے گلے مل رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اب اُس کا دانہ پانی اِس شہر سے اُٹھ گیا ہے اور اب وہ کبھی اِدھر لوٹ کر نہ آئے گی۔

ہزار مشکلوں اور محرومیوں کے باوجود وہ اِس کھنڈر میں ٹکی رہی۔ سبھی جانتے تھے کہ کیوں۔

جتنا بڑا سوال تھا۔ اُتنا ہی بڑا جواب بھی تھا۔

مگر یہ سوال اور جواب لوگوں کے دِل میں تھے۔ اُن کی آنکھوں میں تھے۔ زبان پر یہ سب لاکر وہ اِس موقعہ کی سنجیدگی اور اِس کے وقار کو کم نہ کرنا چاہتے تھے۔

گاڑی چلنے لگی تو اُن کا تیسرا بیٹا اُن کے قدموں سے چمٹ گیا۔

"میں تیرا تیسرا بیٹا ہوں۔ مجھے بُھلا نہ دینا میری ماں میں آج پھر سے اناتھ ہو گیا ہوں۔ تم جب بھی جن حالات میں بھی مجھے بلاؤ گی میں سر کے بل دوڑ آؤں گا۔ میں اپنے بھائیوں کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی دے دینے سے کبھی گریز نہ کروں گا۔"

ماں نے اُٹھا کر اُسے سینے سے لگالیا۔

"یہ سب کہنے کی ضرورت تھی کیا۔ کیا میں نہیں جانتی اپنے خون کا رنگ!"

گاڑی اب دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ماں کا تیسرا بیٹا روتے روتے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"تو چاہے اور چھوٹا بڑے تو بے شک اب یہ مکان بدل دینا۔"

- - - - - یکایک اُن کا گلا رُندھ گیا، اور اُن کے آخری الفاظ، اب یہاں کوئی نہیں آئے گا، اُن کے حلق سے کسی طرح نکلے تو مگر کسی نے سُنے نہیں۔ زندگی کی گاڑی چل دی، ماں کے نئے گھر کی طرف۔
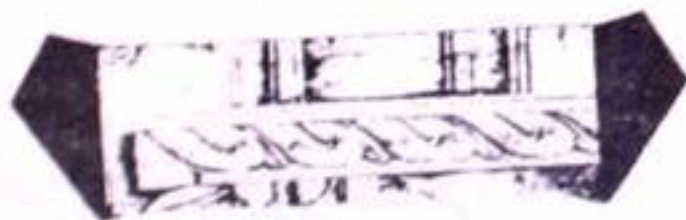
دو بڑی بڑی آنکھیں ـــــ
آفتاب کے پہلے طلوع اور پھر غروب
ہونے کے مناظر ـــــ
افق ـــ چاند ـــ ستارے ـــ خلا ـ
سیاہ و سفید دھند میں لپٹی ہماری
زمیں جو محوِ گردش ہے ـــــ
دھند کے بادلوں میں سے جھانکتی
ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں ـــــ شفیق
مہربان آنکھیں ـــــ مسکراتی ہوئی نٹ
کھٹ آنکھیں ـــــ خوف سے ہراساں
آنکھیں ـــــ غصیلی آگ برساتی ہوئی
آنکھیں ـ ـــــ
دھند میں سے ابھرتا سفید لباس میں
ملبوس ایک انسانی مجسمہ، جو دھند کے گزر
جانے پر آہستہ آہستہ ایک زندہ سفید ریش
بزرگ میں بدل جاتا ہے ـــــ
سفید ریش بزرگ :-
ابھی ابھی تم نے آفتاب دیکھا ـ میں
آفتاب کی شعاعوں کا وہ تیز گام گھوڑا ہوں
جو لاکھوں کروڑوں میلوں کی مسافت پلک
جھپکنے میں طے کر جاتا ہے ـــــ
ابھی ابھی تم نے اپنی زمین دیکھی جو اپنے
ہی محور پر رقصاں تھی ـــــ میں وہ
گردشِ پیہم ہوں جو اتنی تیزی سے گھومتی
ہے کہ ایک دم ساکن دکھائی دیتی ہے ـ

ابھی ابھی تم نے آسمانوں کی بے پایاں خلا میں ننگے چاند اور ستارے دیکھے۔ میں اِن کھُلی فضاؤں کا وہ البیلا شاہین ہوں جس کی اڑان نظر کی سیماؤں کو دم بھر میں پھلانگ جاتی ہے

آغاز و انجام سے بے نیاز ــــ ابتدا اور انتہا سے ماورا میں رفتار ہوں۔ میں وقت ہوں۔ میں سب سمجھتا ہوں، سب جانتا ہوں، سب دیکھتا ہوں ــــــــ

آدمی میں تیرا اساطیر نگار، مورخ، کہانی کار، فلسفی اور شاعر ہوں، میں تیرا ــــــــ تیرا دوست۔ تیرا باپ۔ کبھی تو مجھے مقدس باپ کہتا تھا احتراماً خدا مانتا تھا مجھے، مگر اب ــــــ

میرے ناخلف بیٹے۔ تو نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ تو میری بے غرض، بے لوث محبت کا حقدار نہیں، مگر میں تیرا باپ ہوں۔ تیرا اختلافات کے باوجود میں نے تجھے ان حقوق سے محروم و دست بردار نہیں کیا جو ایک بیٹے کے ناطے تیری وراثت ہیں۔

مگر تو ــــــــ

پھر وہی دھند۔ پس منظر میں آدمیوں کا رواں دواں ہجوم ایک عالی شان محل نما کوٹھی، جس کے بڑے دروازے سے داخل ہو کر کیمرہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک وسیع و عریض ہال میں داخل ہوتا ہے۔ اور قیمتی پوشاک میں ملبوس صوفہ چیئر میں دھنسے ایک پریشان حال آدمی کا کلوز اپ لیتا ہوا اُس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیوار پہ آویزاں ایک بڑے کلاک پر آکر رُک جاتا ہے۔

کلاک کی ٹِک ٹِک، ٹِک ٹِک، ٹِک ٹِک

دل کی دھڑکن۔ دھک دھک، دھک دھک، دھک دھک

دونوں آوازیں ایک دوسرے میں گڈ مڈ

دور سے اُلو کے بولنے کی آواز

پریشان حال آدمی۔

کیسی بھیانک، کیسی خوفناک رات ہے۔

ــــــ پھر وہی آواز ــــــ

ٹک ٹک، دھک دھک، ٹِک ٹِک دھک دھک، ٹک ٹک، دھک دھک،

وقت کی ایک نئی آواز

میں ہل چل ہوں۔ میری حکومت میں اس جھوٹے سکون کا کوئی مقام نہیں جس کے حصول کے لیے تو گناہ کرتا ہے۔ اپنے پیاروں اور عزیزوں کا قتل کرتا ہے۔ میرے فرشتوں کے نام و ناموس پر کیچڑ اچھالتا ہے۔

(کرسی میں دھنسے آدمی کا خوف سے ہراساں چہرہ)

(دروازے میں تن کر کھڑے ایک دوسرے آدمی کے ننگے پاؤں)

وہ دوسرا آدمی۔ کلاک کی ٹک ٹک گن رہے ہو۔ کب تک گنتے رہو گے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ تم ختم ہو جاؤ گے۔ باقی سب کچھ بھی ختم ہو جائے گا ———

پہلا آدمی۔ (تقریباً چیخ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) تم کون ہو؟

(کیمرہ دروازے میں کھڑے آدمی کے پاؤں سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا ہے اور اس کے چہرے پر آکر رک جاتا ہے۔ چہرہ جو بے حد خوفناک ہے اور بڑے دلخراش انداز میں خندہ زن)

پہلا آدمی۔ (دوبارہ اور بھی زور سے گرج کر) میں پوچھتا ہوں تم کون ہو ——— کون ہو تم ——— تم ———

دوسرا آدمی۔ (طنزاً) ہاں میں، یعنی کہ میں۔ پہچانتے نہیں اپنے ابو کے قاتل کو

پہلا آدمی۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا ——— مگر تم ———

دوسرا آدمی۔ جیل سے بھاگ آیا ہوں

پہلا آدمی۔ بھاگ آیا ہوں؟ تو گویا ———

دوسرا آدمی۔ بڑی واہیات قسم کی جیل تھی۔ خاصی اچھی آب و ہوا کے باوجود دل نہیں لگا۔

پہلا آدمی۔ کیسے بھاگے؟

دوسرا آدمی۔ جیسے ہی پہلا موقع ملا، دیوار پھلانگ کر چلا آیا۔

پہلا آدمی۔ تم نینی جیل میں تھے نا؟

دوسرا آدمی۔ جیسے یہ بھی بتانے کی بات ہے

پہلا آدمی۔ یہ بات نہیں، دراصل میں سوچ رہا تھا کہ ———

دوسرا آدمی۔ کیا سوچ رہے تھے تم؟

پہلا آدمی۔ یہی کہ تم نینی جیل میں تھے اور یہ بمبئی ہے۔ اتنا طویل فاصلہ اور تم بدستور جیل کی

وردی میں؟

دوسرا آدمی ۔ لو اب دیکھو (داہنے ہاتھ میں لٹک رہے اوور کوٹ کو پہن لیتا ہے) اب بھی تمہیں قیدی دکھائی دیتا ہوں ؟۔

پہلا آدمی ۔ (مسکرا کر اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے) کوٹ نے تمہاری وردی واقعی چھپالی ہے، مگر اتنے قیمتی کوٹ والا آدمی ننگے پاؤں؟

دوسرا آدمی ۔ (قہقہہ لگا کر) تمہیں تو خفیہ پولیس میں ہونا چاہیئے تھا ــــــ

پہلا آدمی ۔ پکڑ لیا نا؟ ــــــ

دوسرا آدمی ۔ کیا پکڑ لیا ۔ کیا تمہیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ تمہارے محل میں، جس کا ہر دروازہ اور گوشہ پٹھان چوکیداروں نے گھیر رکھا ہے، بوٹ پہن کر داخل نہیں ہوا جا سکتا ۔

پہلا آدمی ۔ تو پھر؟

دوسرا آدمی ۔ کھڑکی سے کود کر آیا ہوں ۔ اتنے عرصہ تک چوروں کی صحبت میں رہا ہوں نا ــــــ

پہلا آدمی ۔ بہت ہوشیار ہو گئے ہو ــــــ

دوسرا آدمی ۔ پانچ سال میں آدمی بڑی سے بڑی یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر لیتا ہے ۔

پہلا آدمی ۔ (طنزاً) یونیورسٹی ۔ خوب!

دوسرا آدمی ۔ جیل آکسفورڈ اور کیمبرج سے بھی بڑی یونیورسٹی ہے، میرے دوست ۔

پہلا آدمی ۔ تمہیں چودہ سال کی قید ہوئی تھی نا؟

دوسرا آدمی ۔ قید بامشقت مگر پانچ ہی سالوں نے . . .

پہلا آدمی ۔ تمہیں اتنا دلیر، جفاکش اور سخت جان بنا دیا کہ تم نینی جیل کی بارہ فٹ اونچی دیوار ؟۔

دوسرا آدمی ۔ تم بھول رہے ہو ۔ دُبلا پتلا ہونے کے باوجود میں کالج کا سب سے کامیاب اور توانا کھلاڑی تھا خاص طور پر لانگ جمپ میں ۔

پہلا آدمی ۔ آؤ بیٹھو اطمینان سے باتیں کریں ۔

دوسرا آدمی ۔ (بیٹھ جاتا ہے) میری بیوی کہاں ہے؟

پہلا آدمی ۔ نجمہ، تمہارے بیٹے سے ملنے نینی تال گئی ہوئی ہے ۔ تمہارے رشید کو میں پبلک اسکول میں تعلیم دلوا رہا ہوں ۔ تم نہیں کہہ سکتے کہ میں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا ۔

دوسرا آدمی ۔ (طنزاً) تم خود بھی تو ایک بڑے پبلک اسکول کی پیداوار ہو

پہلا آدمی ۔ یہ طنز بے مصرف ہے ۔ کہو کیا چاہتے ہو

دوسرا آدمی ۔ اپنی بیوی، اپنا بچہ، اور ــــــــــــــ

پہلا آدمی ۔ اور کیا ؟

دوسرا آدمی ۔ لُوٹ کا آدھا حصّہ

پہلا آدمی ۔ کونسی ــــــ کیسی لُوٹ

دوسرا آدمی ۔ یہ سب جو تمہارے چاروں طرف بکھرا پڑا ہے ۔ شاہی ٹھاٹ باٹ سے آراستہ یہ عظیم الشان عمارت ۔ کپڑے کے دو بڑے بڑے کارخانے ۔ فورٹ میں اتنا بڑا دفتر اور بنکوں میں اتنے ڈھیر سے روپے اور نمبر دو کی وہ دولت جو خدا کی طرح دکھائی نہیں دیتی مگر جس کا جلوہ کوئی نابینا بھی دیکھ سکتا ہے ۔

پہلا آدمی ۔ تمہارا قیافہ کوئی ایسا غلط نہیں ۔ مگر میرے پاس آج جو کچھ ہے وہ میرے خون اور پسینے کی کمائی ہے ۔

دوسرا آدمی ۔ خون پسینہ کی بات نہ کرو میرے دوست ۔ کوئی بھی دیکھ کر کہہ دے گا کہ تم خون ہی خون ہو اور میں پسینہ ہی پسینہ ، یعنی محض پانی ، گرچہ ــــــــــــ

پہلا آدمی ۔ اُبلتا ہوا ۔ کھولتا ہوا پانی

دوسرا آدمی ۔ تمہاری نظر بڑی تیز ہے ۔

پہلا آدمی ۔ تمہیں بچپن سے جانتا ہوں ۔ تم ہمیشہ سے ایسے ہی تھے ۔

دوسرا آدمی ۔ میں تمہاری طرح فربہ کبھی نہ تھا ۔ مگر میرا خون تب میرے اپنے جسم میں تھا ۔ اب سارے کا سارا تمہارے بدن میں منتقل ہو گیا ہے اور (ہنس کر) تمہارا پسینہ میرے خالی پنجر نے چوس لیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ بدنوں کی بات چلے گی تو تم بدن اور میں پنجر ہی کہلاؤں گا ۔

پہلا آدمی ۔ (قدرے ہکلا کر) میں ــــ میں ــــ میں ــــ

دوسرا آدمی ۔ لوٹ آئے نہ اپنی اوقات پر ۔ ہمیشہ بکری کی طرح میں میں گھگھیانے کی عادت رکھتا ہوں آج بھی ۔

پہلا آدمی۔ تم ___ تم ___ تم

دوسرا آدمی۔ ہاں ہاں کہو۔ میں ہوں تمہارے والد بزرگوار حاجی غلام رسول صاحب کا قاتل۔
جبکہ تم جانتے ہو کہ حاجی صاحب کا قتل میں نے نہیں، تم نے کیا تھا۔ تم جو اپنے حاتم
باپ کی دریادلی سے خائف تھے۔ پاکباز بوڑھا سیکڑوں، ہزاروں روپے ہر دوسرے
تیسرے رفاہ عام میں انڈیل دیتا تھا۔ تمہیں خوف تھا کہ بوڑھا اسی رفتار سے دولت لٹاتا رہا
تو تمہارے لیے کچھ نہ بچے گا۔

پہلا آدمی۔ اس میں کیا شک ہے کہ ابّو سٹھیا گئے تھے۔

دوسرا آدمی۔ ہمارا پیغمبر تنبیہہ کر گیا ہے کہ ہر مومن کو اپنی کمائی کا دس فی صد خیرات میں دینا چاہیے۔
دان دینے سے دھن نہیں گھٹتا۔ مگر تمہارا آکسفورڈ ٹرینڈ دماغ رسول کے پیغام کو کیسے
سمجھ سکتا تھا۔

پہلا آدمی۔ تم مجھ سے ملنے آئے ہو یا ماضی کی قبریں کھودنے۔ وہ وقت گزر چکا ہے۔ میں خود دو مسجدیں تعمیر
کروا چکا ہوں اس مابین۔

دوسرا آدمی۔ وقت تو ظاہر ہے کہ ایک عمر کی وحدت ہے۔ وہ میرے لیے رُکے گا نہ تمہارے لیے۔ وہ تو
گزرے گا ہی۔

پہلا آدمی۔ وقت میرے ساتھ ہے۔ میری مٹھی میں۔

دوسرا آدمی۔ تمہارا باپ ایک پاکباز مسلمان تھا۔ ایک سچا مرد مومن۔ تم احمق ہو جو ایک بحر
بے پایاں کو مٹھی میں بند کرنے کا دعویٰ کر رہے ہو۔

پہلا آدمی۔ میں نے اپنے باپ سے دس گنا زیادہ خیرات بانٹی ہے۔ میرے گناہ کا کفارہ ہو چکا ہے۔

دوسرا آدمی۔ (اُداس لہجہ میں) شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ مگر میں نے کیا پایا اس گناہِ بے لذت
میں شریک ہو کر۔ تم نے اس غریب بوڑھے کے دل میں خنجر گھونپ کر اس کی جان لے لی،
اور مجھے اپنی بیوی اور بچے کے اچھے مستقبل کے عوض چودہ سال کے لیے جیل۔ ہوا یہ
سودا مہنگا نہ تھا۔ میں نے ایک ناکردہ گناہ اپنے اوپر لے لیا اس امید پر کہ سزا کی میعاد
بھگت لینے کے بعد ہم دونوں مزے سے باقی ماندہ زندگی جی سکیں گے۔ میں اس وقت
بائیس سال کا تھا۔ آج ستائیس کا ہوں۔ سزا کی میعاد پوری کر لیتا تو بھی کوئی ایسا بوڑھا

نہ ہو گیا ہوتا۔

پہلا آدمی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ مگر تم نے قید کی میعاد ختم کیے بغیر بھاگ کر اپنے جرم کو اور بھی سنگین بنا لیا ہے۔

دوسرا آدمی۔ یہ تو تب ہی ہو گا نا جب میں دوبارہ پکڑا جاؤں گا۔

پہلا آدمی۔ یہ کون مشکل کام ہے۔ میں ابھی ٹیلی فون کر کے تمہاری یہ مشکل آسان کیے دیتا ہوں۔ (اٹھ کر ٹیلیفون کی طرف لپکتا ہے۔)

دوسرا آدمی۔ (وہیں بیٹھے بیٹھے) بے وقوف نہ بنو۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ ایک قاتل کے لیے دوسرا قتل معمولی بات ہے۔ علاوہ ازیں ________

پہلا آدمی۔ علاوہ ازیں؟

دوسرا آدمی۔ میری گرفتاری تمہارے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دے گی۔

پہلا آدمی۔ کیسی مصیبت؟

دوسرا آدمی۔ تم نے میری یعنی اپنے باپ کے قاتل کی بیوی کو اپنے گھر میں ڈال رکھا ہے۔

پہلا آدمی۔ نجمہ کی بات کر رہے ہو

دوسرا آدمی۔ نجمہ تمہارے اس دوست کی بیوی ہے جس نے تمہارا اتنا بڑا جرم اپنا کر تمہیں زندگی اور اتنی ڈھیر سی دولت بخشی۔

پہلا آدمی۔ نجمہ ایک بے وفا، سہل پسند عورت ہے، وہ تم سے پیار نہیں کرتی۔

دوسرا آدمی۔ وہ تمہاری داشتہ، تمہاری رکھیل ہو سکتی ہے مگر وہ تم سے پیار بھی کرتی ہے۔ یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔

پہلا آدمی۔ کچھ بھی کہو۔ تم دونوں اب میرے ہاں نہیں رہ سکتے۔

دوسرا آدمی۔ تمہارے جیسے خبیث کے ساتھ کون رہنا پسند کرے گا________

پہلا آدمی۔ تم آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہو۔ میرے ہی گھر میں مجھے گالی دے رہے ہو۔

دوسرا آدمی۔ تم میرے گناہ گار ہو۔ تمہیں گالی دینا میرا حق ہے مگر تمہارے ساتھ یا قریب رہنا ویسے بھی اب مناسب نہیں لہٰذا میں نے طے کیا ہے کہ میں اور نجمہ تمہارے ہی ایسے کسی الگ گھر میں تمہارے ہی ایسے ٹھاٹ باٹ سے، اپنے بچے کے ساتھ رہیں گے ________

پہلا آدمی۔ اس قسم کا گھر لاکھوں میں بنتا ہے۔

دوسرا آدمی۔ جانتا ہوں۔

پہلا آدمی۔ ابا مرحوم کے لاکھ اب کروڑ بن چکے ہیں۔

دوسرا آدمی۔ یہ بھی جانتا ہوں۔ لاکھوں کا چکر ہی ایسا ہوتا ہے۔ پہلا لاکھ بنانا ہی مشکل ہوتا ہے۔ ایک بار کسی طرح بنجائے تو باقی کے لاکھ اپنے آپ بنتے چلے جاتے ہیں تم نے لاکھوں کے کروڑ بنا کر کوئی بہت بڑی بات نہیں کی۔

پہلا آدمی۔ میں نے اس کے لیے محنت کی ہے ———

دوسرا آدمی۔ میں نے جیل جھیلی ہے۔ بیڑیاں پہنی ہیں۔ چکی پیسی ہے۔ سنگلاخ زمینیں کھودی ہیں ———

پہلا آدمی۔ میری محنت کا مقابلہ جیل کی مشقت سے کرتے ہو، جو تمہیں مجبوراً کرنی پڑی تھی۔

دوسرا آدمی۔ محنت کی نوعیت کیسی بھی ہو، محنت بہر حال محنت ہے۔ فیکٹری کو چلانے کے لیے منیجر کے دماغ اور مزدور کے قوتِ بازو دونوں کی یکساں ضرورت ہوتی ہے۔

پہلا آدمی۔ ابا مرحوم سے میں نے لگ بھگ دو لاکھ کی وراثت پائی تھی ———

دوسرا آدمی۔ ابو کو مرحوم کر کے کہو میرے دوست۔

پہلا آدمی۔ تم بے حد گستاخ ہو گئے ہو۔ کان کھول کر سن لو کہ تم میرے دوست نہیں ہو۔

دوسرا آدمی۔ جانتا ہوں مگر کبھی تو تھا۔ اب کیوں نہیں ہوں۔ یہ فرق بھی میں سمجھتا ہوں۔

پہلا آدمی۔ میرے پاس تجوری میں اس وقت سوا لاکھ کی رقم ہو گی، یہ تم لے جا سکتے ہو۔

دوسرا آدمی۔ لاکھ کبھی خاصی بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ آجکل بمبئی میں دو کمروں کا فلیٹ بھی لاکھ میں نہیں آتا۔ ویسے تم فی الحال لاکھ ہی دینا چاہو گے، تو بھی چلے گا۔

پہلا آدمی۔ فی الحال؟ تو گویا یہ سلسلہ؟

دوسرا آدمی۔ تب تک جاری رہے گا جب تک ہم دونوں میں سے ایک زندہ ہے۔

پہلا آدمی۔ تم مجھے دھمکا رہے ہو۔؟

دوسرا آدمی۔ میں تم سے اپنا حق مانگ رہا ہوں، جو ظاہر ہے کہ دھمکانا نہیں ہوتا۔

پہلا آدمی۔ (طنزاً) حق؟

دوسرا آدمی۔ تمہیں ہی کیا لفظ حق کسی بھی بیوپاری کو پسند نہیں ہوتا۔ لفظ عوضانہ چلے گا نا؟

پہلا آدمی۔ عوضانہ؟ کس چیز کا عوضانہ؟ تم کیا بیچ رہے ہو۔

دوسرا آدمی۔ وہ نایاب شے، جسے لوگ آزادی کہتے ہیں۔

پہلا آدمی۔ تم بھول رہے ہو۔ قیدی تم ہو، میں نہیں۔ تم وہ چیز بیچنا چاہتے ہو، جو تمہیں خود درکار ہے ——

دوسرا آدمی۔ تم مجھ سے بڑے قیدی ہو۔ میں قید سے فرار تو ہو سکا ہوں۔ تم بدستور قیدی ہو

پہلا آدمی۔ تمہاری آزادی چند روزہ ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔

دوسرا آدمی۔ تم بھولتے ہو —— تم مجھے اپنا سب کچھ دے دو گے جب کہ اس وقت میں نصف ہی کا طلب گار ہوں

پہلا آدمی۔ تم ایک ذلیل بلیک میلر ہو۔

دوسرا آدمی۔ سوداگری کو بلیک میل کہہ رہے ہو کیسے اناڑی بیوپاری ہو جی۔ تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں جو چیز تمہیں پیش کر رہا ہوں، وہ تمہیں دوسرا کوئی نہیں دے سکتا۔

پہلا آدمی۔ تم دَر دَر کے بھکاری!

دوسرا آدمی۔ میں غریب ضرور تھا اور ہوں بھی مگر بھکاری کبھی تھا نہ ہوں۔

پہلا آدمی۔ تم مجھے کیا دو گے؟

دوسرا آدمی۔ تمہارا کل۔ تمہارے آج اور کل کے سر پر کچے دھاگے سے ٹنگی ایک ایسی دودھاری اور نوکیلی تلوار ہے جس سے صرف میں ہی تمہیں نجات دلا سکتا ہوں۔

پہلا آدمی۔ تم مجھے ڈرا رہے ہو؟

دوسرا آدمی۔ ڈر تو تم خود ہی رہے ہو۔ دیکھو تم کانپ بھی رہے ہو۔ ذلّت اور موت کے خوف نے تمہیں ایکدم جکڑ لیا ہے۔ تم اس خوفناک حقیقت سے آشنا ہو رہے ہو، جس سے تم نے کبوتر کی طرح آنکھیں مُوند کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھ لیا تھا۔ میں تمہارے مقدر کا آئینہ ہوں۔ سچائی کا وہ کرسٹل جس میں تمہاری زندگی، ماضی حال اور مستقبل کی ساری تفصیلات بے لباس رقصاں ہیں۔ تم سے سودا کر رہا ہوں۔

پہلا آدمی۔ کیسا سودا؟

دوسرا آدمی۔ تمہاری آدمی جائیداد کے عوض میں تمہیں ماضی کے اژدہے سے آزادی۔ حال کے خوف
سے رہائی اور مستقبل کے لیے سکون ورداں دے رہا ہوں۔
پہلا آدمی۔ وقت میرے ساتھ ہے۔ تم جیل سے بھاگے ہوئے ایک حقیر مجرم ہو اور میں اپنے معاشرے
کی ایک عزت دار اور معتبر شخصیت ــــــــ
دوسرا آدمی۔ تم بیوقوف ہو، اتنا بھی نہیں جانتے کہ معاشرہ وقت کا غلام ہوتا ہے اور وقت بڑا منہ
پھٹ ہے۔ وقت اپنی بات کہہ کر چلتا بنتا ہے رُک کر، یا پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھتا۔
سننے والے نے اس کی بات کو سنا سمجھا ہے کہ نہیں وہ اس سے بے نیاز رہتا ہے۔ وہ کسی
کا دوست ہے نہ دشمن۔ بس ایک تیز رفتار جھکڑ ہے۔ زلزلہ، آندھی ــــ وقت اور سکون
دو متضاد چیزیں ہیں میرے عزیز ــــــــ
پہلا آدمی۔ تم ہمیشہ باتونی تھے۔ تمہارا یہ لیکچر۔ باتوں کا یہ طلسم سب بکواس ہے، بے وزن، کھوکھل
ہوا۔ مجھے ساری دنیا جانتی ہے۔ حاجی محمد رسول صاحب کے فرزند ارجمند حاجی عبدالرشید
کو ساری بمبئی جانتی ہے۔ سوسائٹی میں میرا ایک مستقل مقام ہے۔ ایک سزا یافتہ مجرم،
ایک سماج دشمن قاتل میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟۔
دوسرا آدمی۔ میں ملزم ہی نہیں۔ وقت بھی ہوں۔ جب کوئی پُرامن نیک شہری اور شفیق بزرگ بلاقصور
قتل کر دیا جاتا ہے، تو وقت اس منحوس سانحہ کی تصویر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔
بعد میں یہی تصویر ایک ناقابل تردید شہادت بن جاتی ہے۔
(فلیش بیک سیاہ دھند میں لپٹا ہوا ایک منظر)
ایک بے چہرہ نوجوان (پہلا آدمی) پلنگ پر دراز ایک نحیف و لاغر بوڑھے کی چھاتی پر چڑھا اس
کی چھاتی میں چھرا گھونپ رہا ہے۔
بٹن کے دبنے کی آواز اور بجلی کی چکا چوند روشنی
نوجوان قاتل (پہلا آدمی) یہ کیا مسخرا پن ہے
اس کا نوجوان ساتھی (دوسرا آدمی) بوڑھا مرنے سے پہلے ایک نظر دیکھ تو لے اس کا نجات
دہندہ کون ہے۔
دکیمرہ اس سارے ایکشن میں صرف دم توڑتے ہوئے بوڑھے کے چہرے پر ہی مرکوز ہے۔ بوڑھے

کے چہرے پر ہی مرکوز رہے۔ بوڑھے کی آنکھوں میں۔ التجا ہے، حیرت ہے، خوف ہے۔ ایک ہلکی سی چیخ ـــ ایک ہلکی سی چیخ اور سب ختم)

قاتل کا نوجوان ساتھی (دوسرا آدمی) تم نے ایک پاکباز روح کو جھریوں بھری بیمار کھال کے جنگل سے رہا کر دیا ـــــ

قاتل نوجوان (پہلا آدمی) حاجی صاحب اللہ کے گھر جانے کے لیے بیتاب تھے۔

(دونوں کا قہقہہ جس میں ظلم اور نفرت کے علاوہ خوف و ملال کے عناصر بھی کارفرما ہیں۔)

قاتل کا نوجوان ساتھی (دوسرا آدمی) لاؤ یہ چھرا اب مجھے تھما دو۔ اور بلا لو محافظان قانون کو میں قاتل کا کردار نبھانے کو تیار ہوں۔ (اس ساری ایکشن میں وقت یہ سب کچھ دیکھا اور سن رہا ہے)

(دھند ـــ ایک اور منظر)

مجرم (دوسرا آدمی) کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا ہے ـــــ

جج۔ اور چونکہ مجرم نے خود بھی جرم کا اقبال کر لیا ہے لہٰذا میں اُسے ـــــــــ

(دھند۔ سیاہ و سفید بادل جو دھیرے دھیرے چھٹتے ہیں تو وہی پرانا منظر سامنے آجاتا ہے)

پہلا آدمی۔ (سرگوزانوں میں دھرے سوچ میں گم ہے) تم سمجھتے ہو میں اعتراف گناہ کر کے ایک مری کھچی مصیبت کو گلے میں ڈال لوں گا ـــــــ

دوسرا آدمی۔ میں نے کب کہا تھا کہ تم ایسا کرو۔ میں نے تو وقت کی شہادت کی بات کہی تھی۔

پہلا آدمی۔ لے دے کر تم ہی تو ایک شہادت ہو۔ کون مانے گا تمہاری شہادت، اور کون بنے گا تمہارا گواہ ـــــ

دوسرا آدمی۔ نجمہ، میری بیوی

پہلا آدمی۔ (حقارت سے) میری داشتہ۔ میری رکھیل ـــــ

دوسرا آدمی۔ میری بیوی، میرے بچے، میرے اکلوتے بیٹے کی ماں بھی ہے۔

پہلا آدمی۔ باسی جلیبی

(فلیش بیک۔ دھند میں لپٹا ہوا ایک اور منظر)

شراب میں دُھت ایک بے چہرہ نوجوان آدمی (پہلا آدمی) ایک بے چہرہ مظلوم عورت کو زبردستی پلنگ پر گرا کر اس کی عصمت دری میں کوشاں۔ عورت چیخ چلا رہی ہے، مرد قہقہے لگا رہا ہے

(ایک کونے میں کھڑا وقت یہ سب دیکھ رہا ہے)

دوسرا آدمی ۔ تم نے اس عورت کا جسم جو ٹھا کیا ہے اس کی روح کی آبرو آج بھی بے عیب ہے ———

پہلا آدمی ۔ جو عورت درجنوں بار ———

دوسرا آدمی ۔ اس نے اپنے بیٹے کے تحفظ اور اس کے روشن مستقبل کے پیش نظر اپنا جسم تمہارے حوالے ضرور کیا مگر اس کی روح کی پاکیزگی بے داغ ہے۔ آج بھی بے عیب ہے۔

پہلا آدمی (طنزاً) کون مانے گا؟

دوسرا آدمی ۔ وہ تب بھی کہا ماننا نہ ماننا تمہاری مرضی ہے۔ لیکن اس غریب بے سہارا ابلا کا شوہر۔ میں

پہلا آدمی ۔ تم بکتے کیا ہو۔ نکل جاؤ میرے گھر سے اسی وقت ورنہ میں پولیس کو بلوا کر ———

دوسرا آدمی ۔ (ٹیلیفون کا چونگا اٹھاتے ہوئے) لو بلاؤ پولیس کو اگر ہمت ہے تو۔ مگر کہاں۔ تم بزدل ہو ہر مجرم بزدل ہوتا ہے ——— تمہاری ذلت۔ تمہاری موت تمہارے سامنے کھڑی ہے — تمہارے ذہن کا توازن بگڑ چکا ہے۔ تمہارا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ تم سوچنے سمجھنے کی حالت میں اس وقت نہیں ہو لہٰذا میں جاتا ہوں۔ مگر (جیب سے تصویروں اور پرانے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر دکھاتے ہوئے) ان کاغذات اور تصاویر میں تمہارے جرم کا ثبوت ہے ان میں ایک تصویر ایسی بھی ہے جس میں تم اپنے والدِ محترم کی چھاتی پر سوار ان کے دل میں خنجر گھونپ رہے ہو۔ بوڑھے کے چہرے پر خوف اور حیرانی کی جو شبیہہ کھنچ آئی ہے اس سے بڑا ثبوت کیا درکار ہوگا قانون کو ———

(فلیش بیک ۔ اسی پہلے منظر کا وہی حصہ جس میں بوڑھے کا قتل ہو رہا ہے)

پہلا آدمی ۔ (تصویر کو چھیننے کے لیے جھپٹتا ہے)

دوسرا آدمی ۔ اسے دھکا دے کر گرا دیتا ہے)

پہلا آدمی ۔ تمہاری یہ مجال ———

دوسرا آدمی ۔ تم سمجھتے ہو میں تمہیں یہ سارے ثبوت جو تمہارا اقبالِ جرم ہیں اتنی آسانی سے لوٹا دوں گا۔

پہلا آدمی ۔ (چل کر میز پر آ بیٹھتا ہے مگر کوئی جواب نہیں دیتا مڑ مڑ کر کلاک کی چلتی ہوئی سوئیوں کی طرف دیکھے جا رہا ہے)

دوسرا آدمی ۔ یہ تم ایک ٹک گھڑی کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ تمہارے اس کلاک کی ٹک ٹک بے معنی

آواز ہے ۔ وقت کو سمجھنے کا ایک بڑا ہی ناکارہ اور ناقابل اعتماد آلہ ۔ مگر اس وقت یہ بھی وہی کہہ رہا ہے جو میں کہہ رہا ہوں ۔ غور سے سنو یہ کیا کہہ رہا ہے ۔

ایک غیبی آواز ۔ پس منظر میں وقت کی مدھم سی پرچھائیں

تیرے ساتھی کے بُرے دن ختم ہو گئے ——————

تیرے شروع ہو رہے ہیں ۔

پہلا آدمی ۔ حیران و ششدر ، کسی قدر خوف زدہ بھی ، مگر چپ

دوسرا آدمی ۔ چپ کیوں ہو ۔ اتنے سارے اہل کار ، ملازم ہیں تمہارے ، اپنی اس بے بسی اور بے سہارگی میں کسی کو پکارتے کیوں نہیں ۔

(دور سے آتی ہوئی قدموں کی چاپ ——)

پہلا آدمی ۔ (لپک کر میز کی دراز سے پستول نکال لیتا ہے)

اب تم میرے رحم و کرم پر ہو پستول کی گولی ابھی تمہارے سینے سے پار ہو جائے گی اور میرے آدمی تمہاری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے پالتو کتوں کو کھلا دینگے ۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی کہ تمہارے ایسا کوئی آدمی اس گھر میں کبھی آیا بھی تھا ۔

دوسرا آدمی ۔ نووارد ، تمہارے آدمی نہ ہوئے تو ؟

پہلا آدمی ۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ۔ حقیقت کچھ بھی رہی ہو ، مگر ملک کا قانون تمہیں قاتل تسلیم کر چکا ہے ۔ تم میرے خاندان کے دشمن ہو ۔ باپ کے بعد بیٹے کو قتل کرنے کے لیے جیل سے فرار ہوئے تھے مگر بیٹے نے اپنی ذاتی حفاظت کے لیے تمہیں ہلاک کر دیا ۔

دوسرا آدمی ۔ کہانی اچھی ہے ۔ ہر مجرم کی کہانی اچھی ہوتی ہے ۔ دیکھتے کیا ہو ۔ چلاؤ پستول ہم بھی دیکھیں تم میں کتنا دم ہے ۔

پہلا آدمی ۔ یہ کوئی معمولی ریوالور نہیں ۔ اس سے ایک اونٹ بھی ہلاک کیا جا سکتا ہے ۔

دوسرا آدمی ۔ باتیں ہی بناؤ گے یا آزماؤ گے بھی اپنے اس ہتھیار کو ——————

پہلا آدمی ۔ مرنے کے لیے بہت اتاولے ہو رہے ہو ۔ لو (پستول چلاتا ہے) ایک بار ، دو بار ، تین بار ، چار بار

دوسرا آدمی ۔ تم بھی خالی ۔ تمہارا پستول بھی خالی ۔

پہلا آدمی ۔ (مسکرا کر) میں تو مذاق کر رہا تھا ۔ اسی طرح جیسے ابھی ابھی تم ۔

دوسرا آدمی۔ میں نے کون سا مذاق کیا تھا

پہلا آدمی۔ یہی کہ تمہارے پاس میرے ابو کی جان لیتے وقت کی تصویر ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پاس اس قسم کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تم نے وہ منظر دیکھا تھا۔ تم اس واقعہ کے واحد چشم دید گواہ ہو۔ تصویر کا ذکر کر کے تم مجھے وہ منظر یاد دلانا چاہتے تھے، تاکہ میں ـــــــــ

دوسرا آدمی۔ (طنزیہ) بڑے سمجھ دار ہو گئے ہو میاں تمہیں۔ تم نے اپنے باپ کا قتل کیوں کیا تھا؟

پہلا آدمی۔ بوڑھا سٹھیا گیا تھا۔ اپنی کمائی ہوئی دولت کے علاوہ ہماری آبائی جائیداد بھی نکمے اور ناکارہ قسم کے بھک منگوں میں بانٹ کر ثواب کمانا چاہتا تھا ـــــــــ

دوسرا آدمی۔ اور بات یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ زمین کا جو حصہ تم نے اپنی ذاتی رہائش کے لیے تجویز کیا تھا وہ اس پر بھی مسجد بنانے کے درپے تھا۔ تم نے اسے قتل کر دیا اچھا ہی کیا۔ تمہارا حق چھیننے کا اُسے کوئی حق نہ تھا۔

پہلا آدمی۔ وہ اپنے خدا کو ہی حق مانتا تھا۔ میں نے اسے اس کے بنانے والے کے ہاں بھجوا کر اس پر ظلم نہیں، مہربانی کی تھی۔

دوسرا آدمی۔ اب آئے ہو نا راہ راست پر۔ مجھے اتنی بڑی بات ہضم کر جانے کے لیے کہہ رہے تھے بلا اجرت۔

پہلا آدمی۔ ارے بھئی، تم سیدھے راستہ سے یہ سارا ڈرامہ کھیلے بغیر اندر آتے تو ہم مل کر کاروبار کی بات کرتے۔ تم آئے ہی اس طرح کہ میرا موڈ بگڑ گیا۔

دوسرا آدمی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے یوں وارد بلکہ نازل ہونے کا طور طریقہ مناسب نہیں تھا، مگر میں بھی کیا کرتا قید سے بھاگا ہوا مجرم اور آتا بھی کیسے۔

پہلا آدمی۔ سزا کی میعاد پوری کیے بغیر تمہارا یوں اچانک آدھمکنا ایک اچنبھا سا تھا۔

دوسرا آدمی۔ تو تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے۔

پہلا آدمی۔ معاہدہ کہو میرے یار۔ وہ قرارداد میرے ذہن پر ایسے نقش ہے جیسے کل کی بات ہو۔ تم بہت بدل گئے ہو

دوسرا آدمی۔ تم نے جیل نہیں دیکھی ورنہ میرے بھاگ آنے پر حیران نہ ہوتے ـــــــــ مگر تم خود بھی تو ماشاء اللہ خاصے بدل گئے ہو۔

.آدمی ۔ میں منکر نہیں مگر تم تو ایک دم

دوسرا آدمی ۔ ہڈیوں کا پنجر۔ قید بامشقت کے پانچ سال ۔ جیل کی سوکھی ادھ کچی یا ایک دم جلی بھنی روٹیاں اور تنہائی ۔ مگر تم تو ماشاءاللہ

پہلا آدمی ۔ ذرا فربہ ہو گیا ہوں ۔

دوسرا آدمی ۔ ذرا مسکراتے ہوئے) انڈر سٹیٹمینٹ کی تمہاری عادت نہیں گئی ۔ دیکھتا ہوں تم ویسے کے ویسے صاحب بہادر ہو

پہلا آدمی ۔ آزادی کے بعد ہماری شہری زندگی پر یورپ اور امریکہ کے رنگوں کی چھاپ اور بھی گہری ہو گئی ہے ۔ تم جانتے تھے کہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے پھر بلا وجہ کھڑکی میں سے کود کر کیوں آئے ؟

دوسرا آدمی ۔ ایک سزا یافتہ ملزم کو ایک شریف آدمی کے گھر چوروں کی طرح چھپ کر داخل ہونا چاہئے ———

پہلا آدمی ۔ ابھی ابھی تم کس تصویر کا ذکر کر رہے تھے ، یہی جو تمہارے ہاتھ میں ہے ، کیا ہے ۔

دوسرا آدمی ۔ چند تصویریں ، چند خطوط جاناں ۔

پہلا آدمی ۔ مسکرا کر ۔ کس کی تصویریں کس کے خطوط ۔

دوسرا آدمی ۔ ہمارے تمہارے بچپن کی یادگاریں ———

پہلا آدمی ۔ اب جب کہ بادل چھٹ گئے ہیں اور ہم تم ایک دوسرے کو ایک بار پھر سے اسی پرانی پہلے والی نظر سے دیکھ رہے ہیں ، تو پھر ان پرانی دستاویز کو چھپانے سے کیا حاصل ؟

دوسرا آدمی ۔ (کاغذات کو جیب میں ڈال لیتا ہے)

پہلا آدمی ۔ دکھاؤ گے نہیں ؟

دوسرا آدمی ۔ کیوں نہیں ضرور دکھاؤں گا ۔ ان خطوط میں تم نے مجھ سے بار ہا اپنے ابو کی بے راہ روی کے تذکرے کئے ہیں ۔

پہلا آدمی ۔ تب تو ظاہر ہے کہ یہ دستاویز میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں ۔ تم انھیں اتنے دنوں جیل میں کیسے رکھے رہے ۔

دوسرا آدمی ۔ یہ سب کچھ میں نجمہ کے پاس بحفاظت رکھ گیا تھا ۔

پہلا آدمی ۔ (خوفزدہ ہو کر) ، نجمہ ؟

دوسرا آدمی ۔ گھبرا کیوں گئے ، نجمہ ہی نے تو مجھے نینی جیل سے فرار ہونے اور تمہیں اس طرح ملنے

کی ترغیب دی تھی۔

پہلا آدمی ۔ تو وہ تمہیں اس مابین ملتی بھی رہی ہے ۔ شیطان کی پرکالہ !

دوسرا آدمی ۔ تم اپنے پیارے دوست اور پارٹنر کی بیوی کو گالی دے رہے ہو ——

پہلا آدمی ۔ اسے بیوی نہ کہو ۔ بدن فروش عورت فاحشہ ہوتی ہے ۔

دوسرا آدمی ۔ عورت جب اپنی اکلوتی اولاد کے فلاح اور تحفظ کے لیے جسم کا سودا کرتی ہے تو وہ ماں ہوتی ہے فاحشہ نہیں ہوتی ۔

پہلا آدمی ۔ تم جانو ۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسی خبیث عورت کو منھ نہ لگاتا ——

دوسرا آدمی ۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو دوست کی بیوی کو زبردستی اپنے بستر کی زینت نہ بناتا ۔ اس کا احترام کرتا ۔ اسے اپنی ماں جائی بہن کی طرح رکھتا ، اور دوست کے بیٹے کی پرورش اپنی بچی اولاد کی طرح کرتا —— ۔

پہلا آدمی ۔ اب تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ خود اپنی مرضی سے ، میرے ضمیر کے خلاف —— میں آدمی ہوں گوشت پوست کا آدمی ہوں ۔ موم کا کھلونا نہیں ۔ وہ یہاں ہوتی تو ——

دوسرا آدمی ۔ وہ یہیں ہے پردے کے پیچھے اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑی وہ ہماری اس عجیب و غریب ملاقات کا نظارہ دیکھ رہی ہے اور وقت کی وہ آواز بھی سن رہی ہے جسے تم نے مجھے جیل بھجوا کر اپنی دانست میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دبا دیا تھا

(بلند آواز) نجمہ ۔ رشید ۔ اندر آجاؤ بھائی ——

نجمہ اور رشید پردہ ہٹا کر اندر آجاتے ہیں ۔

پہلا آدمی ۔ (تقریباً چلا کر) یہ سازش ہے ، دھوکہ ہے ، فریب ہے ۔ مگر میں دیکھ لوں گا ۔

(پردے کے پیچھے سے ایک بارعب آواز)

اب آپ کیا دیکھیں گے حاجی صاحب ۔ آپ کا وقت ختم ہوگیا ، اور ہاں اب اس کھلونے کو بھی پھینک دیجئے ۔ اس کی گولیاں (پردے کے پیچھے سے ایک باوردی ہاتھ ابھرتا ہے) یہ ہیں ۔

پہلا آدمی ۔ یہ سازش ہے ۔ یہ سازش ہے ۔

پردہ ہٹتا ہے ۔ پولیس آفیسر ، سپاہی اور پہلے آدمی کے چند ملازمین کمرے میں

داخل ہوتے ہیں۔

پولیس آفیسر (ایک آدمی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے) تم حاجی صاحب قبلہ کے سکریٹری ہونا۔ تم نے قانون کا ساتھ دیا ہے، ہم سب تمہارے ممنون ہیں۔

پہلا آدمی۔ یہ سازش ہے، یہ سازش ہے، یہ سازش ہے (چلاتے چلاتے باہر کی طرف بھاگتا ہے)

پولیس آفیسر (مسکراتے ہوئے) باہر بھی آپ کے سواگت کے لیے ایک دنیا منتظر ہے۔ آپ کے کارندے کارخانوں کے مزدور، کالے کارناموں میں آپ کے زرخرید غلام۔ سب کے سب بڑے انہماک سے اس ٹی وی سرکٹ پر آپ کی شرمناک کہانی دیکھ رہے ہیں۔

سامنے کی طرف دیکھ کر ——— ایک جرم کے نشانات باقی۔ گرگ آدمی منظر نامہ معدوم ہو جاتا ہے ———

نجمہ اور رشید دوسرے آدمی کے قریب آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ انھیں وفور محبت سے اپنی چھاتی سے چمٹا لیتا ہے۔

——— دھند۔ ———

وقت کی وہی پرانی شبیہہ۔

میں وقت ہوں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔ سب دیکھتا ہوں۔

آدمی میں تیرا اساطیر نگار، تیرا مورخ، تیرا کہانی کار، تیرا فلسفی، تیرا شاعر ———

میں تیرا ———

——— دھند ———

پھر وہی منظر۔

کلاک کی ٹک ٹک۔ ٹک ٹک۔ ٹک ٹک

دل کی دھڑکن۔ دھک دھک، دھک دھک، دھک دھک

دونوں آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ

دور سے الو کے بولنے کی آواز

(کرسی میں دھنسے اسی پریشان حال پہلے آدمی کا خوف سے ہراساں چہرہ)

وہی آدمی۔ کیسی بھیانک، کیسی خوفناک رات ہے۔ کیسا ڈراؤنا خواب تھا۔ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کا دروازہ کھولتا ہے۔ باہر خاموشی اور سکون ہے یا پھر ہر منٹ دو منٹ بعد آنے والی چوکیدار کی مانوس آواز۔

جاگتے رہو ـــــ جاگتے رہو ـــــ جاگتے رہو ـ ـــــ

آدمی ـ سالا حرامی ـ کیا مزے سے جاگتے رہو کی رٹ لگائے جا رہا ہے ـ سارا دن تان کر سوتا ہے ، رات کو جاگتا ہے تو دوسروں کو بھی جاگتے رہنے کا مشورہ دیتا ہے ـــــ جاگتے رہو ـــ تیری ایسی کی تیسی ـــــ مگر مجھ سے بہتر ہے اس کی زندگی ـــــ

میں نہ دن کو سوتا ہوں ، نہ رات کو ، میں نے نیند کے عوض ہی تو شیطان سے یہ سب (محل کی قیمتی اشیاء ، تجوری میں پڑی بے پناہ دولت اور قیمتی زیورات کا کلوزاپ) لیا ہے ـ نیند نہیں آتی نہ آئے ـــــ

بلراج ورما

رانی ۔ ہیلو راجو

راجو ۔ او ۔ ہیلو

رانی ۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں ۔

راجو ۔ تم ــــ تم ــــ رانی ــــ تم رانی ــــ رانو ہی ہو نہ ؟

رانی ۔ مجھے ۔ یوں ۔ اس طرح زندہ دیکھ کر تمہیں حیرت ہو رہی ہے نا !

راجو ۔ حیرت تو ظاہر ہے کہ ہو ہی رہی ہے مگر زندہ دیکھ کر نہیں ۔ حیرت ہو رہی ہے تمہارے اس بھرے بھرے گدرائے بدن کو دیکھ کر ۔ اس نئے انوکھے رنگ روپ کو دیکھ کر ۔ اس قیمتی لباس اور اسے پہننے کے اس غیر معمولی سلیقہ کو دیکھ کر ــــ کہاں وہ غریب رانو ــــ

رانی ۔ اور کہاں یہ رانی ۔ تم اپنی رانو کو زندہ دفن کر کے بھاگ گئے تھے مگر رانی کو نہیں ۔ رانی ابھی زندہ ہے ــــ

راجو ۔ مجھے واقعی تعجب ہو رہا ہے ــــ یہ انقلاب ہے ـ ـ

رانی ۔ جسے تم زندہ باد نہ کہو گے ۔

راجو ۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ــــ پانچ سال کا وقفہ ــــ پانچ سال میں اس قسم کی تبدیلی انقلابی ضرور

ہے مگر اتنے لمبے عرصے میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے ـــــ

رانی۔ جو ہو گیا ہے ـــــ

راجو۔ پھر بھی۔ یہ زیورات۔ یہ قیمتی پارجات۔ اٹھنے بیٹھنے کے یہ تیور اور بات کرنے کا یہ عالمانہ انداز ـــــ

رانی۔ مگر سیٹھ مایاداس کی چہیتی بیوی کے لیے یہ ٹھاٹھ باٹھ کوئی ایسا زیادہ تو نہیں ـــــ

راجو۔ تو تم نے ـــــ

رانی۔ تمیز سے بات کرو نوجوان یہ تو اور تم کسی اور کے لیے رکھ چھوڑو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔

راجو۔ تو اب مجھے اپنے ہی گھر کی ایک حقیر ملازمہ کی حرامی بیٹی سے آداب سیکھنے ہوں گے ـــــ

رانی۔ (طنزاً) تمہارا گھر یہ تمہارا نہیں، میرا گھر ہے میری ماں جس نے دنیا دیکھی تھی مرتے مرتے مجھے اپنی جگہ سنبھال گئی تھی اور وہ سارے گُر بھی ذہن نشین کرا گئی تھی جو مایاداس جیسے ہوس کے کیڑے کو آسانی سے منہ مانگے داموں بیچ جا سکتے ہیں ـــــ

راجو۔ تو تم نے میرے باپ کو ـــــ بیٹے کے بعد باپ کو ـــــ

رانی۔ تم نے مجھے جو سکھایا تھا میرے کام آیا اور جو ماں نے سکھایا تھا وہ بھی تم نے مجھے ورغلایا تھا میں نے تمہارے باپ کو پھانس لیا۔ اب میں تمہاری ماں بھی ہوں اور تمہارے بیٹے کی بھی جسے تمہارا باپ اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری دو بہنیں بھی ہیں۔ بدلے رشتوں کی یہ تصویر تمہارے کند ذہن میں بیٹھی ہے کہ اور تفصیل سے سمجھاؤں ـــــ

راجو۔ میری ماں ـــــ میری اپنی ماں کہاں ہے ـــــ

رانی۔ وہاں اوپر ـــــ اپنے بنانے والے کے پاس ـــــ تمہارے امریکہ چلے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد ـــــ جب اسے میرے اور تمہارے باپ کے نئے تعلقات کے بارے میں پتہ چلا تو بیچاری بڑھیا برداشت نہ کر پائی ـــــ

راجو۔ میری ماں نے خودکشی کر لی تھی۔

رانی۔ وہ خودکشی کر لیتی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر پاتی۔ ایک رات اس نے مجھے اپنے شوہر کے بستر میں دیکھا اسی وقت اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ بڑی خوددار عورت تھی تمہاری ماں، مگر اس نے تم جیسے ذلیل پلّے کو جنم دیا۔ کیسے کیسے حادثات سے

بنتی ہے زندگی کی داستان ـــــ تمہاری ماں کے مرنے کے بعد ایک ہی مہینے کے اندر اندر ہم نے شادی کر لی۔ پورے ریتی رواج سے ـــــ ساری دنیا کے سامنے ـــــ تمہارا سماج ـــــ تمہاری ساری برادری میرا احترام کرتی ہے۔ تمہارے کارخانوں کے ورکر مجھے رانی ماں کہہ کر بلاتے ہیں ـــــ

راجو۔ تم ـــــ تم ـــــ

رانی۔ پھر وہی تم۔ پورے آٹھ سال امریکہ میں رہ کر بھی تم نے بات کرنے کا سلیقہ نہیں سیکھا۔ تم نے اور بھی کچھ سیکھا ہے کہ نہیں میں نہیں جانتی مگر اس طویل عرصہ میں میں نے تمہارے جیسے درجنوں فارن ریٹرن ملازم رکھ کر جتنا سیکھا اور جان لیا ہے اتنا تم بھی غالباً نہیں جانتے ـــــ میری ماں بدقماش تھی، مگر تھی خاصی سمجھدار اس نے رو دھو کر کسی طرح مجھے بارہ جماعتیں پڑھا دی تھیں جو میرے جیسی ذہین لڑکی کے لئے کافی تھیں۔ تمہارا باپ تو چھٹی تک بھی نہیں پڑھا ـــــ

راجو۔ جوان بدن کی گندھ میں جو جادو، جو طلسم ہوتا ہے میں اس سے واقف ہوں ـــــ

رانی۔ بدن جوان ہو۔ تندرست اور توانا ہو، خوبصورت بھی ہو تو یہ جادو بلند آواز گونجتا ہے ایک خبیث بڈھے پر کیسے اثر انداز نہ ہوتا ـــــ

راجو۔ میرا باپ وہ کیمیا گر جو مٹی سے سونا بنانے کے سارے فارمولے جانتا تھا۔

رانی۔ اب ساتھ والے کمرے میں مٹی کا مادھو بنا بیٹھا ہے۔ مغلئی کھانوں اور قیمتی شراب کے علاوہ بھی اب وہ کسی شئے کو جانتا پہچانتا ہے تو وہ میرا بدن ہے۔ میں نے اس کی حکومت سنبھال لی ہے۔ اور اسے ہر قسم کے تفکرات سے آزاد کرا دیا ہے۔ چھینا جھپٹی سے نہیں، اسی کے اصرار پر میں نے اسے جہانگیر بنا کر تخت طاؤس پر بٹھا دیا ہے، اور خود نور جہاں بن کر اس کی انڈسٹریل ایمپائر کو چلانے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ اب تمہارا آبائی کاروبار وہ نہیں میں چلاتی ہوں۔ لاکھوں کا کاروبار اب کروڑوں کا ہو چلا ہے اور بدستور پھیلتا جا رہا ہے۔

راجو۔ تم بھولتی ہو رانی۔ میرا باپ مجھے کبھی نہیں بھولا۔ جس دریا دلی سے اس نے مجھے امریکہ میں سپورٹ کیا ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتی ہو۔

رانی۔ (قہقہہ لگا کر) تمہیں روپے باقاعدگی سے پہنچتے رہے مگر تمہارے باپ نے کبھی ایک

خط بھی لکھا تمہیں ؟ تم احمق ہو۔ تم وہاں مزے سے رہو اسی لیے میں تمہیں تمہاری مناسب ضروریات سے تگنے چوگنے روپے بھجواتی رہی۔ تمہیں تو تمہاری ماں کے مرنے کی خبر بھی نہ دی گئی تھی مبادا تم سب چھوڑ چھاڑ کر لوٹ آؤ اور کباب میں ہڈی بن جاؤ۔

راجو۔ حرام زادی۔

رانی۔ (قہقہہ لگا کر) تم نے اپنے طور پر مجھے گالی دی ہے، مگر یہ گالی نہیں یہ حقیقت ہے کہ میں حرام کی اولاد ہوں۔ مجھے میری ماں نے میرے باپ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ شاید وہ خود بھی نہ جانتی ہو کہ میرا باپ کون تھا۔ مگر میرا حرامی ہونا میری کمزوری نہیں میری اصلی طاقت ہے۔ میرے کردار میں وہ حیا نہیں رہی جو شریف زادیوں کا زیور ہوا کرتی ہے۔ حرامیوں کا کوئی سماج نہیں ہوتا۔ کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ کسی قسم کی مان مریادہ نہیں ہوتی۔ شاید بھگوان بھی نہیں ہوتا۔ میری اپنی نظر میں میرا اپنا کوئی ہے تو وہ میری خبیث روح ہے جو بدشکل اور بدکردار ہوتے ہوئے بھی تندرست اور توانا ہے اور میری محافظ بھی ____

(موسیقی کی دھن۔ تلخی کو نرمی میں بدلنے کے لیے)

راجو۔ تم کتنی بدل گئی ہو۔ تمہارے اس کایا کلپ کا ذمہ دار میں ہوں۔ کبھی تم کتنی سیدھی سادھی، بھولی بھالی تھیں۔

رانی۔ ایک عمر تک ہر انسان سیدھا سادھا اور بھولا بھالا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے تعلقات کے اولین دور میں تم نے میری جانب جب قدم بڑھایا تھا تو اس میں خلوص کی کمی نہ تھی وہ ایک سچے عاشق معشوق کا رشتہ تھا اور میں تمہاری داشتہ نہ تھی تمہاری رانو تھی تمہاری اپنی رانو اس کا ثبوت ہمارا بیٹا ہے، جو جھوٹی واسنا کی نہیں، سچے پیار کی اولاد ہے۔ وہ شکل وصورت سے ہی نہیں سیرت سے بھی فرشتوں کی اولاد لگتا ہے۔

راجو۔ کیا نام رکھا ہے۔

رانی۔ نام تو تم نے ہی تجویز کیا تھا۔

راجو۔ ارے ہاں یاد آیا۔ میں نے تمہارے پیٹ کو سہلاتے ہوئے کہا تھا۔ تو غم نہ کھا رانو۔

میرا پیار سچا ہے۔ میں تجھے دھوکا نہ دوں گا۔ تیرے پیٹ میں جو پل رہا ہے وہ نگر سیٹھ مایا داس کا پوتا اور ران کے اکلوتے وارث راجندر کمار راٹھی کا فرزند ہے وہ کوئی معمولی شے نہیں۔

رانی۔ (ہنس کر) اور میں نے کہا تھا اگر فرزندی ہوئی تو؟

راجو۔ مجھے سب یاد آرہا ہے۔ میں نے کہا تھا تیرا مطلب لڑکی ہے نہ۔ تو بھی غم نہیں۔ لڑکی تو گھر کی لاج ہوتی ہے۔ اور تبھی میں نے دو نام تجویز کیے تھے۔ لڑکا ہوا تو وِشال اور لڑکی ہوئی تو وِشالی۔

رانی۔ تمہیں یاد ہے وہ رات۔ برسات کی وہ کالی ڈراونی رات۔ کیسی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ کیسے گھنے بادل چھائے تھے آسمان پر۔ اور کتنی خوفناک تھی بجلی کی وہ کڑک جس سے ڈر کر میں چھپکلی کی مانند تمہارے چوڑے اور مضبوط سینے سے چمٹ گئی تھی۔

راجو۔ اور میں نے تمہیں اپنے ساتھ اور بھی زور سے چمٹاتے ہوئے کہا تھا۔ ڈر نہیں رانو۔ یہ بادل جلد ہی چھٹ جائیں گے اور چاند کی مہربان کرنیں بادل کی اس اندھی اندھیری کالیما کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گی۔ اور رات پھر سے منور ہو جائے گی۔

رانی۔ میں جانتی کہ تم جھوٹ بول رہے تھے اور اماوس کی راتوں میں چاند نہیں نکلتا۔ مگر میں اپنی الھڑ مستی میں وہیں چمٹی بیٹھی تمہارے جوان بدن کا رس چوستی رہی تھی۔ پانی برستا رہا تھا اور ہم تم بھی برستے رہے تھے۔

راجو۔ اس رات میں خود تمہیں تمہاری ماں کے کمرے میں لوٹانے گیا تھا۔ تاکہ بڑھیا ہمارے تعلقات سے واقف ہو جائے۔ ہم دونوں بھیگے ہوئے تھے۔ اندر باہر سے پورے طور پر شرابور۔

رانی۔ اس روز ماں اپنے کمرے میں نہ تھی۔ ایسی راتوں کو اسے مالک کی خدمت کے لیے اکثر رک جانا پڑتا تھا۔ بے چاری ماں۔

راجو۔ میرا باپ لوہے کا سونا بنانے والا کیمیاگر۔ مٹی سے ہیرے جواہرات اور موتی اگانے والا جادوگر۔ ایک نظر دیکھ کر ہی سارے منظر کو بھانپ جانے والا جادوگر۔ وہ اپنے بیٹے کو جانتا تھا۔ اپنے خون کا رنگ پہچانتا تھا۔ تیری ماں کو تو جانتا ہی تھا۔

رانی۔ میری ماں اس کے لئے وہی تھی جو تمہارے لیے میں تھی۔

راجو۔ یہ گالی ہے رانو اور تم جانتی ہو کہ یہ جھوٹ ہے۔ تمہاری ماں میرے باپ کی داشتہ تھی جب کہ تم میری محبوبہ تھیں اور میں نے تمہیں اپنی پتنی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رانی۔ جو ظاہر ہے کہ انہیں منظور نہ تھا۔

راجو۔ میرے والد بڑے سمجھدار اور سلجھے ہوئے ذہن کے مالک تھے وہ بھانپ گئے تھے کہ تم سے میرا لگاؤ ایسا نہیں، جسے ڈرا دھمکا کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے مجھے چپکے سے پیر سے سرکا دیا۔ کوئی گلہ شکوہ کیا نہ کوئی ایسی بات ہی کہی کہ جس سے مجھے شک ہوتا کہ میں کسی خاص مقصد سے باہر بھیجا جا رہا ہوں۔ مجھ سے جو کہا گیا ہر اعتبار سے معقول تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ چونکہ میں نے یہاں کی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ مجھے اب امریکہ جانا ہوگا کیونکہ ان کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کاروبار کو اب پرانے حربوں سے سنبھالا نہیں جا سکتا۔ اتنی بڑی انڈسٹریل ایمپائر کو سنبھالنے اور مزید سجانے سنوارنے اور آگے بڑھانے کے لیے اب نئی جانکاری اور نئے تیکنیکوں کی ضرورت ہے اور یہ نئی ٹیکنالوجی صرف امریکی ادارے ہی سکھا سکتے ہیں۔

رانی۔ باپ کے مشورے میں تم نے نجات دیکھ لی اور چپ چاپ امریکہ چلے گئے۔

راجو۔ تم پھر جھوٹا الزام لگا رہی ہو۔ میں چپ چاپ چوری چھپے بھاگ جاتا تو تم اس قسم کا الزام لگانے میں حق بجانب ہوتیں۔ مگر میں نے تو ساری سکیم تمہارے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔ مجھے سب یاد ہے۔ حیرت ہے کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں امریکہ منگوالوں گا تاکہ ہمارا پہلا بچہ امریکہ کی سرزمین پر پیدا ہو۔ کیونکہ امریکہ ہی دنیا کی ایک ایسی واحد جمہوریت ہے جس کی آزاد فضا میں ہر ماں یہ خواب پالنے کا حق اور دم رکھتی ہے کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر ملک کا پہلا شہری بنے گا۔

رانی۔ جانے سے پہلے تم نے مجھ سے گندھرو واہ کیا تھا۔ ہندو شاستروں میں ایسے دواہ کی مناہی نہیں۔ اور ہم نے پورے سات دن کھنڈالہ کے سرکٹ ہاؤس میں ہنی مون منایا تھا۔

راجو۔ سات نہیں پورے نو دن۔ تمہاری یادوں میں زنگ لگ گیا ہے۔ مگر مجھے سب یاد ہے۔ امریکہ پہنچتے ہی مجھے اطلاع ملی کہ تم اور تمہاری ماں نے خودکشی کر لی ہے۔ میرے پاس وہ تار آج بھی محفوظ ہے۔ ہندوستان میں تمہارے علاوہ کچھ نہ تھا جو مجھے تعلیم

ادھوری چھوڑ کر رٹ آنے کے لیے مجبور کرتا۔ میں کئی ہفتوں تک پاگلوں کی طرح سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا پھر آہستہ آہستہ یہ دیوانگی کم ہونے لگی۔ کوئی بھی جذبہ ایک جیسی شدت سے ہمیشہ بنا نہیں رہتا۔ پھر امریکہ تو لاکھوں نئی انوکھی دلچسپیوں کا گھر ہے۔

رانی۔ تم نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ مبادا تمہارے ہاتھ کی تحریر کوئی نیا فساد کھڑا نہ کر دے۔

راجو۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ ملتا بھی کیسے تم تو مر چکی تھیں۔

رانی۔ تم ٹھیک کہتے ہو میں واقعی مر چکی تھی۔ ایک پکے ہوئے پھل کی طرح میں تمہارے پیڑ سے گری اور تمہارے باپ کے دامن نے مجھے مٹی ہونے سے بچا لیا۔ میں ماں بننے والی تھی اور میرے بچے کو باپ کا نام درکار تھا۔ جو اسے آسانی سے مل گیا۔

راجو۔ تمہیں جو تکلیف اور پریشانی آج ہو رہی ہے میں اسے سمجھ سکتا ہوں۔

رانی۔ مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولے گا جب تم نے اپنے گھر کی پرانی نوکرانی کی کمسن اور معصوم بچی کو اپنی وشال باہوں میں بھر کر کچھ ایسے چمٹا لیا تھا اپنے چوڑے چکلے سینے سے کہ بیچاری کنواری کے پاؤں تک سلگنے لگے تھے اور بدن کے بھیدوں سے ناواقف اس کا ناتجربہ کار دل تمہارے پہلے ہی بوسے سے ہزار ہزار بار دھڑک گیا تھا اور ایک عجیب انوکھی انجانی مستی بھری ترنگ میں بے سدھ ہو کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں تا کہ اس کے بھیتر کی کنواری وہ سب نہ دیکھے جو اس کے بعد ہونا تھا ——— اور ہوا تھا۔

راجو۔ کیا عجیب جادو تھا وہ۔

رانی۔ تم نے میری خالی جھولی بھر دی تھی۔ ایک مفلس کنواری کی لاج تم نے اپنے پیار سے ڈھک دی تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو ایسے محفوظ سمجھنے لگی تھی جیسے تم نے اسے کیچڑ سے اٹھا کر پھولوں بھری سیج پر لٹا دیا ہو جیسے وہ تمہاری نگر سیٹھ مایا داس کے اکلوتے بیٹے کی بیاہتا ہو۔

راجو۔ تم کیوں بار بار وہ مناظر یاد کرتی ہو۔ میں نے اس کے بعد بھی کتنی ہی بار تمہیں اپنی گود میں بٹھا کر تمہارے بدن کو سہلایا تھا۔ اس سے جتنا سکھ مجھے ملتا تھا اُتنا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تمہیں ملتا تھا۔ مرد اور خاص طور پر پیار کرنے والے مرد کی گود میں جو نرمل آنند عورت کو ملتا ہے وہ اسے دوسری کسی جگہ نہیں ملتا۔

رانی۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم ایک بھرپور مرد تھے۔ تمہارے بعد میں نے ایک دوسرے مرد کو بھی دیکھا ہے جو تمہارے مقابلے میں شاید آدھا مرد بھی نہیں۔ مگر اس نے مجھے پیار کے سکھ سے بھی بڑا تحفہ بخشا ہے۔ عزت، نام اور مان مریادہ کا تحفہ۔ اس نے مجھے میرا گھر دیا ہے۔ عورت کے نزدیک اس کے گھر کی کیا قیمت ہوتی ہے، یہ مرد نہیں سمجھ سکتے۔

راجو۔ تمہاری ماں کو جب ہمارے تعلق کی آگاہی ہوئی تو یاد ہے وہ کیسے چیخی چلائی تھی۔ وہ مکار بڑھیا۔

رانی۔ خوب یاد ہے۔ اس نے حقارت سے میرے منہ پر تھوک دیا تھا اور چیخ چیخ کر کہا تھا تو سالی حرام کی اولاد ہے تو نے یہ سب کسی نہ کسی کے ساتھ کرنا ہی تھا۔ اب تو بھی اپنے جیسا ایک حرامی پلا جن اور میری طرح کسی اوباش سیٹھ کی داشتہ بن جا۔ یا باہر جا کر جسم کا بیوپار کر۔ بہت مل جائیں گے تجھے راجو جیسے۔ ہر مرد چمار ہوتا ہے۔ چمڑے کا بیوپاری تو بھوکی نہ رہے گی۔ دو وقت پیٹ بھر کھانا اور راتوں کو کسی نہ کسی خبیث کے ساتھ سو کر اس کے اور اپنے بدن کی دوسری مانگیں پوری کرنا۔

راجو۔ یہ بددعا تھی، جو پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ بددعا دینے والی کوئی اچھی عورت نہ تھی۔

رانی۔ وہ اچھی تھی یا بری مگر میری جننی تھی۔ جب اس نے میرے مقدر، میرے مستقبل کا اتنا بھیانک تصور، میرے سامنے رکھا تھا۔ تو میں نے بھی سوچا تھا کہ میری مقدس محبت اس اس طرح ذلیل کرنے والی میری ماں نہیں ہو سکتی۔ مگر جب میں نے صورت حال پر دوبارہ سوچا تو مجھے اس کے بے بس غصے کی حقیقت سمجھ میں آ گئی۔ کبھی اس نے بھی کسی سے پیار کیا ہو گا اور دیکھ لیا ہو گا اس پیار کا نتیجہ۔

راجو۔ تو اپنی ماں سے اس طرح اس قدر کوسے جانے کے باوجود مجھ سے ملتی رہی تھی۔

رانی عورت بدن کے بھیدوں سے ایک بار آشنا ہو جائے تو مجبور ہو جاتی ہے۔ مگر میں جسے پیار سمجھتی تھی وہ پوجا کے لباس میں ملبوس میری واسنا تھی۔

راجو۔ واسنا کا بھی اپنا ایک دھرم ہوتا ہے۔ واسنا تخلیق کی ماں ہے۔ واسنا جب اپنے لیے کچھ سمائیں کچھ حد بندیاں مقرر کر لیتی ہے کسی ایک کو چاہت کا مرکز بنا لیتی ہے تو خالق کا نر اور مادہ بنانے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

رانی۔ ان دنوں میں گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھی اپنی تقدیر کی لہریں گنا کرتی تھی۔ سمندری

طوفانوں کو میں قدرت کے بے رحم عناصر کی فطری غضبناکی سے تعبیر کیا کرتی تھی۔ اور اکثر ڈر جایا کرتی تھی۔ کبھی میں اکیلی ہوئی اور کبھی تم کبھی میرے ساتھ ہوتے۔ تم مجھے تسلیاں دیتے۔ طرح طرح کے وعدے کرتے۔ مگر میرا خون بنا رہتا کیونکہ ماں نے میرے ذہن میں بیٹھا دیا تھا کہ میں منحوس ہوں اور میرے بدن پر جو خبیث روح قابض ہے اسے ڈر ہے کہ اگر اس نے میرے جسم کو تیاگ دیا تو بھگوان اسے دوسری کوئی پناہ گاہ نہیں دیں گے۔ یعنی کہ میں مرنا بھی چاہوں گی تو مر نہ سکوں گی۔ اب تو خیر میں نے جینا سیکھ لیا ہے، مگر ان دنوں۔

راجو۔ میں نے خود گھوڑے کی سواری کبھی نہیں کی ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا نہ مگر گھوڑوں کی روڑیں دیکھ کر میں بے حد مسرور ہوتا تھا۔ دوڑ زندگی کی علامت ہے۔ جوش کی علامت ہے۔ ایک ولولہ ہے۔ ایک پریرنا ہے۔

رانی۔ اب جب کہ میں وہ نہیں رہی جو کبھی تھی تو اب مجھے سمندر سے ڈر نہیں لگتا۔ اسی لیے میں نے تمہاری پرانی حویلی کو مسمار کر اکر اس پر یہ فلک شگاف عمارت تعمیر کرائی ہے اور ہر منزل پر ایک ایسی بالکنی بنوائی ہے۔ جس سے سمندر کی بے چین لہروں کے تڑپنے کا نظارہ کر سکوں۔ سمندر اب مجھے خوف نہیں حوصلہ بندھاتا ہے۔ ایک عجیب قسم کا سکون دیتا ہے۔ تم گھوڑوں کی دوڑیں دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ کچھ ویسی ہی راحت مجھے لہر در لہر دوڑتی ان آوارہ موجوں کے نظاروں سے ملتی ہے۔ تم نے گھوڑوں کی دوڑوں پر ہزاروں لگائے مگر کبھی کسی گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے جبکہ میرے من نے اکثر چاہا کہ میں کسی بڑی ویل کے پیٹھ پر سوار ہو کر دور سمندر کی تہہ تک چلی جاؤں اور وہ سارے بھید جان لوں جو اس کے وشال سینے میں رگوں سے غرق ہیں۔

راجو۔ تم اپنا توازن کھو بیٹھی ہو۔ تم اپنے آپ کو جتنی تندرست اور توانا سمجھتی ہو اتنی ہی بیمار ہو — اور — تم کوئی ایسی زیادہ سندر بھی نہیں ہو۔ امریکہ میں ہر تیسری عورت تم سے زیادہ خوبصورت اور طاقتور ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ اسے کہاں، کہاں تک اور کس رفتار سے جانا ہے۔ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ اور جس زندگی کا مقصد نہ ہو وہ بیکار ہوتی ہے۔

رانی۔ تم میرے کرب کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ درد یہ تڑپ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس

دردوکرب کا منبع مجھے مل جاتا تو اسے اپنے اندر پل رہے ہزار سانپوں سے ڈسوا کر ڈھیر کر دیتی۔ مگر تم لوگ بڑے سیانے ہو۔ تم درد دیتے ہو، مگر درد کی شکل سے اس کے خدوخال سے اپنے مظلوموں کو کبھی آگاہ نہیں کرتے۔ مبادا اسے پہچان کر اپنی حفاظت کا انتظام کریں۔ یا تمہارا تحفہ قبول کرنے سے ہی انکار کر دیں۔

راجو۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم بیمار ہو اور یہ کوئی معمولی بیماری نہیں۔ یہ بلڈ کینسر سے بھی خطرناک بیماری ہے۔ باہر سے تندرست اور توانا دکھائی دینے والی تم اندر سے ایکدم خالی اور کھوکھلی ہو۔ اور تمہارے اِس نئے اقتدار میں کوئی بھی محفوظ نہیں۔ نہ میں نہ میرا باپ اور نہ ہمارا وشال اور نا تمہاری دونوں بیٹیاں ـــــ تم نے ان کے نام ـــــ

رانی۔ بڑی کا نام ویشالی ہے اور چھوٹی کا نام ابھی طے نہیں کیا۔ پہلے دو تم نے تجویز کئے تھے۔ یہ بھی تم ہی سجھا دونا۔

راجو۔ یہ ادھیکار تم مجھے دے سکتی ہو۔

رانی۔ میں نے تم سے تمہارا کوئی ادھیکار نہیں چھینا ـــــ نہ ہی چھیننا چاہتی ہوں۔ مگر اپنے ادھیکاروں سے سبکدوش ہونے کا بھی میرا کوئی ارادہ نہیں۔

راجو۔ تم نے بیٹے سے اس کا باپ چھین لیا ہے۔

رانی۔ تمہارا باپ تمہیں ایک ہی شرط پر مل سکتا ہے۔

راجو۔ تمہاری کوئی شرط بھی ہے۔

رانی۔ تم اپنے باپ کی بیوی کو اپنی ماں کا رتبہ دو اور اپنے بیٹے کو اپنے چھوٹے بھائی کا۔

راجو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

رانی۔ تو پھر تمہیں کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ کیونکہ یہ گھر۔ تمہارے باپ کی ساری جائیداد۔ ساری ملیں۔ بینکوں میں پڑا سارا روپیہ میرے نام ہے۔

راجو۔ حیرت یہ سب کچھ حاصل کر کے بھی تم نے اس بڈھے کو ابھی تک زہر نہیں دیا۔

رانی۔ جسے تم بڈھا کہتے ہو۔ وہ تم جیسے سو جوانوں کا جوان ہے۔ وہ میرا اپنا پرمیشور ہے۔ میری طاقت ہے۔

راجو۔ تمہاری زبان سے نکلے یہ الفاظ بے معنی ہیں۔

رانی۔ تم میں اتنی عقل نہیں ہے کہ تم عورت اور مرد۔ یعنی پتی اور پتنی کا رشتہ سمجھ سکو۔ کسی اچھے آدمی کی پتنی کہلانا جس عورت کا سب سے بڑا آدرش رہا ہو وہی بتا سکتی ہے اس رشتے کے مفہوم۔ ایک بے گھر فرد ہی گھر کے معنی سمجھتا ہے۔

راجو۔ تم عورت نہیں ہو کوئی چڑیل ہو۔ کوئی جادوگرنی ہو۔ آفت کی پرکالہ۔ تم ٹھیک کہتی تھیں۔ تم واقعی کوئی خبیث روح ہو۔

رانی۔ تم پھر اپنے رنگ میں اپنے اصلی روپ میں لوٹ رہے ہو۔ میرے زخم بھرنے لگے تھے کہ تم نے پھر انہیں کرید کر تازہ کر دیا۔ تمہارا دیا ہوا درد سانپ کے زہر کی طرح میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اور میں اب ایک ایسی وش کنیا ہوں جس کی ہر سانس اب وہی زہر اگلنے لگی ہے۔ جو اسے تم سے ملا تھا۔ ہاں راجو میں اب واقعی ایک وش کنیا ہوں۔ ایک نشہ۔ ایک جادو...... موت کا تانڈو۔

راجو۔ میں تمہاری حقیقت سمجھ گیا ہوں۔

رانی۔ اس پرانی حقیقت سے اس نئی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ کیا کچھ نہیں سہنا پڑا۔ کن کن پر پیچ مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ زندگی کی ان اوبڑ کھابڑ راہوں میں کتنی بار لڑکھڑائی ہوں۔ کتنی بار زخمی ہوئی ہوں کتنی بار کیسے کیسے روئی چلائی ہوں۔ یہ سب کسی نے نہیں دیکھا سوائے میری اس خبیث روح کے جس نے گہری سے گہری تاریکی میں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میری الجھی راہوں کی یہی اب میری اصلی ماں، میری رہبر اور رہنما ہے۔ نہیں نہیں راجو تم آگے نہ بڑھو۔ اس گھر میں اب تمہیں کوئی نہیں جانتا۔ تمہارے پرانے ملازم میں نے ایک ایک کر کے سارے نکال دیئے ہیں۔ اس گھر کا ہر فرد میرا کتا ہے۔ جو تمہیں میرے ایک اشارے پر ہی چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔

راجو۔ میں انسان کی اولاد ہوں۔ کتوں سے نہیں ڈرتا۔

رانی۔ (تالی بجاتی ہے)

ملازم نمبر ۱۔ آپ نے بلایا مالکن؟

ملازم نمبر ۲۔ آپ نے یاد فرمایا رانی صاحبہ۔

رانی۔ اس اجنبی نوجوان کے لیے شربت کا گلاس لے آؤ۔ گرمی نے بیچارے کا سر جکڑا

دیا ہے۔

ملازم نمبر۱۔ یہیں حاضر کروں یا ان کو مہمان خانے میں لے جاؤں۔

راجو۔ تمہاری یہ مجال۔

ملازم نمبر۲۔ یہ گستاخ ہے رانی صاحبہ، حکم ہو تو ذرا ٹھنڈا کر دوں۔

ملازم نمبر۱۔ اس کی گرمی روح افزا سے نہیں سمندر میں دو چار غوطوں سے اپنے آپ چلی جائے گی۔

راجو۔ ہم اس گھر کے مالک ہیں۔ سیٹھ مایا داس کے اکلوتے بیٹے۔ ہم اس مایا نگری کے راجکمار ہیں۔ ولی عہد۔

ملازم نمبر۲۔ یہ واقعی بوکھلا گیا ہے رانی ماں۔ چھوٹی سرکار کے ہوتے ہوئے یہ اپنے آپ کو بڑی سرکار کا بیٹا بتاتا ہے۔ وہ بھی اکلوتا۔

رانی۔ کون جانے بیچارہ ٹھیک ہی کہتا ہو۔ تمہاری بڑی سرکار کے اس عمر میں یہ تیور ہیں جوانی میں تو ظاہر ہے کہ اور بھی رنگین رہے ہوں گے۔ ابھی نہ جانے اس جیسے کتنے حرامی پلّے اس قسم کے دعوے دار ہوں گے۔ اس جہاں نگر میں۔

ملازم نمبر۱۔ پھر تو ماں جی اس کا علاج سمندر کا کھارا پانی ہے، شربت نہیں۔

رانی۔ تم نے اسے اس کا مقام سمجھا دیا ہے۔ اب یہ کوئی گستاخی نہیں کرے گا۔ اب تم دونوں جا سکتے ہو۔ شربت کی بھی اب ضرورت نہیں ہے۔

راجو۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تم واقعی اس مایا نگری کی ملکہ ہو۔ ابھی ابھی یہ ملازم جس چھوٹی سرکار کا ذکر کر رہا تھا وہ اپنا وشال ہی ہے نہ۔

رانی۔ تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ تمہارا بیٹا جو اب تمہارا بھائی ہے۔ اور میں تمہارے بیٹے کی ہی نہیں، تمہاری بھی ماں ہوں۔ ہے نہ عجیب رشتہ۔

راجو۔ میں اس رشتے کو نہ مانوں تو۔

رانی۔ تو پھر میری اس سلطنت میں تمہیں مناسب مقام تو ایک طرف معمولی سی ملازمت بھی نہیں مل سکتی۔

دروازہ کھلنے کی آواز ــــــ مایا داس سیٹھ کا داخلہ

مایاداس۔ (نشے میں دھت آواز میں) تم کاروبار کے بکھیڑوں میں اتنی الجھی رہتی ہو کہ بیچارے مایا داس کے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہیں بچتا۔ آج تم کس نئے چکر میں (راجو کو دیکھ کر) یہ کون ہے۔

راجو۔ میں آپ کا بیٹا ہوں پتا جی۔ آپ کا راجو۔

مایاداس۔ یہ خوب رہا۔ ہمارا چار سال کا بیٹا ایکدم اتنا بڑا ہو گیا اور اس نے اپنا نام بھی بدل لیا ہے۔ یہ راجو کیا بلا ہے۔ وشال بُرا نام تو نہ تھا۔

راجو۔ (پاؤں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے) میں راجو ہوں۔ آپ کا راجندر راجندر کمار

مایاداس۔ ارے ہٹ پرے۔ پاؤں چھونے کی پرانی رسم ہماری بیگم صاحبہ کی مملکت میں اب رائج نہیں۔ کیوں بیگم ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔

راجو۔ آپ مجھے، اپنے بیٹے کو پہچان نہیں رہے۔

مایاداس۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ اور دو بیٹیاں۔

راجو۔ میں آپ کا بڑا بیٹا ہوں۔ آٹھ سال بعد امریکہ سے لوٹا ہوں

مایاداس۔ بڑے مورکھ ہو۔ امریکہ سے صرف بے وقوف واپس آتے ہیں۔

راجو۔ میں تعلیم ختم کر کے اپنے ملک، اپنے گھر اپنے باپ کے پاس آیا ہوں اور آپ یہ ناٹک کر رہے ہیں۔

مایاداس۔ یہ جو کر ہمیں کسی ناٹک کا پاتر سمجھتا ہے۔ بڑا گستاخ ہے۔

رانی۔ یہ راجندر ہے۔ آپ کا بڑا بیٹا۔ یاد کیجئے۔

مایاداس۔ ہمیں کچھ یاد نہیں اور ماضی میں لوٹ جانا اب ہمارے لئے ممکن نہیں۔ اگر تم اسے جانتی پہچانتی ہو تو کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ اب میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ (لوٹ جاتا ہے)

رانی۔ (راجو سے مخاطب ہو کر) تم نے دیکھا۔ آج تم اتنے ہی بے بس اور اپاہج ہو جتنی کبھی میں تھی۔

دروازہ پر دستک

وشال ویشالی اور چھوٹی نمی۔ ہم اندر آسکتے ہیں ممی جی۔

رانی۔ ضرور آسکتے ہو۔

تینوں بچوں کا ایک ساتھ داخلہ۔

وشال۔ ہمیں بابوجی نے بھیجا ہے۔

ویشالی۔ جوکر دیکھنے۔

وشال۔ آپ ہی وہ جوکر ہیں نہ انکل۔

ویشالی۔ آپ سرکس میں کام کرتے ہیں نا انکل جی۔

وشال۔ ہم نے آج تک کوئی سرکس نہیں دیکھا۔

رانی۔ ابھی کل ہی تو ٹی وی پر تم نے روسی سرکس دیکھا تھا۔

وسال۔ ہم زندہ سرکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں ویشالی۔ کیوں نمو۔ ویشالی اور نمو (ایک ساتھ) ہاں بھیّا ہم زندہ سرکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ (پھر راجو کی طرف مڑکر) آپ ہمیں اپنا سرکس دکھائیں گے نا۔

راجو۔ (حسرت سے وشال کی طرف دیکھتے ہوئے۔ حسرت بھرے لہجے میں) میں جوکر ہی ہوں بچو۔ تمہیں سرکس ضرور دکھاؤں گا۔

رانی۔ (بچوں سے مخاطب ہوتے ہوئے۔) اب تم لوگ جاؤ۔ تم لوگوں کی گورنیس اب آتی ہی ہوں گی۔ ناچتے گاتے، ہنستے، کھیلتے تینوں بچوں کا ایک ساتھ لوٹ جانا۔ (دروازہ بند کرنے سے پہلے وشال) بابوجی آپ کو بلا رہے ہیں ممی جی۔

راجو۔ (آہ بھر کر) کتنے پیارے بچے ہیں۔

رانی۔ سانچہ خوبصورت ہو تو بچے خوب صورت ہی پیدا ہوتے ہیں۔

راجو۔ تمہیں اپنی سندرتا پر بڑا ناز ہے۔

رانی۔ ناز کیوں نہ ہو۔ میں ہوں ہی سندر۔

راجو۔ اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا رانو۔

رانی۔ یہ فلمی مکالمہ ہے۔ تم دیوداس نہ کبھی تھے نہ بن سکتے ہو۔ میرا خداوند مجھے بلا رہا ہے۔ لہٰذا اب تم جاؤ۔ تم چاہو تو اس وسیع و عریض عمارت کے کسی حصہ کو اپنا مسکن بنا سکتے ہو۔ تمہارا یہ حق میں نہ لوں گی۔ تم واپس امریکہ لوٹ جانا چاہو تو

اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ تم اپنے ہوٹل سے ٹیلی فون کر دینا تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے۔ پہنچا دیئے جائیں گے۔

راجو۔ اچھا رانو۔ تم جو کر رہی ہو وہ ٹھیک ہی ہے۔ تم حقدار ہو۔ میں نے تم سے جو سلوک کیا تھا۔ اس کے رد عمل کے طور پر تمہارا یہ رویہ نامناسب نہیں۔ اور ہاں۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی ہے اور ہم دونوں تاج میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور جلد ہی ہندوستان کے چیدہ چیدہ مقامات دیکھ کر واپس لوٹ جائیں گے۔ ہمارے پاس ریٹرن ٹکٹ تو ہیں۔ مگر مقامی کرنسی کافی نہیں۔ ہو سکے تو دس بیس ہزار کی رقم تاج کے کمرہ ۲۷ میں پہنچا دینا۔

رانی۔ بیس ہزار آج کل کیا ہوتے ہیں۔ لاکھوں کی بات کرو راجو اور ہاں یہ چند زیور میری بہو کو اس کی ساس کی طرف سے دے دینا (اپنے سارے زیور اتار کر میز پر رکھ دیتی ہے)

راجو۔ ارے کیا کر رہی ہو۔ سارے زیور

رانی۔ یہ میری بہو کے لیے ہیں۔ مجھے اب زیورات کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنے یہ قیمتی پارچات بھی اتار دیتی مگر اپنے جوان بیٹے کے سامنے ننگی ہو جانا مناسب نہ ہوگا۔ تم ایک کروڑ پتی باپ کے بیٹے ہو بیوی کے ساتھ بنیوں جیسا سلوک نہ کرنا۔ آج شام تک تمہیں ایک نئی کار اور دس لاکھ روپے کی رقم مل جائے گی۔ جب تم یہاں سے گئے تھے تو تمہارا باپ اس سے بڑی رقم کا مالک نہ تھا۔

راجو۔ میں جا رہا ہوں اور ظاہر ہے کہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

رانی۔ تم نے شادی کر کے [illegible] احسان کیا ہے راجو ورنہ خدا گواہ ہے کہ تم آج تک میرے سر پر ایک بڑا بوجھ بنے بیٹھے تھے۔ اور اپنے فرصت کے اوقات میں میں نے اکثر سوچا تھا کہ میں نے تمہارا انتظار نہیں کیا اور اپنے بیٹے کو باپ کا نام دلوانے کی خاطر وہ کر ڈالا جو محبت کرنے والے کبھی نہیں کرتے۔ الوداع راجو۔

راجو۔ الوداع رانو۔ (اداس موسیقی ــــــ دردبھری دھن)

زندگی کے موڑ

پریم ناتھ کی بہو کا آنا تھا کہ اس گھر میں دو چار ہی مہینوں میں دو تین کی جگہ ایک دم ہزار بارہ سو کی آمدنی شروع ہو گئی۔

رام دے اور بندہ دے، شادی لال تیرے بیٹے کی بہو ساکشات لکشمی ہے۔ دیکھنا تیرا لڑکا چند ہی سالوں میں بڑا افسر بن جائے گا۔ ٹھیک کہتے ہو گپتا جی۔ بہو آئی ہے تو جیسے بہار آ گئی ہے میرے گھر میں۔ کہاں تو دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا اور اب دن رات پراٹھے دودھ اور مکھن سے میری خاطر تواضع ہوتی ہے۔ نہ رہی بیچاری بھگوتی ورنہ چند اچھے دن وہ غریب بھی دیکھ لیتی۔ اپنا اپنا بھاگیہ ہوتا ہے بھیا۔ وہ غریب جب تک رہی جھوٹے برتن ہی مانجھتی رہی۔ کھانا بچا تو کھایا نہیں تو ویسے ہی سو گئی۔

ہاں بھئی اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ ادھر اپنی طرف دیکھو بہو چار بار بھاگی بنی اور چاروں ہی بار بیچاری کی اولاد جنمتے ہی سورگ سدھار گئی۔ اب کے جو بچہ ہو گا اسے تیری پوتر آتما بہو کا آشیرواد دلواؤں گا تاکہ کوئی بیل تو پروان چڑھے۔

رادھے شیام گپتا کپڑے کی دکان کرتے تھے اور اچھا کھاتا پیتا گھر تھا ان کا۔ بیٹا مقامی اسکول کا انسپکٹر تھا۔ لائق اور کماؤ۔ بہو تو بیچاری بالکل گائے تھی مگر تقدیر کا کوئی کیا کرے۔ اچھی بھلی اولاد ہوتی مگر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد ہی بھگوان کو پیاری ہو جاتی۔

بچے جن جن کر سیتا رانی بیچاری تھک گئی تھی مگر پانچواں بچہ پھر سے تیار تھا۔ پہلے والے تین لڑکے اور ایک لڑکی جیوت ہوتے سارے نہ سہی آدھے ہی تو کافی ہے کہ یہ پانچواں بوجھ اٹھاتی بیچاری مگر بچہ تو ہونا ہی چاہیئے ورنہ عورت کی کیا جون

تین مہینہ بعد سیتا نے ارملا کو جنم دیا تو گپتا جی نے بچی کو لا کر کملا کی گود میں ڈال دیا۔ یہ بھی تیری ہی بہو۔ بھگوان کرے تیری ہو کر ہی بنے۔ سیتا اسے پالے پوسے گی مگر بیٹی یہ تمہاری ہی رہے گی۔ تم لکشمی ہو کملا رانی۔ آشیرباد دو اور رکھ دو اپنا مبارک ہاتھ میری پوتی کے سر پر۔

کملا نے جو خود ابھی پورے سولہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ ارملا کو گود میں لے لیا اور ماں بن گئی پہلے

بیٹی کی۔ بن جنے۔ مریم کی طرح۔

اب یہ روز کا معمول ہوگیا تھا گپتا پریوار کا۔ صبح صبح ہی نہلا دھلا کر اور اپنی چھاتی کا دودھ پلا کر سیتا ارملا کو کملا کے پاس چھوڑ جاتی اور رات کو جب بچی سو جاتی تو اٹھا کر لے جاتی۔ اسے اپنے گھر بیچ بیچ دو چار بار مقررہ وقت پر آ کر بچی کو دودھ پلا جاتی اور بس۔

"ماں تو تم ہو کملا رانی میں تو تمہاری بیٹی کی آیا ہوں"

ایسا کیوں کہتی ہو دیدی۔ یہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔ میری تو یہ گڑیا ہے۔ سچ کہتی ہوں دیدی۔ میرے دودھ ہوتا تو رات کو بھی اسے اپنے ہی ساتھ سلاتی۔ تمہارے منہ میں دودھ ہوگا کملا رانی۔ ایک چھوڑ دس بچے پلیں گے تمہارے تھنوں سے بھگوان کرے تم دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو۔

سیتا نے یہ دعا پورے دل سے دی تھی۔ مگر وہ جو دعائیں سنتا ہے سب کی ساری دعائیں تھوڑے ہی مان لیتا ہے۔ اس کی بھی موڈ ہوتی ہے۔ اچھی موڈ ہوئی تو چنڈال کی بھی سن لی۔ اچھی موڈ نہ ہوئی تو بڑے سے بڑے بھگت کی بھی نہ سنی۔ کملا کو سارا محلہ سراہتا تھا ماسٹر شادی لال اور دیور دھندر تو اس پر جان چھڑکتے تھے کوئی اس سے ناخوش تھا تو پریم ناتھ۔ اس کا پتی پرمیشور۔

پریم ناتھ ایم اے پاس تھا اس کی بیوی کم از کم بی اے پاس تو ہونی ہی چاہیئے تھی بھلے ہی تھرڈ ڈویژن میں مگر کملا بیچاری میٹرک پاس بھی نہ تھی۔ پریم ناتھ گورا چٹا تھا اور کملا سانولی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کملا باقاعدہ پڑھی لکھی نہ ہوتے ہوئے بھی ساہتیہ کویتا ایسی بے تکی باتوں میں بڑے جی جان سے حصہ لیتی تھی۔ کہانی ناول، کویتا ایسی خرافات پریم ناتھ کو قطعی ناپسند تھیں۔ وہ ریاضی کا طالب علم تھا اور ریاضی کے علاوہ ہر دوسرے سبجیکٹ کو دماغ کا خلل مانتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ کملا کے دہلیز میں قدم رکھتے ہی ان کے گھر کا بھاگیہ چمک اٹھا تھا مگر کملا جہیز میں خود تو کچھ بھی نہ لائی تھی اور اس کے اپنی ہی قماش کے کچھ دوستوں نے پھبتی کسی تھی کہ وہ کہیں بھی شادی کرتا تو بہتر بیوی اور بہت بہتر جہیز پاتا۔ چار پیسے تو ضرور آنے لگے تھے مگر اب بھی ان کے گھر میں نہ صوفہ تھا نہ ریڈیو نہ کوئی ڈھنگ کا پلنگ ہی۔

روپیہ جو آتا تھا خرچ ہو جاتا تھا۔ ماسٹر شادی لال کی دو لڑکیاں تھی۔ بڑی لڑکی انھوں نے اپنے ہی سکول کے ایک پرائمری ٹیچر سے بیاہ دی تھی اور چھوٹی ابھی کنواری بیٹھی تھی جس کا بیاہ کرنا تھا۔

ماسٹر جی بھی کبھی کبھی سوچتے کہ کملا کچھ جہیز لے آتی تو چھوٹی بیٹی بملا کے ہاتھ پیلے کرنے میں آسانی ہوتی مگر وہ ناشکرے انسان نہ تھے۔ بہو جہیز نہ لائی تھی مگر اچھی تقدیر تو لائی تھی۔ جس سے ایک ویران اجڑا اجڑا

گھر بس گیا تھا۔

پیسہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے پریم بیٹے ہماری کملا لکشمی کا اوتار ہے تو دیکھتے دیکھتے لاکھوں کا مالک بن جائے گا۔

پریم اپنے باپ کی بہت عزت کرتا تھا۔ ماسٹر شادی لال جی تھے ہی نیک سیرت انسان۔ انہوں نے بھوکے رہ کر۔ چار چار میل پیدل چل کر بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور بڑا لڑکا ہونے کے ناتے پریم نے وہ سب دیکھا تھا۔

بابو جی ٹھیک کہتے ہیں بھیا، ہندر بھی کبھی کبھی سمجھاتا اسے، بھابی ہم سب کیلئے بھگوان کا وردان بن کر آئی ہے، آپ کو بھابی کا انادر نہیں کرنا چاہیئے۔

بملا بھی بھابی کی پیاری نند تھی۔

کمبخت جادوگرنی ہے۔ سارے گھر کو جانے کیا کھلا دیا ہے اس نے جو اس گھر کا پرنس آف ویلز ہوتے ہوئے بھی میں بھی دوسرے نمبر کی چیز بن کر رہ گیا ہوں۔

وقت گذرتا جا رہا تھا اور کملا اپنی گڑیا کو کھلاتی پلاتی ہنساتی بڑے مزے سے زندگی گذار رہی تھی وہ اپنے گھر میں ایسی مست تھی کہ میکے بھی مہینوں میں کبھی کبھار ہی چٹھی پتر لکھ پاتی تھی۔

اس کی ودھوا ماں کبھی کبھی بیٹی کی جدائی میں دکھی ہوتی تو اس کا بھائی یہ کہہ کر بڑھیا ماں کی تسلی کرا دیتا کہ لڑکیوں کے آئے دن چٹھی نہ لکھنے کی یہی تو وجہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش ہیں اور نئے ناتوں سے ایسی گھی شکر ہوگئی ہیں کہ انھیں میکے کی یاد ہی نہیں آتی۔

بڑھیا بیچاری خوش ہو جاتی۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ کملا اچانک بغیر اطلاع دیئے میکے میں آ دھمکی۔ "انھوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ میں کالی ہوں۔ بی اے پاس نہیں ہوں۔ غریب کی بیٹی ہوں اور آپ لوگوں نے مجھے جہیز نہیں دیا۔"

گھر والوں نے جب سمجھایا کہ شادی کے بعد لڑکی کی جگہ اس کے اپنے پتی ہی کا گھر ہوتی ہے تو وہ میکے کا گھر چھوڑنے کے لئے بھی تیار ہوگئی۔

آپ لوگ میرا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تو نہ کیجئے۔ مگر میں ایسے آدمی کے پاس خود سے نہیں جاؤں گی جو آتما کا نہیں چمڑے کا بیوپاری ہے۔ پڑھا لکھا ہو کر بھی جاہل ہے ایسا آدمی میرا انادر کیوں کرے۔

سب نے لاکھ سمجھایا مگر کملا ضد پر اڑی رہی۔

بال کرشن نے سنا تو بہت دکھی ہوا۔ "دیکھو کملا شادی بیاہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ تمہارا شوہر کوئی

بڑا بزرگ نہیں۔ تمہارے دیوتا سمان سسر تیرتھ یاترا پر نہ گئے ہوتے تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ وہ چھچھورا اچھالا کرتا تھا تو تم ہی چپ ہو جاتیں۔ خود بخود ابال اُبال کر بیٹھ جاتا اگر تم نے مقابلے کی ٹھان لی اور بھاگ آئیں۔ یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔" مگر دادا یہ شکھشا تمہاری ہی تو ہے کہ آدمی میں جہاں سب کچھ سہہ لینے کا دم ہونا چاہیئے ظلم اور ناانصافی کے سامنے تن کر کھڑے ہونے کی شکتی بھی۔ ظلم برداشت کرنا تو پاپ ہے نہ دادا۔"

"کہا تو تھا۔"

"تو پھر۔ اب بولو میں کیا کروں۔"

"سنا ہے تمہاری ایک لڑکی بھی ہے۔"

"کیا کہتے ہو دادا۔ ابھی تو چھ مہینہ بھی نہیں ہوا میری شادی کو" میرا مطلب تمہاری گود میں لی ہوئی بچی سے تھا۔"

اوہو۔ وہ —— اس بیچاری پر واقعی ظلم ہوا ہے مگر معصوم بچہ ہے ایک دو دن بعد بھول جائے گی اپنی اس آیلی ماں کو۔

مگر ارملا اپنی ماں کو نہیں بھولی۔ دوسرے ہی دن بیمار ہو گئی اور ایک دم ایسی بیمار ہوئی کہ بیچاری کے مرنے کی نوبت آگئی۔ ماسٹر شادی لال تیرتھ یاترا سے واپس آئے تو بہت سٹپٹائے۔ اسی شام مہندر نے اطلاع دی کہ اس کے دفتر میں چھانٹی ہو رہی ہے جس میں اس کا بھی نام آگیا ہے۔

چند روز بعد سکول میں چوری ہو گئی۔ طلبا کے مہینہ بھر کی فیس۔ ماسٹروں کی پوری تنخواہ اور سکول کی گرانٹ کا سارا روپیہ کوئی لے اڑا۔ ساتھ ہی پریم ناتھ نے انکشاف کیا کہ ایک معمولی سی غلطی ہو جانے کی وجہ سے اس کا بڑا افسر اس سے اسقدر خفا ہو گیا ہے کہ اس نے اس کی تنزلی کا حکم صادر کر دیا ہے۔

"مگر ہم سب کیا کملا ہی کی تقدیر کا کھاتے ہیں۔ ہمارے حصہ میں بھگوان نے کچھ نہیں لکھا۔"

"ہر کوئی اپنی تقدیر کا کھاتا ہے بیٹے مگر گھر کی بہو گھر کی لاج ہوتی ہے۔ گھر کی ساکھ ہوتی ہے۔ گھر کی ساکھ جاتی رہے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ تم جا کر بہو کو لوا لاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"اپنی خاطر نہیں تو اس معصوم بچی کی خاطر ہی لے آؤ بہو کو بیٹے۔ کہو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ ارملا کے دادا تھے جو باپ بیٹے کی اونچی بحث سن کر اوپر چلے آئے تھے۔

"آپ سب مجھے نیچا دکھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر جب تک وہ معافی مانگ کر ناک نہ رگڑے

میں اسے لینے نہیں جاؤں گا۔"

"تم وہاں چلو تو۔ وہ تو ایک طرف میں خود تمہارے پاؤں پکڑنے کو تیار ہوں۔"

آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں تاؤجی۔ آپ سب کی یہی ضد ہے تو میں ہارا اور آپ سب جیتے۔ میں آپ کی خاطر اسے لے تو آؤں گا۔ مگر اسے اپناؤں گا نہیں۔

کملا لوٹ آئی۔ یہ ایک کرشمہ ہی تھا کہ دوسرے ہی دن سکول کا چور بمعہ رقم پکڑا گیا۔ مہندر نوکری پر بحال ہوگیا۔ پریم ناتھ کا افسر ترقی پا کر بڑے دفتر میں منتقل ہوگیا اور جاتے جاتے اپنی ترقی کی خوشی میں پریم ناتھ کا قصور بھی معاف کر گیا۔

ارملا ایک ہی ہفتہ میں چنگی بھلی ہو کر پھر سے کلیلیں کرنے لگی۔

زندگی پھر چلنے لگی اپنے پرانے ڈھنگ سے۔

"یہ دیوی نہیں۔ جادوگرنی ہے۔ جادوگرنی۔ مگر میں دیکھ لوں گا

پریم ناتھ نے ہار تو مان لی تھی۔ مگر دل سے نہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے وہ اجنبیوں کی طرح رہتے تھے۔ دو سال، تین سال، چار سال، پانچ سال بیت گئے۔

ارملا سکول جانے لگی۔ مگر اب تک بھی اس نے کملا کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

"یہ کیسا رشتہ ہے" "تم تو ماں بن گئی ہو۔ مگر میں باپ نہیں بنا۔"

میں تمہارے بچے کی ماں کبھی نہیں بنوں گی کیونکہ تم نے مجھ سے کبھی پیار نہیں کیا۔ میں اپنے پیٹ میں تمہاری نفرت کو سمیٹ کر نہیں رکھ سکتی۔ میں انسان ہوں حیوان نہیں ہوں۔"

تیرے جسم میں بچہ جننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

کون جانے نقص مجھ میں ہے یا تم میں۔"

گالی دیتی ہے حرام زادی۔"

گالی نہیں دیتی۔ تمہیں سچی بات بتا رہی ہوں۔"

کملا نے بالکرشن کو لکھا۔

ہاں دادا میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ وہ تمہیں بھی اچھا آدمی نہیں سمجھتا۔ تم نے میرے لیے جو دوا بھیجی تھی وہ اس نے مجھے پینے نہیں دی۔ اٹھا کر باہر کوڑے میں پھینک دی۔ اچھا ہی ہوا۔

مجھے بچہ وچہ کچھ نہیں چاہیے۔ میرے لیے ارملا ہی کافی ہے۔

یہ آدمی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ اپنے جسم کی بھوک مٹانے کی خاطر مجھ سے کسی طرح نبھائے جا رہا ہے

مجھے ایک مشین کی طرح استعمال کرتا ہے وہ میرے بچے کا باپ بننے کا حق نہیں رکھتا۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں میں عورت ہوں کہ ویشیا میں تو ویشیا سے بھی بدتر ہوں۔ ویشیا کو چناؤ کا اختیار تو ہوتا ہے۔

ماسٹر شادی لال نے مرتے وقت پریم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کملا کو پھر کبھی برا بھلا نہ کہے گا۔ اس کی عزت کرے گا اور کبھی ممکن ہوا تو اس سے بھرپور پیار بھی کرے گا۔

"تم نے اس لڑکی کو نہیں پہچانا۔ جب تک یہ جان سے خود کو تمہارے سپرد نہیں کر دیتی تمہارے خون کے بچے کو اپنے اندر پنپنے نہیں دے گی۔ تمہیں اس کا دل جیتنا ہوگا بیٹے"!

اور یاد رکھنا بیوی شوہر کی عزت تو ہوتی ہی ہے۔ ہمارے شاستروں نے اسے رسوئی میں ماں۔ گھر میں بہن۔ بستر میں ویشیا اور باہر شوہر کی بہترین دوست مانا ہے۔

اس کا باپ بڑا شاندار آدمی تھا۔

اس نے کملا سے پہلے کی طرح لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا۔ ساری تنخواہ اس کے ہاتھ میں تھمانی شروع کر دی اور ارملا سے بھی باپ کی طرح پیار کرنا شروع کر دیا۔

وہ ماں باپ کی طرح ارملا کا ہر جنم دن بڑی دھوم دھام سے مناتے۔ دو ماؤں کا اور دو پتاؤں کا پیار پاکر ارملا جو بڑھنا اور پھیلنا شروع ہوئی تو ایک دم بیل کی طرح بڑھتی چلی گئی۔

بڑی ذہین لڑکی تھی۔ پڑھائی کی ہر منزل اس نے بڑی شان سے طے کی اور آخر کار ڈاکٹر بن گئی۔

برسلز کے سینٹرلی ہیٹڈ فلیٹ میں وہ ایک ساتھ بستر میں لیٹے ہوئے تھے۔

زندگی کتنی عجیب ہے کملا۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں اب بھرپور سکھ دینا چاہتا ہوں۔ مگر تم تو جیسے سوکھ گئی ہو اندر سے۔

کملا نے پریم کو چمٹا لیا اپنے ساتھ۔ وہ اس کا پتی تھا۔ اس کا خداوند۔ مان مریادہ۔ سب کچھ۔

"تم دکھی کیوں ہوتے ہو۔ تم جنیندر کی لڑکی گود میں لے لو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے اپنی کوکھ کی اولاد کی طرح پالوں گی۔ وہ تو اپنا ہی خون ہے۔"

میں جانتا ہوں کہ وقت بہت گذر چکا ہے۔ بائیس سالوں میں ہر طرح کی ناراضگی کے باوجود میں نے تمہیں کبھی دو تین دن سے زیادہ نہیں چھوڑا مگر نتیجہ کبھی کچھ نہ نکلا۔

بابو جی نے کہا تھا کہ مجھے تمہارا دل جیتنا ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں مگر پھر نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے۔ اور تمہارے زخموں کے ٹانکے پھر ٹوٹنے لگتے ہیں۔

اپنی زندگی ہی کچھ ایسی رہی ہے۔ دیکھو نہ تم ایک معمولی کلرک تھے اور اب برسیلز میں ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سکریٹری ہو۔ ہمارے پاس اب سب کچھ ہے۔ کار ہے، گہنے کپڑے ہیں نقد سرمایہ ہے۔ کہاں تم میرا گھر سے باہر جھانکنا بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور کہاں اب مجھے اس نئی آزاد فضا میں تتلی بنا کر گھماتے پھرتے ہو۔

کوئی وقت تھا کہ ہم دونوں اتنے صوفی تھے کہ پیاز تک سے پرہیز کرتے تھے۔ کہاں آج سگریٹ اور شراب ہمارا معمول بن گیا ہے۔ تم اپنے نجی بچے کے لالسا چھوڑ دو تو ہم جیسا سُکھی اور مطمئن جوڑا دنیا میں مشکل سے ملے گا۔ تم جانتی ہو کملا باوجی نے ایک بار کہا تھا، بچہ عورت کے پیٹ میں نہیں، اس کی روح میں ہوتا ہے۔ میں بائیس سالوں سے تمہارا پیٹ کریدے جا رہا ہوں مگر اس بیچ تمہاری آتما میں ایک بار بھی جھانک کر میں نے نہیں دیکھا۔ اب میں تمہاری آتما میں کچھ جگہ پالینا چاہتا ہوں مگر تم نے تو جیسے کواڑ بند کر رکھے ہیں۔

کملا رو رہی تھی۔ پریم بھی رو رہا تھا۔ اس رونے میں کتنا سکون ہوتا۔ جی ہلکا ہو جاتا تو وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جاتے۔

جانتی ہو جس روز مجھے کول صاحب نے بلا کر پوچھا تھا۔

"پریم تم یورپ جانا پسند کرو گے۔ میں برسلز کی اپنی ایجنسی میں منسٹری کی برانچ کھولنا چاہتا ہوں۔ چاہو تو میں تمہیں وہاں انچارج بنا کر بھیج سکتا ہوں۔" خبر سن کر کچھ ایسی عجیب و غریب گدگدی ہوئی تھی مجھے کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی تھی۔ منسٹری میں ہر کوئی مجھے رشک و حسد سے دیکھتا تھا ان دنوں مگر میرے اپنے دل کے کسی گوشہ میں یہ بات رہ رہ کر کھٹکتی تھی کہ میری سیلیکشن کی وجہ میری نجی قابلیت نہ تھی تم تھیں اور قدرت کا ڈیزائن جو ہمیں ارملا کے پاس لئے جا رہا تھا۔ میں نے دل کو لاکھ سمجھایا کہ ارملا لندن میں ہے اور ہم برسلز میں ہوں گے۔ مگر دل نے کب مانی ہے عقل کی پاسبانی اور پھر میرا دل۔

تم بہت خوش تھیں۔ تم ارملا سے ملوگی۔ روز نہیں تو مہینہ دو مہینہ میں کبھی دن دو دن کے لیے ہی کہی تم ارملا کی بات کرتیں تو میں جل جاتا یہ لڑکی آسیب ہے۔ کسی پچھلے جنم کی تم سے بچھڑی ہوئی کوئی آتما۔ تم تو ماں بن گئی تھیں مگر میں باپ نہیں بنا تھا۔

"یہ ارملا تمہیں بھابی کیوں کہتی ہے؟"

"تمہیں جو بھائی صاحب کہتی ہے۔ تمہارے ناتے بھابی ہی تو ہوئی میں اس کی۔ ہماری عمروں میں سولہ سال ہی کا تو فرق ہے مجھے امی کہے تو کیسا عجیب لگے۔"

"سو تو ہے۔"

"یہ ارملا اتنی شراب کیوں پیتی ہے"

"یہ ارملا اتنے سگریٹ کیوں پیتی ہے"

"یہ ارملا عورت ہے کہ مشین۔ کبھی تھکتی ہی نہیں۔ جب دیکھو کام۔ کام۔ کام۔ گویا سارے لندن کے بیمار اس کے بغیر مر ہی تو جائیں گے"

"یہ ارملا شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ ۵۰ سال کی ہونے کو آئی ہے۔ آخر کب شادی کرے گی"

کس سے کرے شادی۔

کسی سے بھی کرے۔

کوئی بھیڑ بکری تو نہیں۔

سارے لندن میں ایک بھی معقول آدمی نہیں ہے کیا۔

تم شادی کر لو ارمل — کس سے کروں بھابی۔

رکشت سے کر لو۔ تم پر جان چھڑکتا ہے

جان تو مجھ پر خان کبھی چھڑکتا ہے اور مد مو سوزن بھی اور رجانی جارلی۔ مگر شادی کیا ان سب سے کر لوں۔

تمہاری اپنی پسند؟

میری پسند تو ایک ہی ہے

کون؟

ایک عورت

تو تم لیسبین ہو گی — کون ہے وہ کمبخت عورت

کمبخت نہ کہو اسے۔ وہ تو میری جان ہے۔

مجھ سے کیوں نہیں ملوایا۔

روز ہی تو ملتی ہیں اسے آپ۔

بڑی بدمعاش ہو۔ مجھ سے اب کیا تم آدمی کا کام لو گی۔

میں تم سے سارے کام لے سکتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں بھابی جب تم میرے ساتھ لیٹ کر سو جاتی ہو۔ پیار سے میرے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیوں سے کنگھی کرتی ہو تو میری رومانی نیچر کی ساری ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ ویسے مانو بھابی میں نے جب بھی مرد کی ضرورت محسوس کی ہے مجھے بھائی صاحب یاد آجاتے ہیں اور ان کا تم سے وہ سلوک۔

اب تو ہم بڑے خوش ہیں۔

اب تم اکتالیس کی ہونے آئی ہو۔ جب میں چالیس کی ہو جاؤں گی تو شادی کر لوں گی۔ کسی سے بھی۔ چالیس کو پہنچتے پہنچتے سکھ دکھ کا معیار ہی کیا رہ جاتا ہے۔

شکر ہے اب مجھے کبھی بچہ نہ ہوگا۔

کیا مطلب ؟

میں ہر مہینہ کی اس تکلیف سے چھوٹ گئی ہوں۔

کب سے ؟

چھ مہینہ ہونے کو آئے۔

کیا کہا۔ ابھی چلو میرے ساتھ ہسپتال۔ میں تمہارا معائنہ کرواؤں گی۔

تم خود ڈاکٹر نہیں ہو کیا ؟

ہوں ؛ مگر آپ کے لیے نہیں۔

ڈاکٹر ایملی جارج جب ایک گھنٹہ کے معائنہ کے بعد اپریشن تھیٹر سے باہر نکلی تو مسکرا رہی تھی۔

پریم ناتھ کو دیکھکر بولی۔ مٹھائی کھلایئے۔

اور پھر ارملا کی طرف دیکھکر بولی۔ تم بھی مٹھائی کھلاؤ۔ تمہاری بجائے کو تمہارا بدل مل گیا۔

"مسٹر پریم ناتھ آپ بڑے عجیب آدمی ہیں۔ آپ کی بیوی کو ساتواں مہینہ ہے اور آپ کو خبر تک نہیں۔ بچہ کمزور ہے مگر ٹھیک ہے۔ بڑی حفاظت کرنی ہوگی۔ آپ [illegible] برداشت کر سکیں تو میرا مشورہ ہے کہ مسز پریم ناتھ کو یہیں رہنے دیں۔"

پریم بے سدھ ہو گیا۔ کوئی نرالی بات نہ تھی۔

لندن میں ارملا جو تھی۔

اپنے مرحوم والد کی تصویر کے سامنے جھکا جھکا پریم بھبھک بھبھک کر رونے لگا۔ ڈیڈی مجھے تمہارے ایشور نے معاف کر دیا۔ میں باپ بننے والا ہوں ڈیڈی۔ دعا دو ڈیڈی کہ میری اولاد کملا ایسی لکشمی ہو۔ میرے جیسی راکشس نہیں۔ مجھے بیٹا نہیں بیٹی چاہیئے ڈیڈی۔ کملا کی تصویر۔ میں کملا کا پیار پا گیا ہوں ڈیڈی۔ کملا نے مجھے اپنی آتما میں اپنے دل میں کچھ جگہ دے ہی دی آخر۔

پریم ناتھ کو لگا۔ وہ اب ایک اچھا آدمی بن گیا ہے۔

وہ واقعی اچھا آدمی بن گیا تھا۔

"آٹھویں مہینہ کا درد اچھا نہیں ہوتا مگر یہ ہو کیا گیا ہے تمہاری بھابی کو جیسے اس میں زندہ رہنے یا بچہ کا بوجھ سہارے جانے کی سکت ہی نہ رہی ہو میں سمجھی تھی وہ خوشی سے پھولی نہ سمائے گی. مگر ہم نے اسے ایک بار بھی مسکراتے نہیں دیکھا پچھلے ایک مہینہ سے۔" ڈاکٹر جارج واقعی حیران تھی۔

بھابی آنکھیں کھولو۔ ڈاکٹر پوری تم سے ملنے آئے ہیں۔

بھابی نے آنکھیں کھولیں۔ اور رکشت کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

"آؤ جمائی بابو۔ خوش آمدید۔"

"جمائی بابو" ارملا خوش تھی کہ کملا نے بھی اس کی پسند پر اجازت کی مہر ثبت کر دی۔

رکشت نے شکرانہ کے طور پر کملا کے کمزور لاغر ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

ارملا شادی کر رہی ہے۔ کملا نے پریم ناتھ کو بتایا۔

مجھے معلوم ہے۔ تاؤ جی کا خط آیا تھا۔ اس کی ممی اور بھیا اگلے مہینہ لندن پہنچ رہے ہیں۔

ارملا کی ممی۔

"ارملا کی ممی تو میں ہوں۔ ارملا کو میں نے پالا ہے۔ ارملا کی ممی میں ہوں۔ ارملا میری بیٹی ہے۔"

ہاں ہاں تم ہی ارملا کی ممی ہو۔ مگر ایک دوسری عورت بھی ہے جس نے اسے جنم دیا تھا اس کا بھی تو کچھ حق ہے اور پھر وہ خود سے تھوڑے ہی آ رہی ہے۔ خود ارملا نے یہاں سے ٹکٹ بھجوائے ہیں ان لوگوں کے لیے۔

ارملا نے خود بلایا ہے سیتا کو؟

یہ کیسی جلن ہے۔

"ارملا کو اب میری ضرورت نہیں رہی۔"

"اس حالت میں تمہارا اس طرح اپ سیٹ ہونا مناسب نہیں۔"

"یہ بچی تمہاری رہی بھگوان کرے تمہاری ہی ہو کر رہے۔

سیتا اسے پالے پوسے گی، مگر بیٹی یہ تمہاری ہی رہے گی۔

"تم لکشمی ہو کملا رانی۔ آشیرباد دو اور رکھ دو اپنا مبارک ہاتھ میری پوتی کے سر پر۔"

"ماں تو تم ہو کملا رانی۔ میں تو تیری بیٹی کی آیا ہوں۔

جھوٹ ہے جھوٹ۔ آیا مجھ سے میری بیٹی چھیننے آ رہی ہے۔

"تمہارے سنوں دودھ ہوگا کملا رانی۔ ایک چھوڑ دس بچے پلیں گے تمہارے ...

تم دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو۔"

مجھے دس بچے نہیں چاہئیں۔ میری ایک ہی بچی ہے بس ٹھیک ہے۔

یہ کیسا رشتہ ہے۔ تم تو ماں بن گئی ہو مگر میں باپ نہیں بنا۔

میں تمہارے بچے کی ماں کبھی نہیں بنوں گی کبھی نہیں، کبھی نہیں۔

تم نے مجھ سے کبھی پیار نہیں کیا۔

میں اپنے پیٹ میں تمہاری نفرت کو سمیٹ کر نہیں رکھ سکتی میں انسان ہوں حیوان نہیں ہوں۔

تمہارے جسم میں بچہ جننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

کون جانے نقص تم میں ہے یا مجھ میں۔

گالی دیتی ہے حرام زادی۔

جو آدمی مجھ سے پیار نہیں کرتا محض اپنے جسم کی بھوک مٹانے کی خاطر۔

وہ میرے بچے کا باپ بننے کا حق نہیں رکھتا۔

ظلم برداشت کرنا تو پاپ ہے نہ دادا۔

اب بولو میں کیا کروں۔ میں کیا کروں دادا۔ میں کیا کروں۔ ہائے میں کیا کروں۔

نرس نے آکر مارفیا کا انجکشن لگا دیا۔ آپ سوچا کیے مسز پریم ناتھ اس حالت میں آپ کا یوں اس طرح پریشان رہنا اولاد اور ماں۔ دونوں کے لئے مضر ہے۔

اولاد!

میری اولاد!!

مگر وہ تو خوش و خرم ہے۔ ماں مر رہی ہے اور بیٹی بیاہ رچا رہی ہے۔ مگر میں نے خود ہی تو کہا کہ شادی کر لو رکشت سے کر لو وہ تم پر جان چھڑکتا ہے۔

میں بائیس سال سے تمہارا پیٹ کریدر رہا ہوں۔ تمہاری آتما میں ایک بار بھی جھانک کر میں نے نہیں دیکھا۔ اب میں تمہاری آتما میں کچھ جگہ پانا چاہتا ہوں۔ مگر تم نے تو جیسے کواڑ بند کر رکھے ہیں۔

مگر وہ گھس آیا کسی طرح میرے من مندر میں۔

کیوں آنے دیا تم نے۔

ایک ہی کیا کم تھی تیرے لئے۔ لالچی کتیا۔

تمہاری بیوی اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے ساری رات بڑبڑاتی رہتی ہے۔ دیکھتی ہوں تم نے اس غریب سے اپنی ازدواجی زندگی کے اولین مراحل میں مناسب سلوک نہیں کیا۔ ڈاکٹر چارج نے پریم ناتھ کو ڈانٹا۔

آپ ٹھیک کہتی ہیں ڈاکٹر مگر اب میں اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں خدا کے لیے اِسے بچا لیجیے۔

آخر وہ وقت بھی آپہنچا۔

تمہیں ماں اور بچے میں سے ایک کو چُننا ہے۔

آپ میری ملا کو بچا لیجیے۔

زندگی میں پہلی بار پریم ناتھ نے باپ کی طرح اُرملا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میں غلطی پر تھا ہمارے لیے ایک ہی بیٹی کافی ہے۔

اُرملا اور رکشت رو رہے تھے۔

یہ رشتے۔ ناتے کیسے کیسے رشتے گھڑ دیتا ہے تو اینکل جارج اپنے یسوع مسیح سے پوچھ رہی تھی۔

سیزیرین اپریشن ہوا۔ چار پاؤنڈ کا مُردہ مسلا ہوا انسانی جسم۔

ہوش آنے پر کملا نے بستر پر ہاتھ پھیرا مگر بچہ قریب نہ پا کر چلانے لگی۔

بچہ بہت کمزور ہے اس قابل نہیں کہ اٹھا کر یہاں لایا جائے۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا تو تمہارے ہی پاس رہے گا۔

جب مریضہ نے بہت ضد کی تو ڈاکٹر جارج نے قریب کے کمرے سے ایک ہندوستانی عورت کا نیا بچہ اسے ایک نظر دکھا دیا۔

دیکھا تم نے۔ تم کہتے تھے میں بچہ نہیں جن سکتی۔ تم مجھے پہلے ہی سے اسی طرح پیار کرتے تو آج تم دس بچوں کے باپ ہوتے۔

پریم ناتھ کی مسکراہٹ میں درد تھا ــــ

اس رات جب سب چلے گئے اور کمرہ میں مریضہ کے علاوہ ارملا ہی رہ گئی تو عجیب اچنبا ہوا۔

ارملا نے دیکھا کہ بھابی نے اپنا دائیاں پستان چولی سے باہر نکال لیا ہے اور آنکھیں بند کیے کچھ بڑبڑا رہی ہے تُم نے دودھ ہی تو نہ پیا تھا میرا۔ لو یہ بھی پی لو۔ دیکھو تو منوں دودھ اُمڈ رہا ہے میرے شریر سے۔ کامدھینو بن گئی ہوں۔

ارملا چپ چاپ کرسی سے اٹھی اور بھابی کے ساتھ لیٹ گئی۔ ماں کا دودھ اس نے منہ میں لے لیا اور بچے کی طرح بھابی کے تھن چوسنے لگی۔

کملا کے منہ پر وہی آبھا تھی جو ہر ماں کے منہ پر نوزائیدہ بچے کو پہلی بار دودھ پلاتے ہوئے ہوتی ہے۔